بدر سے باٹا پور تک

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ کی مکمل ڈائری۔ چونڈہ کی ٹینکوں کی جنگ کے مکمل حالات اور واقعات اور متعدد واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

فہرست

تعارف

بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی ہفت روزہ "ٹائم" کے نمائندے لوئیس کرار نے ۲۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کے شمارے میں جنگِ ستمبر کے محاذوں کو اپنی آنکھوں دیکھ کر لکھا تھا — " میں پاک بھارت جنگ کو شاید بھول جاؤں گا لیکن پاک فوج کا جو افسر مجھے محاذ پر لے گیا تھا، اُس کی مسکراہٹ کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ یہ مسکراہٹ مجھے بتا رہی تھی کہ پاکستانی نوجوان کس قدر نڈر اور دلیر ہیں۔ جوان سے جرنیل تک کو میں نے اس طرح آگ کے ساتھ کھیلتے دیکھا ہے جس طرح گلیوں میں بچے کانچ کی گولیوں سے کھیلتے ہیں" — لوئیس کرار نے اپنی رپورٹ اس فقرے سے شروع کی تھی — "جو قوم موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو، اُسے کون شکست دے سکتا ہے؟"

اس امریکی وقائع نگار کا یہ مشاہدہ حقیقت پر مبنی ہے مگر یہ مشاہدہ مکمل نہیں کیونکہ لوئیس کرار نے پاک فوج کے اُس نوجوان افسر کی صرف مسکراہٹ دیکھی ہے، اُس کی آنکھوں کی چمک نہیں دیکھی ورنہ اسے نظر آ جاتا کہ پاک فوج کے جوان کی بے خوفی اور شجاعت کے پیچھے کونسی قوت کارفرما ہے۔

وہ قوت میں نے دیکھی ہے۔ میں نے پاک فوج کے ایک سپاہی کی بارود اور گرد سے لال سُرخ آنکھوں میں حریت کی وہ رہگذر دیکھی ہے جسے اللہ کا سپاہی چودہ صدیوں سے طے کرتا چلا آ رہا ہے۔ پاک فوج کا سپاہی بدر سے باٹاپور تک، اُحد سے الطارق، سپین سے سیالکوٹ تک اور قادسیہ سے قصور تک چودہ سو سال کی مسافت طے کر کے پہنچا ہے — اور یہ رہگذر اس کے خون کے چھینٹوں سے گل رنگ اور پُر نور ہے۔

جنگِ ستمبر کی ابتدا اُسی روز ہو گئی تھی جس روز غارِ حرا سے پیغامِ حق، کفر و باطل کے لیے چیلنج بن کر اُٹھا تھا۔ اس شمع کو غارِ حرا کے اندھیروں نے لو بخشی تھی۔ شمعِ رسالتؐ کو بجھانے کے لیے کفر نے اس شمع کے پروانوں کو ریگزاروں، سبزپوش وادیوں، سنگلاخ چٹانوں — دریاؤں اور سمندروں میں للکارا۔ ہر دور اور ہر میدان میں شمعِ رسالتؐ کے پروانوں نے اس للکار کا

جواب نیزا اور تلوار اور نعرۂ حق سے دیا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں وہی للکار پھر سنائی دی۔ ... آگ کی آندھی کی طرح آیا اور پاک فوج، پاک فضائیہ اور پاک بحریہ نے ایک بار پھر خالد بن ولید، عمرو بن العاص، سعد بن ابی وقاص، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی، حیدر علی، ٹیپو، سید احمد اور تیتومیر کو میدان میں اتار دیا۔ ... نیا نے خیرالدین باربروسا کو ایک بار پھر سمندروں کو آگ لگا کر کفار کی بحری قوت کو بھسم کرتے دیکھا۔

میں نے وہ سارے ہی دور، وہ سارے ہی میدان اور تاریخِ اسلام کے شہید اور برصغیر میں جنگِ آزادی کے جانباز پاک فوج کے سپاہی کی آنکھوں میں دیکھے ہیں۔

وہ سپاہی لاہور کے محاذ پر بی آر بی کے کنارے باٹاپور کے اڑے ہوئے پل کے قریب کھڑا تھا —— اور وہ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح تھی۔ فائر بندی ہوئے ابھی چار ہی گھنٹے گزرے تھے۔ لاہور کی رانیوں اور شیرنیوں کی دھاڑ اور گرج نا موش ہو گئی تھی، جیسے داستاں گو بڑی ہی پیاری بڑی ہی ولولہ انگیز داستان سناتے سناتے سو گیا ہو مگر ان توپوں کی گونج ابھی تک فضا میں منڈلا رہی تھی، جیسے ببانگِ بلند کہہ رہی ہو —— ' لاہور زندہ ہے، لاہور زندہ رہے گا' —— اور یہ آواز کراچی کے ساحل سے کشمیر کی وادیوں تک گرج رہی تھی —— ' پاکستان ہمیشہ زندہ رہے گا اور پورے وقار سے زندہ رہے گا۔'

محاذ پر ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کوئی دھماکہ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈراونا سا سکوت طاری تھا جس میں لہو، بارود، تیل، پیٹرول اور گلتی سڑتی لاشوں کا تعفن رچا ہوا تھا۔ برطانیہ کے مشہور اخبار "ڈیلی میل" کا جنگی وقائع نگار ایلفرڈ کک بھی وہاں موجود تھا۔ وہ رات بھر سے وہیں تھا۔ اُس نے لاہور کے آخری اور انتہائی خونریز معرکے کو اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ اُس نے آخری معرکے، ہندوؤں کے آخری جتن اور فائر بندی کے بعد کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

" لاہور کے محاذ پر بھارتیوں نے بھینی (باٹاپور سے پانچ میل شمال کی جانب) بی آر بی کے پل کے مقام پر تمام رات گولہ باری جاری رکھی۔ پورے تین بجے صبح یعنی فائر بندی کے وقت انہوں نے بھینی کے پل سے نہر پار کرنے کے لیے انفنٹری سے دو شدید حملے کیے۔ ان حملوں کی پشت پناہی کے لیے بھارتی توپخانے نے جو گولہ باری کی وہ اس سیکٹر کی شدید ترین گولہ باری تھی۔ معاہدے کے مطابق فائر بندی کے طے شدہ وقت سے پندرہ منٹ بعد تک گھمسان کی جنگ جاری رہی اور پاکستانیوں نے بھارتیوں کے یہ دونوں حملے بھی پہلے حملوں کی طرح پسپا کر دیے پھر کہیں جا کر فائر بندی ہوئی .... میدانِ جنگ میں ہر سائز کے خالی کھوکھے (کارتوس) بکھرے ہوئے ہیں۔ زمین جلی ہوئی ہے ٹینکوں نے کھڑی فصلوں کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ ہر طرف جنگی سامان اور اسلحہ بارود کی ہزاروں اشیاء اور لاشیں بکھری ہوئی ہیں جو بھارتی پسپائی کے وقت پھینک گئے ہیں۔"

میرے سامنے لاشوں کے اوپر لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں رات کے آخری معرکے کی تازہ لاشیں اور ان کے نیچے وہ لاشیں تھیں جو یہاں کئی دنوں سے گل سڑ رہی تھیں۔ فضا میں جلے ہوئے بارود، جھلسے ہوئے انسانی گوشت اور لاشوں کی سڑاند اور تازہ خون کی بو رچی ہوئی تھی۔ گِدھوں نے لاشوں پر ہلّہ بول دیا تھا۔ علاقے کے جو کتے توپوں اور ٹینکوں کے دھماکوں سے بھاگ گئے تھے، واپس آ کر لاشوں کو بھنبھوڑ اور چچوڑ رہے تھے۔ ان میں لاہور شہر کے آوارہ کتے بھی شامل تھے۔ گِدھ اور کتے باطل کی اُس قوت کو چچوڑ اور چبا رہے تھے جو پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے آئی تھی —— اور یہ بکھری، مسلی اور گلی سڑی ہوئی قوت اور اس کا تعفن بزبانِ خاموشی کہہ رہا تھا —— ' دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!'

آخری گولہ باری کے دھوئیں اور گرد کی گھٹا میدانِ جنگ کے اوپر آہستہ آہستہ بھارت کی طرف اُڑی جا رہی تھی، جیسے بھارت کے عزائم کی ارتھی مرگھٹ کو جا رہی ہو۔ دُور پرے سرحد کے قریب سے سیاہ کالے دھوئیں کے گہرے بادل زمین سے آسمان کی طرف اٹھنے لگے۔ میں نے پاک فوج کے سپاہی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اُس نے ہلکی سی ہنسی ہنس کر کہا —— " ہندوستانی اپنی لاشوں کو جلا رہے ہیں۔ سرحد سے دُور پرے تک کم بختوں کی لاشوں کے انبار پڑے ہیں۔ وہ ہمارے شاہبازوں اور لاہور کی رانیوں کا شکار ہوتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد انڈین آرمی کے بہت سے ٹرک میدان میں آہستہ آہستہ چلتے نظر آنے لگے۔ وہ لاشیں اٹھانے آئے تھے۔ پاک فوج کے پیادہ سٹریچر بیئرر اپنے شہیدوں کی لاشیں ڈھونڈ رہے تھے۔ اتنے وسیع میدان میں پاک فوج کے شہیدوں کی کل تعداد چھپن (۵۶) تھی۔ یہ گزشتہ رات کے معرکے کے شہید تھے۔ اس کے مقابلے میں بھارتی صرف ڈوگرئی کے علاقے سے لاشوں کے چودہ ٹرک بھر کر لے گئے۔ وہ صرف تازہ لاشیں لے گئے تھے۔ گلی سڑی لاشوں کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

وہ لاشوں کو بازوؤں اور ٹانگوں سے اٹھا کر لکڑیوں کی طرح ٹرکوں میں پھینک رہے تھے۔ بعض لاشوں کو وہ ٹانگوں یا بازوؤں سے گھسیٹ کر ٹرکوں تک لے جاتے اور اندر پھینکتے تھے۔ ایک ایک ٹرک میں وہ نوے سے ایک سو تک لاشوں کا انبار لگا کر ٹرک کو پیچھے بھیج دیتے تھے۔ یہ لاشیں ان کے پسماندگان تک نہیں پہنچائی جا رہی تھیں بلکہ واہگہ کے قریب ڈھیر لگا کر ان پر پیٹرول ڈالتے اور آگ لگا دیتے تھے۔ یہ سلوک اُن سپاہیوں کی لاشوں کے ساتھ ہو رہا تھا جنہوں نے اپنے عیار حکمرانوں کے پاکستان دشمن عزائم پر جانیں قربان کر دی تھیں۔

اس کے برعکس پاک فوج کے شہیدوں کی لاشوں کو سٹریچروں پر پورے احترام اور پیار سے بی آر بی کے اس طرف لایا جا رہا تھا۔ لاشوں کو اٹھا کر لانے والے کچھ ایسی احتیاط سے چلتے تھے جیسے ذرا سا دھچکا لگا تو شہید کو زخموں میں درد محسوس ہو گا۔ جب شہید کی میت پیچھے آتی تھی تو افسر اسے سیلوٹ کرتے تھے۔ ان کے ساتھی ان کے ہاتھ چومتے اور ان کے چہروں سے مٹی پونچھتے تھے۔

میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اور پاک فوج کا سپاہی میرے پاس کھڑا مجھے پہلے روز یعنی ۶ ستمبر کے حملے کی شدت کی تفصیلات سُنا رہا تھا۔ یہ تفصیلات حب الوطنی کی دیوانگی اور جانبازی کی اتنی لمبی داستان ہے جسے سننے سنانے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ اُس نے کہا —— " پاک فوج کا ہر افسر اور ہر جوان شجاعت کی ایک ایک داستان کا ہیرو ہے۔ ورنہ، صاحب، جنگوں کی تاریخ میں کسی قوم کے پانچ ہزار جانبازوں نے چالیس ہزار کے لشکر کو کبھی نہیں روکا تھا۔"

۲۳ ستمبر کا سورج بہت اُوپر اٹھ آیا تھا۔ دھوپ کی بڑھتی تمازت سے لاشوں کی سڑاند اور زیادہ ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ سپاہی مجھے ایک درخت کے سائے میں لے گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سترہ دنوں اور سترہ راتوں کی خونریز اور تیز ترین معرکہ آرائی، شب بیداری، بارود اور دھول سے سیاہ کالا ہو گیا تھا۔ وردی پسینے اور شہیدوں کے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں سُوج گئی تھیں۔ وردی کئی جگہ سے پھٹی ہوئی اور اُس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس پر خون جم گیا تھا۔ یہ جنگ کے تیسرے دن کا زخم تھا۔ اُسے پٹی بدلنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ اُس کے کندھے پر عہدے کا کوئی نشان نہ تھا۔ میں نے اس سے عہدہ اور نام نہیں پوچھا تھا۔ معلوم نہیں افسر تھا یا سپاہی، میرے لیے وہ سب کچھ تھا۔ وہ اللہ کا سپاہی تھا۔ اُس نے کہا ——

"پہلے روز جب دشمن کے ٹینک گرجے اور توپوں کے دھماکے سنائی دیئے تو خیال آیا کہ ہندو اٹھارہ برسوں کی تیاری کر کے پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے آگیا ہے۔ اُس وقت تھرڈ بلوچ رجمنٹ کے ایک مورچے سے کسی جوان نے گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا ——— 'پاکستانیو! آج بے غیرت نہ ہو جانا' ——— ایک اور مورچے سے نعرہ گرجا ——— 'مسلمانو! آج بیٹھ نہ دکھانا' ——— بس یہ تھا وہ نعرہ جس نے ہمیں بجلی کی قوت عطا کی۔"

ہم بیسٹر تلے کھڑے تھے مگر پیڑ کا کوئی سایہ نہیں تھا۔ پتے مشین گنوں اور توپوں نے جلا ڈالے تھے۔ شاخیں اور ڈال ٹوٹ گئے تھے اور ہم اس ٹنڈ منڈ سوکھے پیڑ کے تنے کے سائے میں کھڑے تھے۔ سپاہی تنے کا سہارا لئے تھکی تھکی آواز میں بول رہا تھا اور میں اس کی سترہ راتوں کی جاگی ہوئی لال انگارہ آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جن کی فاتحانہ چمک میں مجھے بدر کا میدان نظر آرہا تھا۔ یہ نعرہ جو باٹا پور کے مورچوں سے گرجا تھا، چودہ صدیاں گزریں، بدر کے میدان میں بلند ہوا تھا۔ رسولِ اکرم صلعم پر وحی نازل ہوئی تھی۔

"یاد رکھو آج کے دن جس نے میدان میں پیٹھ دکھائی، بجز اس کے کہ وہ لڑائی کی کسی ضرورت کے لیے پینترا بدلے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا کا غضب اُس پر نازل ہو گا۔ وہ سیدھا جہنم میں جائے گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہو گا۔" (الانفال: ۱۶)

رسولِ اکرم صلعم نے قرآن کے اس فرمان کو مسلمانوں کے خون میں شامل کر دیا تھا۔ یہ ایک مقدس ورثہ ہے جو برِّصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے خون میں چلا آرہا ہے۔ اسی ورثے کا کرشمہ ہے کہ مسلمان کے سینے میں آزادی کی چنگاری بجھ نہیں سکتی۔ مسلمان اور کچھ ہو نہ ہو، وہ غلام نہیں ہو سکتا۔ دُنیا کا یہ خطہ جسے پاکستان اور بھارت کہتے ہیں جنگِ آزادی کے سپاہیوں کے خون سے پُر نور ہے۔ مجاہدینِ اسلام کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے جسے کچلنے کے لیے کفار کے لشکر طوفانوں کی طرح بپھر بپھر کر آئے مگر تتر بتر ہو کر بکھر گئے۔

اُس روز محاذ پر پاک فوج کے سپاہی کے پاس بیٹھے ہوئے مجھے برِصغیر کے وہ سارے ہی شہید اور غازی یاد آئے جنہوں نے مغلوں کے زوال اور انگریزوں کے عروج کے وقت سے جنگِ آزادی کی ابتدا کی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پاک فوج کے سپاہی کی آنکھوں میں شمعِ آزادی کے ان ہی پروانوں کا پرتو تھا۔ پاکستان کے پرچم کی ہریالی میں ان ہی شہدا کا خون رچا ہوا ہے اور اُس روز جب میرے قریب سے جنگِ ستمبر کے شہیدوں کی خونچکاں لاشیں گزر رہی تھیں، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے برصغیر میں دو صدیوں کی جنگِ آزادی انہوں نے ہی لڑی ہے اور جو تھکا ہوا سپاہی میرے پاس سوکھے پیڑ کے تنے سے پیٹھ لگائے بیٹھا ہوا، خوابناک آواز میں باتیں کر رہا ہے، وہ ہر میدان میں لڑا ہے۔ وہ سترہ دن نہیں، دو صدیاں نہیں، چودہ صدیاں لڑا ہے اور آج دم بھر کو ستانے کے لیے اس ٹنڈ منڈ پیڑ کے تنے سے پیٹھ لگا کے بیٹھ گیا ہے۔

قائدِ اعظم نے زیادہ اہمیت مسلمان کی عسکری فطرت اور فنِ سپہ گری کو دی تھی۔ آپ نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ کے روز لاہور میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"آپ کو صرف اپنے آباؤ اجداد کی طرح مجاہدانہ جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تاریخ بہادری، شجاعت اور کردار کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی نئی زندگی کو ان روایات کے سانچے میں ڈھال لیجئے اور اس تاریخ میں ایک اور درخشاں باب کا اضافہ کیجئے۔"

میں ماضی میں کھو گیا تھا۔ یادیں تاریخ کی کڑیاں ملاتی چلی جا رہی تھیں اور میں بی آر بی کے کنارے سوکھے پیڑ تلے بیٹھا، یادوں کے سہارے بہت دُور نکل گیا تھا۔ میرے پاس بیٹھا ہوا پاک فوج کا سپاہی تھکی تھکی آواز میں جانے کیا کہہ رہا تھا۔ میں اُس کی باتیں لاشعوری طور پر سُن رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لاہور سیکٹر کی باتیں سنا رہا ہے لیکن میں کرۂ ارض کے ہر اُس سیکٹر میں گھوم رہا تھا جہاں جہاں اللہ کا سپاہی لڑا ہے۔ میں باٹا پور سے بدر تک چلا گیا تھا اور آہستہ آہستہ ہر اُس میدانِ جنگ میں گھومتا، جہاں حق و باطل معرکہ آرا ہوئے تھے، باٹا پور کی طرف واپس آرہا تھا۔ اگر پاک فوج کا سپاہی مجھے کندھے سے جھنجھوڑ نہ دیتا تو شاید میں اتنی جلدی اس میدان میں واپس نہ آتا جہاں بھارتیوں کی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور ان لاشوں کے درمیان ٹینک، ٹرک اور دوسری گاڑیاں جل رہی تھیں۔ میرے قریب سے شہیدوں کی جو لاشیں گزر گئی تھیں، انہیں ایمبولینس گاڑیوں میں رکھ دیا گیا تھا۔

"لیجئے، سگریٹ!" سپاہی نے میرے کندھے کو جھنجھوڑ کر کہا تھا۔ "یہ سگریٹ دس گیارہ روز سے جیب میں پڑا تھا۔ پینے کی فرصت نہیں ملی۔"

میں نے دیکھا، اُس کے ہاتھ میں مڑا تڑا، پچکا ہوا ایک سگریٹ تھا۔ سگریٹ پر خون کا خشک دھبہ بھی تھا۔ اس نے یہ سگریٹ پیکٹ سے نہیں جیب سے نکالا تھا۔ میں نے اس سے سگریٹ لے لیا اور اپنی جیب سے پیکٹ نکال کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اس کا دیا ہوا سگریٹ سلگایا تو اس میں سے مجھے پسینے اور خون کی بُو آئی۔ پسینہ اس سپاہی کا تھا اور خون اُن شہیدوں کا جن کی لاشیں اُس نے جنگ کے دوران اٹھائی تھیں۔ کس قدر وجد آفریں تھی جانبازوں کے پسینے اور شہیدوں کے لہو کی مہک۔ میں نے کش لے کر سارا ہی دھواں پھیپھڑوں میں جذب کر لیا۔

سپاہی نے میرے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سُلگایا اور کش لے کر سارا ہی دھواں اُگل کر بولا ——— "خدا کا شکر ہے کہ میں نے بھی ایک صلیبی جنگ لڑ لی ہے۔ باطل نے حق پر ایک اور جھپٹا مارا تھا۔ کفر نے ہماری آزادی کو ایک بار پھر للکارا تھا۔ اس آزادی کی قربان گاہ پر قوم دو سَو سالوں سے خون کے نذرانے دے رہی ہے۔ اب تک تو تاریخ بھی فراموش کر چکی ہے کہ کتنی ماؤں کی گودیں ویران ہوئیں، کتنے سہاگ قربان ہوئے، کتنے آباد گھرانے اُجڑ گئے۔ کتنے بچے یتیم ہوئے اور کتنے چھیل چھبیلے عمر بھر کے لیے آنکھوں، ٹانگوں اور بازوؤں سے معذور ہوئے۔ میرے دوست! شمعِ رسالت تیل یا موم سے نہیں شہیدوں کے خون سے جل رہی ہے۔ ہم اسے جلتا رکھیں گے۔ مسلمانوں کا خون ابھی خشک نہیں ہوا۔ کبھی خشک نہیں ہو گا!"

وہ بول رہا تھا اور مجھے اُس کی آنکھوں میں جن کی رنگت شہیدوں کے خون جیسی گہری لال تھی، اُن شہیدوں کا قافلہ جاتا دکھائی دے رہا تھا جو بدر سے باٹا پور تک شہید ہوئے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تحریکِ اسلام کی ساری ہی تاریخ پڑھ ڈالی۔

وہ بولتے بولتے اونگھنے لگا۔ میرے اردگرد جنگ کے بعد کی سرگرمی اور گہما گہمی تھی۔ اس نے اونگھتی ہوئی آواز میں کہا ——— "سترہ راتوں سے جاگ رہا ہوں" ——— اور وہ پیڑ کے تنے کے ساتھ لیٹ گیا ——— اچانک بی آر بی کے پار زور کا دھماکہ ہوا۔ شعلہ اُٹھا اور گرد کا بادل دُور اوپر تک چلا گیا۔ سپاہی جو سترہ راتوں سے جاگ رہا تھا، سپرنگ کی طرح اُچھل کر اٹھا۔ اور بی آر بی کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ جلدی ہی واپس آگیا۔ کہنے لگا ——— "کوئی مائن (بارودی سرنگ) یا کوئی ڈڈ گرینیڈ پھٹ گیا ہے۔ کوئی نقصان نہیں ہُوا۔" وہ پھر تنے کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا اور جمائی لے کر بولا ——— "جنگ تو ختم ہو جاتی ہے لیکن میدانِ جنگ میں دھماکے کئی دنوں تک ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی کوئی ڈڈ گولہ یا گرینیڈ آپ ہی آپ پھٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی

لاش کی انگلی مشین گن یا رائفل کے ٹریگر پر رہ جاتی ہے تو لاش اکڑتے وقت جب انگلی اکڑ جاتی ہے تو گن یا رائفل فائر ہو جاتی ہے۔ جب کتے یا گیدڑ لاشوں کو کھانے آتے ہیں تو ان کے پاؤں تلے آکر کوئی بارودی سرنگ پھٹ جاتی ہے اور ایسے دھماکے ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

وہ بولتے بولتے اونگھنے لگا اور دوسرے ہی لمحے اس کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ وہ سترہ راتوں سے جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر نظریں اُس کے چہرے پر رُک گئیں۔ بارود، گرد اور دھوپ سے جلا ہوا چہرہ پُرنور منظر آیا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ میں نے یہی تبسم شہیدوں کی لاشوں کے ہونٹوں پر بھی دیکھا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے زیرِ لب کہا —— "سو جاؤ، دم بھر کو سو لو، کل تمہیں ایک اور معرکہ لڑنا ہے" —— میں وہاں سے اُٹھا اور دبے پاؤں چل دیا۔

پورے چھ سال گزر گئے ہیں۔ میں نے پاک فوج کے اس سپاہی کو پھر کبھی نہیں دیکھا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ چہرہ پاک فوج کے ہر افسر اور ہر جوان کا چہرہ ہے۔ میں اسے ہر روز دیکھتا ہوں۔ تاریخِ اسلام اسے چودہ صدیوں سے دیکھ رہی ہے اور رہتی صدیاں اسے دیکھتی رہیں گی۔

ہماری تاریخ کا فخر اور مان انہی جانبازوں سے قائم ہے جنہیں ہماری آج کی نسل بدر میں تو نہیں دیکھ سکی تھی باٹا پور کے میدان میں دیکھ لیا ہے۔

وہ کون تھے؟ —— کہاں کے رہنے والے تھے؟ —— وہ بے نام سے دیہات کے گمنام سے جوان تھے۔ گمنام اس لیے کہ وہ سڑک پر خاکی وردی میں ملبوس ہمارے قریب سے گزر جایا کرتے تھے تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہمارے قریب سے کون گزر گیا ہے۔ لیکن کفر نے جب اسلام کو ایک بار پھر للکارا تو یہی گمنام جوان تاریخِ اسلام کے عظیم انسان بن گئے —— جن کا کوئی نام نہیں تھا وہ اپنے خون سے وطن کا نام روشن کر گئے۔ انہوں نے چونڈہ، واہگہ، برکی اور قصور کو بدر، حنین، قادسیہ اور یرموک کی لڑی میں پرو دیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

میں یہ کتاب قوم کے انہی گمنام جاں نثاروں کے مقدس نام سے منسوب کرتا ہوں۔

کتاب کی ابتدا ایک سپاہی کے خط سے کر رہا ہوں۔ رواج تو یہ ہے کہ کتاب کے لیے کسی سیاسی، علمی یا ادبی شخصیت سے پیش لفظ لکھوایا جاتا ہے۔ میں یہ رواج توڑ رہا ہوں اور ایک ایسے سپاہی کی تحریر پیش لفظ کے طور پر پیش کر رہا ہوں جو صحیح اُردو بھی نہیں لکھ سکتا۔ یہ خط مجھے دو سال گزرے ملا تھا۔ آپ بھی غور سے پڑھیے اور بتائیے کہ ہم اپنے غازیوں کو کیوں نہیں پہچانتے؟

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس کتاب میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہوں گا سوائے اس کے کہ اس میں آپ کو جنگِ ستمبر کی مکمل ڈائری ملے گی اور حق و باطل کے اس معرکے کے چند پہلو۔ یہ داستان مکمل نہیں، نہ ہو سکتی ہے۔ یہ تو بحرِ بیکراں ہے۔

اپنے جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ عنقریب پیش کر رہا ہوں جو حریت کی اس داستان کو مکمل تو نہیں کر سکے گا۔ البتہ تشنگی کم ہو جائے گی۔ انشاءاللہ یہ سلسلہ جاری رکھوں گا۔

عنایت اللہ

۶ ستمبر ۱۹۷۱

پیش لفظ

تُم غور کرو اور بتاؤ

ایک اَن پڑھ سپاہی کا خط۔ اس کی اپنی فوجی اُردو میں —— وہ کہتا ہے کہ جس نے سیالکوٹ کے میدان میں یا علی کا نعرہ لگا کر ٹانگ کٹوائی تھی، وہ آج کراچی میں ہینگین ٹماٹر کا نعرہ لگاتا ہے اور لوگ اسے لنگڑا سبزی والا کہتے ہیں۔ تم غور کرو اور بتاؤ کہ لوگ اپنے غازی کو کیوں نہیں پہچانتے۔

اڈیٹر صاحب اتم جنگ کا کہانی مانگتا ہے اور بولتا ہے کہ تم ہم کو انام دے گا۔ پر ہم تمہارے انام کے واسطے جنگ نہیں کیا۔ نعرۂ حیدری مار کر کافر سے لڑنے والا انام نہیں مانگتا۔ انام اللہ کے پاس ہے جو اگلے جہان ملے گا۔ تم کیا انام دے گا ہم کو مالم ہے نہیں ہے کہ تمہارا تلیم اور تمہارا سیاست کیا بولتا ہے۔ ہم یہ بولتا ہے کہ ہندو ہمارا دشمن ہے۔ ہندو مسلمان کا دوستی کبھی نہیں ہوتا۔ تم اڈیٹر بن جاتا ہے، پھر تم لیڈر بن جاتا ہے اور پھر تم بھو کا نعرہ مارتا ہے۔ ہم لیڈر نہیں ہے۔ تم ہم کو ڈنگر بولو، ہم کو پرواہ نہیں پر ہم بھو کا نعرہ نہیں مارتا۔ اس واسطے کہ تم نے باڈر کے گاؤں میں اپنا مائی بہن کا بے عزتی نہیں دیکھا۔ دشمن نے اُدھر بچوں کو جو کاٹ دیا وہ بھی تم نے نہیں دیکھا۔ وہ قیامت ہم نے دیکھا۔ تم ہندو کو دوست بناؤ۔ ہم نہیں بناتا۔

سنو۔ غور سے سنو۔ ہم تم کو اپنے جوڑی داروں کا کہانی سناتا ہے۔ تم کو پسند آئے گا تو خود ٹھیک سے لکھو اور چھاپنا ہے تو چھاپ دو۔ نہیں چھاپنا ہے تو مت چھاپو۔

تم کو مالم ہے کہ جب ہم لوگوں نے ادھر پاکستان بنا لیا تو ہندوستان میں کافر نے اُدھر بہت مسلمانوں کو کاٹ دیا۔ ان کا گھر جھگا ساڑ دیا۔ ان کا مائی بہن کا عزت برباد کیا اور ان کے بچوں کو برچھیوں اور کرپانوں سے ٹوٹے ٹوٹے کر دیا۔ ہم تو ادھر کا رہنے والا تھا اور ہمارا ایک بھی بچہ نقصان نہیں ہوا پر ہندوستان میں کافر جو بچہ شہید کیا وہ سب ہمارا بچہ تھا۔ اُس ٹیم ہم بھی بچہ تھا پر سب سمجھتا تھا۔ ہم سب جانتا تھا کہ کیہڑا دوست اور کیہڑا دشمن ہے۔ کشمیر کا مسلمان ہمارا بھائی بند ہے۔ کافر نے اُدھر بھی مائی بہن کا عزت خراب کیا اور بے گناہ مسلمان کو قتل کیا۔ ہم کو اُس ٹیم مالم تھا کہ ہندو کو پاکستان پسند نہیں ہے۔ ہمارا

گاؤں میں ہندوستان کا بہت پناہ گزین آگیا۔ وہ بہت غریب تھا۔ وہ اُدھر اپنے گھر میں غریب غربا نہیں تھا پر کافر نے ان کو غریب کر دیا۔ ہم ان کو روٹی کپڑا دیا اور وہ لوگ آباد ہو گیا۔ پناہ گزین بھائی بند ہم کو ہندو کا بہت برا برا بات سناتا تھا تو ہمارا دل تڑپ جاتا تھا۔

پھر ہم بڑا ہو گیا پناہ گزین بچہ بھی بڑا ہو گیا۔ ہم سب کا چھاتی پلیٹ کے برابر ہتی چوڑی ہو گیا تو ہم سب کو بولا کہ جو مائی کا لال ماں کا سچی دھار دودھ پیا ہے وہ پاکستان کا فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ پھر ہمارے گاؤں کا آٹھ جوان پناہ گزین اور چھ جوان مقامی بھرتی ہو گیا۔ کوئی توپ خانے میں چلا گیا، کوئی پلٹن میں، کوئی ٹینک کور میں اور ہم کو فیلڈ ایمبولینس میں بھیج دیا۔ ہم نادان تھا۔ اس ٹیم مالم نہیں تھا کہ فیلڈ ایمبولینس لڑتا نہیں ہے۔ وہ زخمی کو اٹھاتا ہے پر ہم تو کافر کے ساتھ ہتھو ہتھ لڑنے کے لیے تڑپتا تھا۔ یہ سن چھپن کا بات ہے ہم پاکستان کے نو سال بعد بھرتی ہوا اور بھرتی ہونے کے نو سال بعد سن پینسٹھ میں خدا نے ہم کو دشمن کا شکل دکھایا۔ ہم بس اس واسطے بھرتی ہوا تھا کہ دشمن کا شکل دیکھے اور مالم کرے کہ دشمن کتنا بہادر اور کتنا نخنے خان ہے کہ سن سنتالی میں ہمارے بچے کو برچھے اور کرپان سے کاٹ دیا اور ہمارا مائی بہن کا عزت برباد کیا۔

چھ ستمبر سن پینسٹھ سے چار دن پہلے ہمارا یونٹ ایک بریگیڈ کے ساتھ اٹیچ ہو کر آگے چلا گیا۔ اُدھر ہمارا آرمی چھمب جوڑیاں میں دشمن کو بھجا دیا تو ادھر پاکستان کو خطرہ لگ گیا۔ ہمارا آرمی ادھر بھی ماجود تھا۔ تم ہم سے مت پوچھو کہ ہمارا بریگیڈ کا نمبر کیا تھا۔ ہم ایسا بات اس واسطے نہیں بولے گا کہ دشمن کا جاسوس کو مالم پڑ جاتا ہے اور وہ ملک کا نقصان کرتا ہے۔ تم ہم کو فوجی بیوقوف بولتا ہے پر ہم اتنا بیوقوف نہیں ہے۔ ہم اندر کا بات باہر نہیں بولتا۔ تم غور کرو اور ہم سے ایسا ویسا بات مت پوچھو۔

پھر چھ ستمبر کی سویر کو دشمن پاکستان پر جبر جست حملہ کر دیا۔ ہم محاذ سے

بہت پیچھے تھا۔ اس واسطے کہ فیلڈ ایمبولینس محاذ سے بہت پیچھے رہتا ہے۔
جب آڈر ملتا ہے تو زخمی کو اٹھانے آگے جاتا ہے۔ ہم کو حملے کا مالم پڑ گیا تو ہمارا
خون جوش میں آگیا۔ ہم آگے جا کر لڑنے کو تڑفتا تھا پر ہمارا ڈیوٹی لڑائی کرنے
کا نہیں تھا۔ ہمارا ڈیوٹی زخمی جوان کو پیچھے لانے کا تھا۔ پیچھے زخمی کا بہت
اچھا بندوبست تھا۔ پہلے بہت مشین گن اور چھوٹے ہتھیار کا فائر کا تڑ تڑ سنا۔
ادھر ہمارے بریگیڈ کے جوان نے فیر کھول دیا۔ ہم کو ہمارا کپتان صاحب آڈر دیا
کہ سٹیچر اور گاڑی تیار کرلو۔ آگے بہت جوان زخمی ہو رہا ہے۔ ہم کپتان صاحب
کو بول دیا کہ ہم دونوں کام کرے گا۔ زخمی کو بھی اٹھائے گا اور ساتھ ساتھ
لڑے گا۔ ہم کو ہتھیار دے دو۔ پر کپتان صاحب بولا کہ تم بے فضول بات مت
بولو۔ تم دشمن کے واسطے بھی ایسا ہے جیسا اپنی فوج کے واسطے۔ تم کو دشمن
کا زخمی جوان ملے گا تو اس کو بھی اسی مافق اٹھائے گا جس مافق اپنے جوان
کو اٹھاتا ہے۔ تم میڈیکل کور کا جوان، دوست اور دشمن کے واسطے ایک
مافق ہے۔

ہم آڈر مانتا ہے پر ہم دل میں سوچ لیا کہ بے شک ہمارے پاس ہتھیار
نہیں ہے پر دشمن سامنے آئے گا تو ہم ضرور لڑے گا۔ ہم اپنا مائی بہن کا عزت
خراب کرنے والے دشمن کا زخمی جوان نہیں اٹھائے گا۔ ہم بے غیرت نہیں ہے۔
ہم اپنا زخمی جوان کو اٹھانے کے واسطے سٹانڈ بٹو ہو گیا۔ آگے بڑا زور
کا فیر تھا۔ ادھر پیچھے ایک گاؤں میں سویرے کا بانگ مل گیا۔ تھوڑی دیر پیچھے ہمارا
توپ خانے نے فیر کھول دیا۔ قسم سے اپنا توپ خانے کا آواز سن کر روح راضی
ہو گیا۔ پھر دشمن کا توپ خانہ پھٹ پڑا۔ اللہ توبہ! ہم کو مالم نہیں کہ کافر اتنا
توپ کدھر سے لے آیا۔ بڑا ظالم فیر تھا۔ کلیجہ آگے سے باہر کو آتا تھا۔ تم غور کرو
جب توپ خانہ فیر کھولتا ہے تو آگے کوئی جوان زندہ نہیں رہتا۔ جو زندہ رہتا ہے
اس کا ٹانگ یا بازو نہیں ہوتا۔ یعنے جوان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔

دشمن کا فیر ہم سے بہت آگے تھا۔ سارا گولہ ہمارے ٹینک اور پلٹن کے
جوان پر گرتا تھا۔ ہم آڈر کا قیدی تھا۔ ہمارا بھائی بند آگے کٹ رہا تھا اور ہم
پیچھے بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ بہت شرم کا بات تھا۔ پر ہم کیا کرتا۔ فوج میں آڈر
چلتا ہے اور ہم آڈر مان لیتا ہے۔ جوان اپنی مرضی نہیں کر سکتا نہیں تو ڈسپلنگ
خراب ہوتا ہے۔ پھر فوج ہار جاتا ہے۔ ٹینک اور پلٹن کا جوان ہمارا بھائی بند
ہوتا ہے پر ہم اس کا کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دو نفل نیت لیا اور سلام
پھیر کر خدا کا درگاہ میں دعا مانگا کہ یا مولا علیؑ ہمارے بھائی بند کو سلامت رکھو اور
ان کو ہمت دو کہ بھاگ نہ جاتے اور دشمن کا بہت سارا گولہ ادھر ہمارے
اوپر پھینکو۔

جب سویر کا چانن ہو گیا تو کپتان صاحب نے آڈر دیا کہ آگے جاؤ۔ ہم
سٹیچر اور سامان لے کر آگے گیا پر ہم تم کو نہیں بتا سکتا کہ ادھر کیا حال تھا۔ تم غور
کرو۔ پلٹن نے اپنا اپنا زخمی ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ سب لہولہان تھا اور اپنے
زخموں پر فیلڈ پٹی باندھا ہوا تھا۔ میڈیکل آفیسر اور بہت سارا نرسنگ اردلی
ہمارے ساتھ تھا۔ سب زخمی کو جلدی جلدی دیکھا اور جیسا جیسا زخمی تھا ویسا
ویسا پٹی باندھا اور ہم کو آڈر دیا کہ جلدی پیچھے لے آؤ۔

ہم پہلے کبھی لڑائی نہیں دیکھا تھا۔ گاؤں میں کبھی کبھی لوگ آپس میں لڑتا
تھا، ہم تماشا دیکھتا تھا۔ جس کو ایک سوٹا پڑتا تھا، وہ دہائی دہائی کرتا تھا، پر
ادھر محاذ پر ہم نے دیکھا کہ جوان کے جسم سے گولی گزر گیا یا توپ کے گولے سے جسم
کا بوٹی اڑ گیا پر وہ دہائی دہائی نہیں کرتا تھا۔ جس جوان کا کھوپڑی کھل گیا وہ بھی
دہائی دہائی نہیں کرتا تھا۔ ہم ایک زخمی جوان کو سٹیچر پر ڈالنے لگا تو زخمی جوان بولا
کہ تم کیا کرتا ہے؟ ہم بولا۔ گرائیں، ہم تم کو پیچھے لے جا کر تمہارا زخم ٹھیک کر دے
گا۔ وہ بولا۔ تم ہم کو اتنا بے غیرت سمجھتا ہے کہ میرا پلٹن لڑ رہا ہے اور تم ہم کو پیچھے
لے جائے گا۔ ہم بولا۔ جوان تم کیسے لڑے گا؟ تمہارا سارے جسم سے خون نکلتا

ہے۔ وہ بولا۔ پرواہ نہیں۔ جاؤ۔ کسی اور کو اٹھا کر لے جاؤ۔ ہم ادھر ہی مرے گا۔ اس نے دشمن کو ماں بہن کا گالی نکالا۔ وہ بہت زخمی تھا۔ ہم اس کو جبر جستی سٹیچر پر ڈالنے لگا تو اس نے ہم کو بھی گالی نکالا اور بولا کہ تم جاؤ۔

پھر ہمارا کپتان صاحب آگیا تو ہم اس کو رپورٹ کیا کہ یہ زخمی جوان پیچھے نہیں جاتا۔ ہم سمجھا کہ کپتان صاحب اس کو ڈانٹ مارے گا اور آڈر دے گا پر کپتان صاحب کا آنکھ میں آنسو آگیا اور اس نے زخمی جوان کا سر اپنی چھاتی سے لگا کر بولا، دیکھو جوان ہمارے واسطے شرم کا بات ہے کہ علاج کے بغیر تم ادھر مر جائے گا۔ دشمن کیا بولے گا کہ پاکستان کے پاس کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ ہم تم کو دو دن میں ٹھیک کر دے گا پھر ادھر آکر لڑو۔ پر جوان بولا۔ صاحب ہم ہسپتال میں مر گیا تو خدا کو کیا جواب دے گا۔ کپتان صاحب اس کو راضی کر لیا اور جوان بولا ہم سٹیچر پر نہیں لیٹے گا۔ دشمن دیکھے گا تو بولے گا کہ پاکستان کا جوان زخمی ہو کر چل نہیں سکتا۔

تم غور کرو۔ وہ اتنا زخمی تھا کہ وردی لال ہو گیا تھا پر وہ جوان اپنے قدم پر چلا پر گر پڑا۔ ہم اس کو سٹیچر پر ڈال دیا تو وہ رو پڑا۔ ہم اس کو بولا گرائیں، رو مت۔ تمہارا بہت اچھا علاج ہو جائے گا۔ وہ جوان بولا۔ ہم زخم سے نہیں روتا۔ ہم اس واسطے روتا ہے کہ تم ہم کو بزدل بنا دیا اور ہم کربلا کے میدان سے جا رہا ہے۔ ہم بزدل بن گیا۔

تم کو اللہ پاک کا قسم ہے اڈیٹر صاحب۔ ہمارا بات سچ مانو اور غور کرو۔

ہمارا جوان کیسا دل گردے سے لڑائی کیا تھا۔ ہم بہت غضب کا نظارہ دیکھا ہے۔ تم کبھی نہیں دیکھ سکتا ہے۔ تم بولے گا کہ ہم جھوٹ مارتا ہے اس واسطے تم ہمارا کہانی نہیں چھاپے گا۔ تم غور کرو۔ ایک جوان کا داہنے ٹانگ سے مشین گن کا پورا بار اس گولی گزر گیا پر وہ اپنی پوزیشن سے نہیں اٹھا۔ ہم اس کو اٹھانے کا کوشش کیا تو وہ ہم کو بولا۔ تم کافر کا بچہ ہے جو مسلمان کو کافر کے سامنے سے

اٹھاتا ہے۔ ہم کو مالم ہے کہ ہمارا ٹانگ بیکار ہو گیا۔ تم میرا بیکار ٹانگ کاٹ کر لے جاؤ۔ ہم کو ادھر رہنے دو۔ دم میں دم ہے تو لڑے گا۔ دم نکل گیا تو اللہ بیلی۔ پر ہم اس کو جبر جستی سٹیچر پر ڈال دیا۔

اڈیٹر صاحب۔ تم اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھو اور غور کرو۔ اگر تم ہندوستانی فوج کا کمانڈر ہے تو تم اس کو کیسے شکست دے گا جس کا جوان یار اس گولی کھا کر بولتا ہے کہ ہم لڑے گا، پوزیشن نہیں چھوڑے گا۔ تم اس کو شکست نہیں دے سکتا۔

ادھر تمام زخمی ایسا ہی تھا جو پیچھے جانے کا آڈر نہیں مانتا تھا سب بولتا تھا کہ ہم شہید ہو جائے گا تو لاش لے جانا۔ پہلے روز ہم سوچا کہ محاذ کا زخمی بہت برا زخمی ہو گا اور وہ بہت دہائی دہائی کرے گا۔ پھر ہم اس کو کیسا سنبھالے گا۔ پر ہم پہلے روز زخمی کو دیکھا تو ہم کو مالم ہو گیا کہ ہمارا مشکل یہ نہیں کہ اس کو کیسے سنبھالے گا۔ اصل مشکل یہ ہو گیا کہ زخمی ہمارا بات نہیں مانتا تھا اور پیچھے نہیں جاتا تھا۔ ہم ان کو بولا کہ جوان، ہم کو خدا کا لعنت اگر تم ہماری موجودگی میں ادھر شہید ہو جاوے۔ تمہارا ڈیوٹی لڑنے کا ہے اور جب تم زخمی ہو جاتا ہے تو ہمارا ڈیوٹی تمہارا خدمت کرنے کا ہے۔ پر وہ بولتا تھا کہ تم بس یہ خدمت کرو کہ ہم مر جائے گا تو ہم کو ادھر ہی دفنا دو، اوپر مٹی ڈالو اور فاتحہ پڑھو۔ بس ہم راضی، ہمارا خدا راضی۔ ایک زخمی جوان ہم کو بولا کہ تم ہمارا لاش کو بھی پیچھے لے جائے گا تو ہم اگلے جہان تمہارے گلے میں پلّہ ڈالے گا۔ جو جوان بے ہوشی میں ہوتا تھا وہ تکلیف نہیں دیتا تھا۔ ہم اس کو اٹھا کر گاڑی میں لوڈ کر دیتا تھا۔

پہلے دن کا زخمی جوان کو ہم بہت اوکھا ہو کر پیچھے لایا۔ سولہ جوان ایسا زخمی تھا کہ ان کا پٹی کر دیا پر میڈیکل آفیسر بولا کہ سی ایم ایچ بھیج دو۔ سولہ کا سولہ جوان ہسپتال سے انکاری ہو گیا اور عرض کیا کہ صاحب ہم پر رحم کرو اور ہم ادھر ٹھیک ہو جائے گا اور پھر اپنی پلٹن میں آگے چلا جائے گا۔ ہمارا میڈیکل آفیسر رحم نہیں کیا۔ آڈر دیا کہ ہمارا ڈیوٹی میں گڑبڑ مت کرو۔

ہمارا ایہ پوسٹ محاذ سے پیچھے ایک گاؤں میں تھا۔ گاؤں کے لوگ بہت بہادر اور بھائی بند لوگ تھے۔ تمام عورت اور تمام بچہ ادھو جمع ہو گیا اور ہم سے بولا کہ ہم کو بتاؤ کہ ہم زخمی جوان کے واسطے کیا کرے۔ وہ چار بالٹی دودھ گرم کرکے لے آیا بولا، زخمی جوان کو پلاؤ۔ گاؤں کا سب مائی بہن اور جوان لڑکی دوپٹہ ہاتھ میں لے کر دعا کرتا تھا پھر زخمی جوان کے سر اور منہ پر ہاتھ پھیر کر بولتا تھا، میرے ویر ہم کو کچھ بتاؤ کہ تمہارے واسطے کیا کرے۔ تمہارا مائی بہن ادھر نہیں ہے۔ ہمارا سب زخمی جوان جوش میں آکر بولتا تھا، بہن جی، بس دعا کرو ہم ٹھیک ہو جاوے پھر ہم تم کو بتائے گا کہ تمہارا ویر اپنی بہن کی عزت کے واسطے کیا کرتا ہے۔

گاؤں کا لوگ نوار کا بہت سارا پلنگ اور اچھا اچھا چارپائی لے آیا اور سب پر نیا کھیس، نیا چادر اور نیا سرہانہ ڈال کر بولا۔ سب زخمی جوان کو ادھر لٹاؤ۔ ان لوگوں کو ہمارا اسٹیچر برا لگتا تھا اور بولتا تھا کہ زخمی جوان کو اس پر تکلیف ہو گا۔ گاؤں کا تمام جوان مرد بولتا تھا کہ ہم آگے جا کر لڑے گا۔ ہم ان کو بولا کہ یہ ڈانگ سوٹے کا لڑائی نہیں۔ تم رفل توپ کا لڑائی نہیں لڑ سکتا۔ ہم ان کو بولا۔ جب ادھر توپ چلے گا تو تمہارا گردہ کلیجہ باہر آجائے گا پر وہ ہمارا زخمی جوان کو دیکھ کر بولتا تھا کہ یہ مائی کا لال لڑتا ہے تو ہم بھی مسلمان مائی کا دودھ پیا ہے۔ ہم ان کو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا راستہ بتا دیا اوہ وہ آگے چلا گیا۔ ہم کو مالم نہیں کہ ان کا کیا بنا۔

ہم سی ایم ایچ جانے والے زخمی جوانوں کو ایمبولینس اور ٹرک میں ڈال رہا تھا۔ ان کا نفری سولہ تھا۔ سب سٹیچر زمین پر پڑا تھا ہم پندرہ سٹیچر گاڑی میں لوڈ کیا اور سولھواں سٹیچر دیکھا وہ خالی تھا۔ ہم سب سے پوچھا یہ زخمی جوان کدھر گیا۔ سب بولا مالم نہیں۔ ہم کو فکر پڑ گیا۔ ایک گاؤں والا بڈھا آدمی بولا۔ ہم کو مالم ہے۔ اس نے ہم کو دکھا دیا۔ وہ زخمی جوان سب کا دھیان

سے ہٹ کر چھپ گیا تھا۔ جب ہمارا دھیان دوسرے زخمی کو لوڈ کرنے کی طرف تھا تو وہ سٹیچر سے کھسک گیا اور رینگ رینگ کر دیوار کی آڑ میں چھپ گیا ہم اس کو دیکھ لیا تو اس نے منت کیا کہ ہم کو ہسپتال مت بھیجو۔ ادھر ٹھیک کر دو اور محاذ پر بھیج دو۔ ہم اس کو جبر جبتی اٹھا کر لے گیا۔

جب ہم گاڑیوں میں زخمی جوانوں کو پھر چیکنگ کرنے لگا تو ایک زخمی جوان نے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بہت زخمی تھا۔ سر کھل گیا تھا۔ اس نے ہم کو اپنی پلٹن کا نمبر بتایا پھر اپنی کمپنی بتایا پھر اپنا کمپنی کمانڈر کا نام بتایا اور بولا کہ تم ہمارے کمپنی کمانڈر کو بول دینا کہ ہمارا غلطی قصور بخش دینا۔ ہم آخیر دم تک تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ تم ہم کو بخش دو۔ بس اس جوان نے کلمہ شریف پڑھا اور ہمارے سامنے شہید ہو گیا۔ ہم سب گاڑی کو سی ایم ایچ بھیج دیا۔ خود ساتھ نہیں گیا۔ خدا مالم ہے کیھڑا زندہ رہا اور کیھڑا شہید ہو گیا۔

تم غور کرو۔ ہمارے جسم پر جنگ کا کوئی زخم نہیں ہے، پر ہمارے دل میں بہت زخم ہے۔ مائی کا بہت سارا لال ہمارے ہاتھوں میں شہید ہو گیا۔ تم غور کرو۔ کوئی زخمی جوان آخیر ٹیم اپنا مائی بہن کو نہیں پکارتا تھا صرف اپنے کمپنی کمانڈر کو یاد کرتا تھا کہ ہم آخیر دم تک اس کا ساتھ نہیں دیا۔ پہلے دن کے زخمی جوانوں نے ہمارے دل سے ڈر خطرہ دور کر دیا۔ دیکھو اڈیٹر صاحب۔ ہم آخیر انسان ہے۔ ہم پہلے دن موت سے ڈرتا تھا۔ غور کرو ہم جھوٹ نہیں بولے گا۔ پر جب ہم پلٹن اور ٹینک رجمنٹ کا زخمی جوان دیکھا تو ہمارے دل سے موت کا ڈر نکل گیا۔ ہم کو مالم ہو گیا کہ ملک کے واسطے مرنا اچھا بات ہے۔ پھر ہم ڈرتا تھا کہ دشمن ہم کو شکست دے دے گا۔ اس واسطے کہ ہمارا نفری بہت تھوڑا ہے پر جب ہم پہلے روز میدان میں اپنے زخمی جوانوں کا نعرۂ حیدری سنا تو ہم نے سوچ لیا کہ ہندو ہم کو شکست نہیں دے سکتا۔

پھر ہمارا جگرا شیر مافق ہو گیا۔ پر ہم کو وہم تھا کہ ادھر تو ہمارا ہی جوان نقصان ہوتا ہے۔ مالم نہیں دشمن کا بھی کوئی جوان نقصان ہوتا ہے کہ نہیں۔ ہم کو نظر نہیں آتا تھا۔

دو دن گذر گیا تو ہم کو آڈر ملا کہ آگے جانے والا فیلڈ ایمبولینس کا جوان آگے چلے جاوے۔ اپنا بریگیڈ ایڈونس کرتا ہے۔ ہم آگے گیا تو بریگیڈ بہت آگے چلا گیا تھا۔ ہم اور آگے گیا۔ اللہ توبہ۔ ہر طرف دشمن کا لاش ہی لاش تھا اور لاش کے ساتھ دشمن کا زخمی جوان بھی تھا۔ وہ سب چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔ ہم نے جب پہلا زخمی کافر دیکھا تو سوچا کہ کافر اسی مافق تڑف تڑف کر مر جائے تو ہمارا روح راضی ہو جائے گا۔ پر وہ بہت زخمی تھا اور زمین پر پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیا پر اونچا نہیں بول سکتا تھا۔ ہم اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے پانی مانگا۔ ہمارے نیڑے ایک کافر مرا پڑا تھا۔ ہم نے اس کا پانی کا بوتل زخمی کے منہ سے لگا دیا۔ پھر ہم نے سوچ لیا اگر وہ کافر ہے تو کیا ہوا۔ آخر یہ بھی کسی مائی کا لال ہے۔ ہم مسلمان ہے۔ ہم کو رحم آگیا اور اپنے جوڑی دار کو بلا کر کافر کو سٹیچر پر رکھ کر گاڑی میں لوڈ کر دیا۔ اس کے بعد ہم کو کپتان صاحب نے فالم کیا اور بولا کہ اب تم کو جو زخمی ملے گا وہ سب دشمن کا جوان ہو گا سب کو اچھی طرح سے اٹھاوے۔ ظلم مت کرو۔ اپنے خدا کا حکم مانو۔ پھر ہم زخمی کا بہت خیال کیا۔

دشمن کا لاشوں کا ڈھیر دیکھا تو ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا اور ہم نے حساب کیا کہ ہمارا ایک جوان زخمی یا شہید ہوا تو دشمن کا ایک سو جوان نقصان ہوا۔ پھر ہم خوش ہوا کہ ہمارے جوان کا خون برباد نہیں ہوا۔

تم غور کرو۔ ہندو کیسا بے غیرت قوم ہے۔ اپنے زخمی جوانوں کو لاشوں کے ساتھ پیچھے پھینک دیا۔ ہندو اور سکھ زخمی بہت شور کرتا تھا اور روتا تھا۔ ہم اس کو چپ کراتا تھا اور اس پر ترس آتا تھا۔ ایک ہندو حوالدار بھگوان، بھگوان، بھگوان کرتا تھا۔ ہم اس کو بولا۔ کافر اب بھگوان کو مت یاد کرو۔ اب تم پاکستان میں

آگیا ہے۔ اس واسطے مسلمان کے خدا کو یاد کرو۔ تمہارا بھگوان سچا ہوتا تو تم کو زخم کا درد نہ ہوتا۔ ہمارے زخمی جوان کو دیکھو۔ وہ مولا علیؓ کے نام پر یاراں گولی کھاتا ہے اور اُف نہیں کرتا اور بولتا ہے کہ ہم پیچھے نہیں جائے گا۔

اڈیٹر صاحب، ہم تمہارا مافق تلیم والا آدمی نہیں ہے۔ پر ہم نے جو سبق محاذ پر پڑھا وہ تم کو کسی کتاب کاپی میں نہیں مل سکتا۔ ہم کو ادھر مالم ہوا کہ پاکستانی جوان کے جسم سے یاراں گولی گذر گیا تو اس کو رتی برابر درد نہیں ہوا۔ اس واسطے کہ اس کے سینے پر قرآن باندھا ہوا تھا اور اس کے منہ سے سچے اللہ پاک کا نعرہ نکلتا تھا۔ ادھر ہندوستانی جوان کو گرنیڈ کے ٹوٹے کا تھوڑا زخم آگیا تو کافر اپنا مائی باپ کو پکارتا تھا اس واسطے کہ وہ قرآن مجید کو نہیں مانتا اور اس کا خدا جھوٹا ہے۔ تم سب پڑھنے سننے والے کو بولو کہ غور کرو اور ہر روز قرآن مجید کا تلاوت کرو اور سچے اللہ پاک کو ہر وقت یاد کرو پھر جب تم دشمن کے ہوائی جہاز کے بم سے زخمی ہو جائے گا تو تم کو رتی برابر درد نہیں ہو گا۔ تم کو خوشی ہو گا کہ تم خدا کے واسطے زخمی ہوا۔

غور کرو۔ ہم تم کو اپنا بہادری کا کہانی نہیں سناتا۔ نہیں تو تم بولے گا کہ جھوٹ مارتا ہے۔ ہم تم کو دوسرے جوان کا بہادری کا کہانی سناتا ہے۔ غور کرو۔ یہ کہانی ہے۔ یہ شٹوری نہیں ہے۔ شٹوری فلم کا ہوتا ہے۔ وہ جھوٹا ہوتا ہے، کہانی سچا ہوتا ہے۔

ہم تم کو ان بہادروں کا کہانی سناتا ہے جن کا صرف ایک ٹانگ پیچھے رہ گیا تھا۔ ان کا باقی دھڑ کدھر تھا؟ ہم کو مالم نہیں تھا وہ سب اللہ پاک کے واسطے سیس نوا دیا تھا۔ ہم نے بہادر کا ٹانگ اور بازو اٹھا لیا۔ ہم کو مالم نہیں تھا کہ یہ ایک جوان کا ہے یا دو جوان کا۔ ہم اُدھر دو قبر کھود کر ایک میں ٹانگ اور دوسرے میں بازو دفن کر دیا اور اُوپر پورے پورے آدمی جتنا بڑا دو قبر بنا دیا۔ ہم ادھر بہت دن فاتحہ پڑھا۔ وہ بہت خوش قسمت جوان تھا جو قوم کے

مائی بہن کا عزت کے واسطے کربلا کے میدان میں کٹ گیا۔ ہم ایسا بہت
قبر بنایا تھا۔ نہ ہم کو مالم ہے نہ تم کو مالم ہے کہ وہ کون جوان تھے پر یاد رکھو اور
غور کرو۔ وہ ہمارا تمہارا مافق کسی مائی کا لال تھے۔ جن کو مائی نے اپنی چھاتی
سے دودھ پلا کر شیر ببر بنا دیا تھا۔ ان کو اتنا فرصت نہیں ملا کہ مائیوں سے بتی
دھار بخشوا لیتے۔ ان کا مائی بہن گھر میں بیٹھا انتظاری کرتا ہے کہ گھبرو بیٹا اور
سوہنا ویر چھٹی لے کر گھر آئے گا پر آج تین سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ سوہنا ویر چھٹی
نہیں گیا۔ مائی بہن کو مالم نہیں ہے کہ گھبرو بیٹا اور شیر ببر، کافر کی چھاتی پر گج وج کر
باڈر کی مٹی میں مل کر مٹی ہو گیا ہے۔

تم غور کرو۔ باڈر کے ساتھ جتنا زمین ہے وہ سب شہیدوں کا قبرستان ہے۔
جدھر باڈر کا لوگ ہل چلاتا ہے ادھر بہت شہید دفن ہے۔ سن سنتالی کا شہید بھی
ادھر دفن ہے پر قبر کوئی نہیں ہے تم ادھر جاؤ اور کسی جگہ سے مٹی اٹھا کر ناک
سے لگاؤ تو تم کو شہید کے خون کا خوشبو آئے گا۔

ہم ہر سال محاذ پر جاتا ہے اور فاتحہ پڑھتا ہے۔ تم بھی اُدھر جاؤ اور
فاتحہ پڑھو۔ پچھلے سال ہم اُدھر گیا تو اُدھر کوئی پیسے دھیلے والا آدمی ٹوب ویل
لگا رہا تھا۔ ہم ان کو بولا کہ دیکھو تم کو مالم نہیں ہے۔ ادھر ہم دو قبر بنایا تھا۔
ایک میں ایک شہید کا ٹانگ اور ایک میں ایک شہید کا بازو دفنایا تھا۔ سب
لوگ کام چھوڑ دیا اور بولا کہ ہم کو کوئی ہڈی نہیں ملا۔ ہم اس کو بول دیا کہ دیکھو
کوئی ہڈی ملے تو اس کو مت پھینکو۔ اس کا پورا قبر بناؤ اور اس پر دیا جلاؤ۔
وہ تمہارے شہید کا ہڈی ہوگا۔ ہم اس کو بتا دیا کہ جو ہڈی زمین کے اندر سے
ملے گا وہ شہید کا ہوگا اور جو ہڈی زمین کے باہر سے ملے گا وہ کافر کا ہوگا۔

ہم اس کو شہیدوں کا بہت کہانی سنایا۔ ٹوب ویل کا مالک رونے لگا اور
بولا۔ ہم ادھر ٹوب ویل نہیں لگائے گا۔ ادھر شہید دفن ہے۔ ہم اس کو بولا۔ تم جدھر
مرضی ہے ٹوب ویل لگاؤ اور مکان کوٹھے بناؤ۔ یہ تمہارا زمین جائداد ہے۔ ہمارا

جوڑی دار اس واسطے ادھر شہید ہو گیا کہ تمہارا زمین جائداد پر ہندو کا قبضہ نہ
ہو جاوے۔ اس امیر آدمی نے ہم کو تین سو روپیہ دیا اور بولا کہ کسی شہید کی مائی
کو دے دو۔ ہم نے روپیہ نہیں لیا۔ اس کو بولا تم شہید کی مائی کا قیمت نہیں
دے سکتا۔ شہید کی مائی کو اس کے بیٹے کا قیمت اگلے جہان خدا سے ملے گا خدا
کا کوئی بندہ شہید کا قیمت نہیں دے سکتا۔

تم غور کرو۔ ہم لوگ شہید کو کدھر کدھر دفن کیا۔ چونڈہ کا محاذ بہت ظالم محاذ
تھا۔ آدمی ٹینک سے لڑ گیا۔ پاک فوج کا جوان دشمن کا حملہ روک دیا اور اس کا
بہت نقصان کر دیا پر پاک فوج کو اپنے جوان کا بہت قربانی دینا پڑا۔ محاذ
کا حالت ایسا تھا کہ مالم نہیں پڑتا تھا کہ دشمن کا ٹینک کدھر سے آ جائے گا۔
کبھی ہمارا جوان دشمن کے پیچھے چلا جاتا تھا کبھی دشمن کا ٹینک رجمنٹ
ہمارا پوزیشن کے پیچھے آ جاتا تھا۔ ہمارا جوان زخمی ہوتا تھا تو مالم نہیں پڑتا
تھا کہ پیچھے کدھر سے لے جائے گا۔ ہر طرف خطرہ تھا۔ ایک روز ہم اور ہمارا
ایک جوڑی دار ایک چھوٹا سا خالی گاؤں سے گذرا تو ایک مکان کے پیچھے
ہمارا پلٹن کا ایک جوان بیٹھا تھا اور مٹی کا بہت بڑا ڈھیری پر ہاتھ پھیر
رہا تھا۔ اس کے پاس ایک گینتی اور ایک بیلچہ پڑا تھا ہم بولا۔ گرائیں کیا کرتا
ہے؟ وہ بولا۔ اپنے ایک گرائیں کو دفنایا ہے ہم بولا تم لاش کو پیچھے کیوں
نہیں بھیج دیا؟ ہم فیلڈ ایمبولینس والا جو ادھر ہے پھر تم لاش ادھر کیوں دفنا
دیا؟ وہ بولا۔ ہمارا گرائیں وصیت کیا تھا کہ ہم کو محاذ پر دفناؤ۔

پھر یہ جوان جس نے اپنے گرائیں کو دفنایا تھا ہم کو بولا۔ دیکھو دوستو تم
فیلڈ ایمبولینس کا جوان ہے۔ ہم مر جاوے اور تم ادھر موجود ہو تو میرا لاش ادھر
میرے گرائیں کے ساتھ دفناؤ۔ یہ ہمارا جگری یار تھا۔ ہم جدا نہیں ہو سکتا۔ اللہ
کا کرنا یہ ہوا کہ تین روز بعد ہم آگے سے تیرہ زخمی اور ایک شہید کو لایا۔ ہم نے
شہید کو پہچان لیا۔ وہی جوان تھا۔ پر ہم کو اپنی مرضی سے اس کو اس کے گرائیں

کے نیڑے دفنانے کا آڈر نہیں تھا۔ ہم نے اپنے نیب صوبیدار صاحب کو عرض کیا کہ یہ شہید ایسا ایسا وصیت کیا تھا۔ ہم اس کو اس کے گرائیں کے پاس دفنائے گا۔ نیب صوبیدار صاحب بولا۔ ہم کو ایسا آڈر نہیں ہے۔ ہم نیب صوبیدار صاحب کا پیر گھٹا پکڑ لیا اور بولا۔ شہید کا بات مت مانو تو اللہ پاک خوش نہیں ہوگا۔ نیب صوبیدار صاحب مان لیا اور ہم اس شہید کو ایک کمبل میں لویٹ کر اس کے گرائیں کے داہنے بازو دفنا دیا۔

دیکھو اڈیٹر صاحب۔ غور کرو۔ یہ مت سوچو کہ ہم سب شہید اُدھر دفنا دیا۔ ایسا بات نہیں ہے۔ شہید کا لاش پورا عزت کے ساتھ بکسے میں بند کرتا تھا اور اس کے گاؤں بھیج دیتا تھا۔ پر ادھر ٹرک کم تھا اور نفری بھی کم تھا۔ اس واسطے بعضے شہید کا لاش چھاؤنی کے قبرستان میں دفنا دیتا تھا اور قبر پر شہید کا یونٹ نمبر، اس کا نمبر اور نام کا چھٹی لگا دیتا تھا۔

اب ہم تم کو بتائے گا کہ ہمارا پیادہ جوان سیالکوٹ کے ظالم میدان میں ٹینک کے برخلاف کس طرح لڑائی کیا۔ اُدھر ہم کو ایک بڑے گاؤں کا نام یاد ہے۔ اس کا نام بونز ڈوگراں دی ہے۔ ادھر ایک روز ہمارا ایک ٹینک سکاڈرن کا بہت سارا جوان شہید اور زخمی ہو گیا۔ وجہ یہ ہو گیا کہ دشمن کا ٹینک ہمارا اسکاڈرن کے پیچھے آ گیا تھا۔ زخمی کا حالت بہت بُرا تھا اور ادھر لاش جو تھا اس کا حالت بھی ٹھیک نہیں تھا۔ تم غور کرو، ہم تم کو بتا نہیں سکتا وہ کیسا لڑائی تھا۔ ہم سٹیچر اور گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ سب کو اٹھا کر لے آیا۔ پر ہم سے مت پوچھو کہ جو جوان ٹینک کے اندر سڑ گیا اس کا لاش کدھر گیا۔ ٹینک کے اندر کا زخمی اور لاش کو دیکھنے کے واسطے بہت بڑا جگرا چاہیے۔ ایسا بات مت پوچھو۔ بس یہ یاد کرو کہ وہ تمہارا مائی بہن کے عزت کے واسطے جل کر کولہ ہو گیا۔ بہت سارا جوان اس واسطے کٹ گیا اور سڑ گیا کہ وہ بھاگتا نہیں تھا۔ سب جوان کو مالم تھا کہ ہمارا نفری بہت تھوڑا ہے۔ بس اس واسطے وہ بھاگتا نہیں تھا۔ چار ٹینک سولہ ٹینک سے لڑ جاتا تھا۔ وہ سب

مسلمان مائی کا بیٹا تھا۔ تم بس ان کو یاد کرو اور مسلمان مائی کا بیٹا بن جاؤ۔

ہم بونز ڈوگراں دی سے لاش اور زخمی لے آیا اور دوسرے دن اس گاؤں سے دُور ہم کو پھر آگے جانے کا آڈر مل گیا۔ اُدھر سے زخمی کو لانا تھا۔ ہمارا نیب صوبیدار ساتھ تھا۔ اس کو مالم تھا ہم کدھر جائے گا۔ باقی ہر طرف بہت زور کا لڑائی تھا۔ توپ اور ٹینک ایسا فیر کرتا تھا کہ ساہ رکتا تھا۔ اوپر سے ہوائی جہاز ایسا ایسا راکٹ چھوڑتا تھا جیسا بجلی کڑکتا ہے اور گائے بھینس پر گرتا ہے پر یہ لڑائی اُدھر نہیں تھا جدھر ہم جا رہا تھا۔ ہم ایک جگہ پہنچ گیا۔ یاد رکھو۔ ہمارا دو ٹرک تھا جس پر ہم جا رہا تھا۔ داہنے ہاتھ چھوٹا گاؤں اور باہنے ہاتھ بہت سارا درخت تھا۔ ہر طرف کھیت اور کھڈ تھا۔ ہم کو ایک پلٹن کا میجر صاحب نے ادھر روک لیا۔ بولا آگے مت جاؤ۔ دشمن ایڈونس کرتا ہے۔ اپنا گاڑی آڑ میں کر دو۔ ہمارا نیب صوبیدار بولا ہم دوسری طرف سے آگے نکل جاتا ہے تم ہمارا ڈیوٹی میں گڑبڑ نہیں کرو۔ ہم زخمی جوان کو اٹھانے جاتا ہے پر میجر صاحب بولا۔ تم زخمی کو اٹھانے کے واسطے جائے گا پھر خود زخمی ہوگا تو تم کو کون اٹھائے گا۔

ہمارا نیب صوبیدار دل گُردے والا تھا۔ نہیں رکتا تھا۔ پر پیچھے سے اپنا توپ خانہ فیر کھول دیا۔ بہت سارا گولہ آیا اور ہمارے سر کے اُوپر سے گذر کر دُور آگے پھٹنے لگا۔ میجر صاحب بولا دیکھا۔ ہم اس واسطے توپ خانے کا فیر کرایا ہے کہ آگے دشمن ایڈونس کرتا ہے۔ پھر اُدھر سے بھی گولہ آنے لگا۔ ہم اپنا دونو ٹرک کھڈے میں کر دیا اور ہم سب فیلڈ ایمبولینس والا لیٹ گیا اور جیسا جیسا آڈر ملا گیا اُدھر چھپ گیا۔ اِدھر ہمارا ایک پلٹن جس کو ہم انفنٹری بولتا ہے کا دو کمپنی تھا۔ یہ دو کمپنی چار روز سے اُدھر لڑ رہا تھا۔ ہم کو مالم ہوا کہ دشمن چار روز میں ان پر بہت حملہ کیا پر یہ دو کمپنی کا جوان مار نہیں کھایا اور دشمن کو سیالکوٹ کا راستہ نہیں دیا۔ اب ان پر پھر حملہ ہوتا تھا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ جو گولہ دشمن کی طرف سے آتا ہے، وہ توپ کا گولہ ہے پر ہم نے غلط سمجھ لیا۔ وہ ٹینک کا گولہ تھا۔

ہم دُور سے دیکھ لیا۔ دشمن کا ٹینک آ رہا تھا اور بہت گولہ پھینک رہا تھا۔ بس تم غور کرو کہ آج دشمن ہمارا دو کمپنی کو رگڑ کر سیالکوٹ پہنچنے کے واسطے آیا تھا۔ ہم نے سوچ لیا کہ ہمارے جوان کے پاس ٹینک نہیں ہے۔ وہ دشمن کے ٹینک کو کیسا روک لے گا۔ پیچھے سے ہمارا توپ خانہ بہت گولہ پھینک رہا تھا۔ پر دشمن کا ٹینک مار نہیں کھاتا تھا۔ ہمارا پیادہ جوان ابھی کوئی فیر نہیں کرتا تھا۔ ہم سمجھ لیا کہ ہمارا جوان ٹینک سے ڈر کر بھاگ جائے گا۔

اُدھر دھوَاں غبار بہت ہو گیا۔ ہم کو دِکھ نہیں رہا تھا پر ہم اُدھر کو دیکھ لیا۔ دھوَاں غبار میں سے دشمن کا ٹینک آگے نکل آیا۔ وہ کھلا اٹھا تھا اور بہت اچھا ڈپلائے میں تھا۔ ہم نے گن لیا۔ آگے آگے سات ٹینک تھا، پیچھے کا ٹھیک مالم نہیں تھا۔ ان کا سب گولہ ہمارا دو کمپنی کی پوزیشن پر گرتا تھا۔ فاصلہ چھ سَو گز سمجھ لو، چاہے سات سو گز سمجھ لو۔ ادھر ہمارے ایک جوان نے آر آر کا گولہ مارا اور ہم نے ادھر دیکھ لیا۔ دشمن کا ایک ٹینک پھٹ گیا۔ یاد رکھو۔ آر آر گن ہوتا ہے جو ٹینک کو گولہ مارتا ہے۔ ہمارا جوان کا آر آر جیپ پر تھا۔ وہ پھُرتی سے جیپ کو دوسرا پوزیشن میں لے گیا۔ اسی ٹیمَ ایک اور جوان آر آر کا گولہ مار دیا اور دشمن کا ایک اور ٹینک پھٹ پڑا پھر اس ٹینک کا بھامڑ مچ گیا۔ پھر ہم نے دیکھ لیا۔ داہنے باہنے سے دشمن کا بے شمار ٹینک آ گیا۔ ہر طرف ٹینک ہی ٹینک تھا۔ سب کھلا ہوا تھا۔ ان کا بے شمار گولہ ہمارے آس پاس اور نیڑے تریڑے گرتا تھا اور ایسا زور سے پھٹتا تھا کہ ہمارا کلیجہ منہ کے راستے باہر آ جاتا تھا۔ نیچے کا ساہ نیچے، اوپر کا ساہ اوپر رہ جاتا تھا۔ ہم فیلڈ ایمبولینس کا جوان خالی ہاتھ تھا۔ ہم جا کر ٹینک کو ٹکر نہیں مار سکتا تھا پر دل بہت تڑفتا تھا کہ ہم بھی پلٹن کے جوان کا مدد کرے۔

یاد رکھو۔ ٹینک کو مارنے کے واسطے ایک اور ہتھیار ہوتا ہے جس کو ہم راکٹ لانچر بولتا ہے۔ شوُں کر کے گولہ چھوڑتا ہے اگر جوان شِست ٹھیک لیا تو ٹینک کے دو ٹوٹے کر دیتا ہے۔ یاد رکھو راکٹ لانچر ایک جوان کندھے پر رکھ کر فیر کرتا ہے۔ پھر ٹینک سے بھامڑ اٹھتا ہے اور وہ سڑ جاتا ہے۔ اب ہمارا جوان راکٹ لانچر کا بھی فیر کھول دیا۔ آر آر والا چار جیپ تھا اور وہ رڑے میدان میں ٹینک کے منہ کے آگے دوڑتا اور گولہ فیر کرتا تھا۔ پھر ہم نے دیکھ لیا۔ ہمارا جوان پوزیشن بدل بدل کر راکٹ مارتا تھا۔ ادھر دشمن کا ٹینک اور زیادہ کھِلر گیا۔ وہ اس کوشت میں تھا کہ ہمارا دو کمپنی کے مورچوں کو گھیرے میں لے لے۔ پر دشمن کا چھ ٹینک سڑ رہا تھا اور تین ٹیڑھا ہو کر رکا پڑا تھا۔ پر ان کا توپ اور مشین گن فیر کرتا تھا۔

دشمن کا ٹینک گھیرا کرنے کے واسطے کھِلر گیا تو ہمارا جوان بھی پوزیشن سے نکل کر کھِلر گیا۔ اب تم غور کرو۔ ٹینک ٹینک ہوتا ہے اور آدمی آدمی ہوتا ہے تم ٹینک کو دیکھ لو تو تم ڈر جائے گا کہ یہ لوہے کا قلعہ ہے جو دوڑتا ہے اور آگ پھینکتا ہے۔ پھر ایک آدمی کو دیکھو جو رڑے میدان میں کھڑا ہے۔ تم اس کے سر میں چھوٹا سا پتھر مارو تو وہ بے ہوش ہو جائے گا پر تم ٹینک کو توپ کا گولہ مارو تو ٹینک بے ہوش نہیں ہوتا۔ وہ ٹھیک سے چلتا رہتا ہے۔ یاد رکھو ٹینک کو صرف ٹینک مار گولہ توڑ سکتا ہے۔ اس کے اُوپر گرنیڈ کا ٹوکرا پھینک دو تو ٹینک کو کچھ نہیں ہو گا۔ ٹینک کا لوہے کا بہت موٹا چادر ہوتا ہے اور پیادہ جوان بس وردی میں ہوتا ہے۔ تم ہم کو بتاؤ کہ کپڑے کا وردی ڈال کر ایک آدمی لوہے کا موٹا چادر والا ٹینک کے برخلاف کیسا لڑائی کرے گا؟ بتاؤ تم بھینس کے ساتھ لڑائی کر سکتا ہے؟ نہیں کر سکتا۔ بھینس تمہارا آندریں نکال دے گا اب تم سمجھ لیا۔ اب غور کرو۔ اِدھر کپڑے کی وردی والا جوان تھا اور چار آر آر والا جیپ اور اتنا ہی راکٹ لانچر تھا۔ یاد رکھو۔ جیپ کے دوالے لوہے کا چادر نہیں ہوتا۔ بس یہ آر آر والا چار جیپ اور چار راکٹ لانچر بے شمار ٹینک سے لڑ رہا تھا اور ٹینک ان کو گھیرتا تھا۔ ہم سمجھ لیا کہ ہم سب آج مارا گیا۔ پر

پیادہ جوان نے کمال کر دیا۔ ہندوستان کا مائی ایسا بیٹا پیدا نہیں کر سکتا۔ تم
پاک فوج کے جوان کا قدر نہیں کر سکتا۔ اس واسطے کہ تم اس کو کربلا کے میدان میں
نہیں دیکھا۔ وہ صرف گولہ نہیں مارتا تھا۔ نعرہ حیدری بھی مارتا تھا۔ پھر ہم بھی
نعرہ حیدری مارنا شروع کر دیا اور ہمارا دل گُردہ ٹھیک ہو گیا۔

دشمن نے دوسرا کمال یہ کر دیا کہ دھواں غبار میں سے اس کا پورا پلیٹن نکل
آیا۔ وہ مارٹر فیر کرتا تھا اور مشین گن اور رفل بھی فیر کرتا تھا اور ٹینک رجمنٹ
کا مدد کے واسطے ایڈوانس کرتا تھا۔ ہم اس کا جے ہند کا بہت نعرہ سنا۔ ادھر
ہمارا جوان بھی مارٹر اور سب ہتھیار کا فیر کھول دیا۔ تم غور کر لو۔ ادھر ہمارا دو
کمپنی کا نفری جو ہم کو پیچھے مالم ہو گیا پورا دو سو نہیں تھا اور اُدھر غور کر لو۔ دشمن
کا تیس (۳۰) ٹینک سے اوپر اور ایک ہزار نفری کا پلیٹن تھا۔ علاقہ اتنا لمبا چوڑا
تھا کہ دو کمپنی نہیں سنبھال سکتا۔ پورا پلیٹن اتنا علاقہ سنبھال سکتا ہے۔ دشمن
داہنے باہنے سے گھیرا کرنے کا کوشش کرتا تھا ہم سمجھ لیا کہ دشمن ہم سب کو مار
لے گا پر ہم نے سوچ لیا کہ ہم مر جائے گا دشمن کا قیدی نہیں ہو گا۔

جدھر ہم تھا، اُدھر داہنے ہاتھ ایک مورچے میں ہمارا کمپنی کا چار جوان
تھا۔ ان کے پاس ایک لائٹ مشین گن اور تین رفل تھا۔ وہ بہت اچھا اور بہت
تیز فیر کرتا تھا۔ پر اللہ دشمن کو برباد کرے۔ دو گولے ان کے پیچھے پھٹ گیا اور
چاروں جوان سخت زخمی ہو گیا اور مورچے میں دہرا ہو گیا۔ جدھر ہم آڑ میں
تھا اُدھر ہمارے ساتھ فیلڈ ایمبولینس کا دو اور جوان تھا۔ ہم ان کو بولا جوانو
آج دل کا ارمان نکالو۔ اٹھو۔ ہتھیار پکڑو۔ اللہ بیلی۔ ہم تین جوان دوڑ کر
مورچے تک گیا اور چار زخمی جوان کا ہتھیار لے لیا۔ ہمارا ڈیوٹی یہ تھا کہ زخمی
جوان کا خیال کرتا پر ہم اتنا جوش میں آ گیا کہ پرواہ نہ کیا کہ وہ چار جوان زندہ ہے
یا مر گیا ہے۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ آج کوئی بھی زندہ
نہیں رہے گا۔ بس دل کا بھڑاس نکالو۔ ہمارے ساتھ ایک لیس نیک تھا۔

وہ مشین گن لے لیا اور ہم دو جوان رفل لے لیا۔ لیس نیک نے داہنے دیکھا
اور بولا۔ جوڑی دارو۔ دشمن داہنے کو آگے نکلتا ہے۔ ہم فیلڈ ایمبولینس کا تین
جوان اللہ کو یاد کیا اور اللہ کے رسول ﷺ کو پکارا اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ ہمارا
عزت تمہارے ہاتھ ہے۔

داہنے طرف دشمن کا دو ٹینک اور بہت سارا ہری وردی والا پیادہ جوان
ایڈوانس کرتا اور پوزیشن لیتا تھا۔ ہم دشمن کو پہلی بار اتنا نیڑے سے دیکھا۔ ہم اپنے
جوڑی دار کو بولا۔ جوانو۔ اٹھو۔ ہم کافر سے ہتھو ہتھ لڑے گا۔ پر لیس نیک بولا۔
جانگلی، آڑ سے مت نکلو۔ دشمن کا مشین گن بھون دے گا۔ ہم اس کا بات مان
لیا۔ ہم مورچے سے ایمونیشن لے کر بہت فیر کیا۔ ہم شست باندھ کر گولی چلاتا
تھا۔ آگے اللہ مالم ہے کہ کسی کو لگتا تھا کہ نہیں پر ہم اتنا ضرور دیکھا کہ جو دشمن کا جوان
ہلتا نظر آتا تھا وہ ہمارا گولی کے بعد ہلتا نظر نہیں آتا تھا۔

ہمارا مورچے کے بالکل نیڑے دشمن کا ایک گولہ پھٹا۔ ہم کو ایک کا تین تین
نظر آنے لگا۔ ہم کو مالم نہیں تھا کہ جو گولہ نیڑے پھٹتا ہے، وہ اتنا زور سے پھٹتا
ہے۔ ہم کو لیس نیک نے بولا۔ جگرا قابو کرو۔ ڈرو مت۔ ہم بہت مشکل سے
جگرا قابو کر لیا۔ پھر ہم نہیں ڈرا۔ پلیٹن کا ایک جوان ہم سے بیس گز دور آڑ میں
تھا وہ زور سے بولا۔ کون ہے تم؟ یہ پوزیشن چھوڑو۔ آڑ بدلی کرو۔ تم کو دشمن
نے دیکھ لیا۔ ابھی گولہ آتا ہے۔ پھر ہم فیلڈ ایمبولینس کا تینوں جوان اُدھر سے
ہٹ گیا اور ایک دوسرے سے دُور دُور ہو گیا۔ لڑائی بڑے زور کا تھا۔ دھواں
غبار گھنا تھا اور بس گولہ ہی گولہ پھٹتا تھا۔ ہم سوچ لیا او تم بھی غور کرو۔ انسان
زور کا لڑائی سے زندہ نہیں نکل سکتا۔

پلیٹن کا ایک جوان تیزی سے دوڑ لگا کر آیا اور ہمارے پاس ہیلنگ ہو گیا۔
اس کے پاس راکٹ لانچر تھا۔ اس نے داہنے ہاتھ راکٹ فیر کر دیا اور دشمن کا
جو ٹینک داہنے سے ہم کو گھیرنے کا کوشش کرتا تھا وہ پھٹ گیا پر بڑا ظلم ہو گیا۔

یہ جوان پوزیشن بدلی کرنے کے واسطے اٹھا تو ایک گولہ بہت نیڑے پھٹا۔ یہ جوان گر پڑا۔ ہم دیکھ لیا۔ اس کا ایک ٹانگ گوڈے سے صاف کٹ کر الگ ہو گیا۔ ہم رفل پھینک کر اس کے پاس پہنچا اور اپنے جھولے سے پیڈ پٹی نکال کر اس کا کٹے ہوئے ٹانگ پر باندھ دیا۔ پھر ہم اس کو بولا کہ اپنا فیلڈ پٹی دے دو۔ ہم وہ بھی باندھ دیتا ہے پر وہ جوان بہت غصے سے بولا۔ ہمارا پرواہ مت کرو۔ ہمارا لانچر اٹھاؤ۔ اُدھر دیکھو دوسرا ٹینک آگے جاتا ہے۔

اس نے اٹھنے کا کوشش کیا پر تم غور کرو جس کا ایک ٹانگ صاف کٹ جاتا ہے وہ کیسے اٹھ سکتا ہے۔ ہم نے بولا۔ تم راکٹ کو گولی مارو۔ ہم پہلے تم کو سنبھالے گا۔ اس نے ہم کو بہت گندہ گالی دیا اور بولا کہ ہم مرتا ہے تو فکر نہیں۔ دشمن کا ٹینک آگے نہیں جائے گا۔

ہم راکٹ لانچر اٹھا لیا۔ اس میں ایک راکٹ لوڈ تھا۔ زخمی جوان بولا۔ تم چلاؤ۔ ہم اٹھ نہیں سکتا۔ ہم بولا۔ ہم نہیں چلا سکتا۔ ہم فیلڈ ایمبولینس کا جوان ہے۔ زخمی جوان نے ہم کو اپنے نیڑے نیلنگ بیٹھنے کو بولا تو ہم نیلنگ بیٹھ گیا۔ وہ جوان لانچر ہمارے کندھے پر ٹھیک سے رکھ دیا اور بولا۔ اس میں راکٹ ہے۔ ابھی ٹریگر سے انگلی باہر رکھو اور اس میں شست لو۔ جلدی کرو گرائیں ٹینک آگے جاتا ہے۔ ہم نے دیکھ لیا۔ ٹینک بہت دُور نہیں تھا۔ زخمی جوان لیٹے لیٹے لانچر کا فاصلہ ٹھیک کیا اور بولا۔ انگلی ٹریگر پر رکھو۔ پکڑ مضبوط، ٹینک کا سنٹر شست میں دیکھو، بسم اللہ پڑھو اور انگلی دبا دو۔ وہ جیسا بولا، ہم ویسا کیا اور ہم بڑی زور سے بسم اللہ شریف پڑھا اور انگلی دبا دیا۔ ہم کو مالم نہیں کہ راکٹ کدھر گیا پر زخمی جوان زور سے بولا۔ مار دیا۔ مار دیا۔ علیؓ علیؓ۔ مار دیا۔ پھر ہم اُدھر دیکھا۔ وہ ٹینک جس کا ہم شست لیا تھا، رُک گیا۔ پھر اس میں سے دُھواں نکلا۔ پھر ٹینک ایسا زور سے پھٹا کہ ہمارا دل گُردہ ہل گیا۔ ہم کو اس واسطے بہت خوشی ہوا کہ ہم اپنے ہاتھ سے سن سنتالی کا بدلہ لے لیا۔

ہمارے پیچھے بہت شور ہوا۔ کوئی جوان زور سے بولا۔ ٹینک آگیا۔ ٹینک آگیا۔ ہم ڈر گیا کہ دشمن کا ٹینک پیچھے سے آگیا۔ پر مالم ہو گیا کہ وہ ہمارا ٹینک تھا جو پیادہ کمپنی کا مدد کے واسطے پہنچ گیا تھا۔ ہمارا ٹینک کھل گیا اور دشمن کا ایسا کونڈا کیا کہ نہ اس کا انفنٹری پلیٹن رہا نہ اس کا ٹینک رہا اور لڑائی ختم ہو گیا۔ یہ لڑائی پورا ایک میل کے علاقے میں تھا۔ ہم کو آڈر مل گیا کہ جدھر جا رہا تھا اُدھر مت جاؤ اور اس دو کمپنی کا زخمی اور شہید کو پیچھے لے جاؤ۔ ہم سمجھ لیا تھا کہ دو سو میں ایک سو جوان ضرور شہید ہو گا اور باقی سب زخمی ہو گا پر تم میرے اللہ پر یقین کرو۔ اُدھر کُل سات شہید اور اٹھارہ زخمی تھا اور ہم تم کو دشمن کا نقصان بتائے گا تو تم بولے گا کہ ہم جھوٹ مارتا ہے اور ہم تم کو یہ بتائے گا کہ دشمن کا کتنا ٹینک تباہ ہو گیا تو تم بولے گا کہ ہم پھر جھوٹ مارتا ہے۔ تم نہیں مانتا تو بس ایک ٹینک کا ضرور مان جاؤ جس کو ہم خود تباہ کیا۔

ہم کو اس جوان کا غم تھا جس کا ٹانگ گوڈے سے صاف کٹ گیا تھا۔ اس کا سارا خون نکل گیا تو اس کا رنگ، لاش کی مافق سفید ہو گیا۔ ہم سمجھ لیا کہ یہ جوان شہید ہو جائے گا۔ ہم جب اس کو سٹیچر پر ڈال کر ٹرک میں لوڈ کیا، وہ بے ہوش تھا۔ ہم بہت پھرتی سے سب زخمی اور شہید کو ٹرک میں لوڈ کیا اور چل پڑا۔ محاذ کے پیچھے بڑا چوڑا اکھڈہ تھا۔ اس کے اندر ہمارا فیلڈ ہسپتال تھا اُوپر چھولداری، چھولداری پر جال اور جال کے اوپر جھاڑی اور ڈالی ڈال دیا تھا۔ ہم زخمی کو اِدھر بڑا آرام سے اتارا۔ صرف ایک جوان تھا جس کا ٹانگ کٹا تھا۔ باقی صرف زخمی تھا۔ ٹانگ بازو سلامت تھا۔ ہم سب سے پہلے ٹانگ والے کا سٹیچر میڈیکل آفیسر کے آگے رکھ دیا۔ میڈیکل آفیسر دیکھا تو گھبرا گیا۔ بولا اوہ۔ اوہ تمام خون چلا گیا فوراً خون لگا دو۔ اُدھر لے جاؤ۔

اُدھر دو درخت کے نیچے تازہ خون دینے کا بندوبست بہت اچھا تھا۔ ہم پھرتی سے سٹیچر اُدھر لے گیا۔ نرسنگ اردلی اور دوسرا میڈیکل آفیسر پھرتی سے

اس کو خون کا نالی لگا دیا اور کاٹے ہوئے ٹانگ پر صحیح پٹی باندھ دیا۔ سٹیچر زمین پر رکھا تھا۔ یہ ہسپتال پکّا نہیں تھا۔ اُدھر خون دے کر زخمی کو چھاؤنی کے ہسپتال میں بھیجتا تھا۔ پھر وہ زندہ رہ جاتا تھا۔

ہم اس جوان کے پاس بیٹھ گیا اور اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بالکل لڑکا تھا۔ ابھی پورا جوان نہیں ہوا تھا۔ ابھی بہت تھوڑا مونچھ آیا تھا۔ ہم نے اُدھر سوچا۔ یا مولا علیؑ۔ یہ بچہ ہے اور اس کا ٹانگ کٹ گیا ہے۔ اب یہ سارا عمر کیا کرے گا؟ اس کا کھیلنے دوڑنے کا عمر ہے۔ اس کا مائی بہن کیا سوچے گا۔ پر ہم نے سوچ لیا کہ اس لڑکے نے قوم کے واسطے سارا عمر کا کھیل دوڑ قربان کر دیا۔ اس کا مائی باپ افسوس نہیں کرے گا پر ہم نے یہ بھی سوچ لیا کہ جس قوم کے واسطے اس نے قربانی دے دیا، اس قوم کو کون بتائے گا کہ اس نے قربانی دیا۔ ہم نے سوچ لیا کہ اس کو کوئی اپنی لڑکی کا رشتہ نہیں دے گا۔ بولے گا۔ یہ تو لنگڑا ہے۔ کیا کام کرے گا۔ ہم کو رانم تھا۔ یہ لڑکا پڑھا ہوا نہیں ہے۔ یہ دفتر میں کیسے کام کرے گا۔ اس کو کوئی چپڑاسی کا نوکری بھی نہیں دے گا۔ ہم کو بہت غم ہوا۔ پر ہم نے اپنے دل کو تسلی دے لیا کہ ہمارا قوم غیرت والا ہے۔ وہ اس لڑکے کو گلے لگائے گا اور بولے گا کہ اس لڑکے نے ہمارا مائی بہن کا عزت کے واسطے سارا عمر برباد کر دیا۔

تم بھی غور کرو۔ ہم اُدھر بہت غور کیا۔ ہم بہت بات سوچا پر ہمارا سارا بات بے فضول تھا۔ پر ہم بہت غور کر لیا۔

جنگ ختم ہو گیا۔ پر ہم فوج میں نہیں رہ سکا۔ اس واسطے کہ آخری روز سیالکوٹ کے محاذ پر ہم زخمی کو اٹھا رہا تھا۔ ایک گولہ ہمارے نیڑے پھٹا۔ ہم صاف بچ گیا۔ پر ہمارا ایک آنکھ کا نظر خراب ہو گیا اور بارود اندر جانے سے ہمارا پھیپھڑا بھی خراب ہو گیا۔ اُدھر ہمارا بہت علاج ہوا پر کھانسی ٹھیک نہیں ہوا۔ ہم کو دم چڑھ جاتا تھا۔ جب فوج بارک میں آ گیا تو ہم کو میڈیکل پنشن مل گیا۔

تم غور کرو۔ ہم اب جو کہانی سنائے گا، وہ سٹوری نہیں ہے سٹوری جھوٹا ہوتا ہے کہانی سولہ آنے سچا ہوتا ہے۔ ہم گھر چلا گیا۔ ہمارے دل میں اس لڑکے کا بہت خیال آتا تھا۔ ہم کو کدھر نوکری نہ ملا تو ہم سوچتا تھا کہ جس کا ٹانگ کٹ گیا تھا، اس کو نوکری کدھر ملے گا۔

ایک سال گذر گیا۔ ہم کو اپنے ماموں نے کراچی سے خط لکھا کہ ادھر آ جاؤ۔ نوکری مل جائے گا۔ ہم کراچی چلا گیا۔ دو تین روز پیچھے ہم اپنے ماموں کے ساتھ سڑک پر بس کے واسطے کھڑا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی پہیوں والا ریڑھی پر سبزی ترکاری بیچتا تھا۔ کراچی میں لوگ سائیکل کے چار پہیے لگا کر چھوٹا سا ریڑھی بناتے ہیں اور گلی گلی چیزیں بیچتے ہیں۔ وہ آدمی ریڑھی کو دھکیل کر ادھر لا رہا تھا جدھر ہم کھڑا تھا۔ پر ہم نے دیکھ لیا کہ وہ آدمی ٹھیک سے نہیں چلتا تھا۔ وہ ایک قدم ٹھیک اٹھاتا ہے پر دوسرا قدم پر اچھلتا تھا۔ ہم اپنے ماموں کو دکھایا کہ دیکھو۔ وہ آدمی کیسا چلتا ہے۔ ایک قدم چلتا ہے دوسرا قدم اچھلتا ہے۔

جب وہ آدمی ہمارے پاس آ کر ریڑھی کھڑا کیا تو ہم دیکھا کہ اس کا دوسرا ٹانگ نہیں تھا۔ گوڈے سے کاٹا ہوا تھا۔ اس نے ریڑھی کے ساتھ نیچے کر کے لکڑی کا پھٹی لگایا ہوا تھا اور پھٹی پر کپڑے کا گدی بنایا ہوا تھا۔ گدی پر اس نے کاٹا ہوا ٹانگ کا گوڈا رکھا ہوا تھا اس واسطے وہ ایک قدم اچھلتا اور ایک قدم چلتا تھا۔ ہم اس کا کاٹا ہوا ٹانگ اور ٹانگ کو سہارا دینے کا بندوبست دیکھتا رہا۔ پر اس کا ابھی شکل نہیں دیکھا۔ اس نے زور سے آواز دیا — بینگن، ٹماٹر، شلغم۔ تو ہم اس کا شکل دیکھا۔ تم میرے اللہ پر یقین کرو۔ ہمارے دل کو بہت زور کا چوٹ لگا۔ ہم اس کا شکل کو پہچان لیا۔ یہ وہی نوجوان لڑکا تھا جس نے دشمن کے ٹینک رجمنٹ کو روکا تھا۔ ہم اگلے جہان بھی گواہی دے گا کہ اس کا ٹانگ میرے سامنے کٹ گیا تھا اور ہم اس کو پٹی باندھا تو وہ غصے میں بولا تھا کہ ہم مرتا ہے

تو پرواہ نہیں دشمن کا ٹینک آگے نہ جائے۔

ہم اس کو ٹھیک سے پہچان لیا۔ پر ہم نے اس کو اپنا شکل نہیں دکھایا۔ ہم کو شرم آگیا۔ اس واسطے کہ ہم بھی کربلا کے میدان میں گیا تھا پر ٹھیک سے واپس آگیا۔ پر وہ میدان سے ٹھیک سے واپس نہیں آیا۔ وہ بہت بڑا قربانی دیا۔ ہم کیا دیا؟ ہم حیران ہوتا ہے کہ فوج کے زخمی کو لکڑی کی ٹانگ مفت ملتا ہے۔ اس کو کیوں نہیں ملا۔ پر ہم نے سوچ لیا کہ لکڑی کا ٹانگ ضرور ہی ملا ہوگا۔ یہ جوان اس کو پسند نہیں کرتا اور اس کے ساتھ اتنی دور کا پھیری نہیں لگا سکتا۔

خیر وہ اس کا مرضی ہے لکڑی کا ٹانگ لگاتا ہے کہ نہیں لگاتا ہے۔ پر ہم یہ سوچتا ہے کہ لوگوں کے بھرے ہوئے کراچی شہر میں صرف ہم ایک آدمی نے اس کو پہچان لیا کہ وہ قوم کا غازی ہے اور کوئی آدمی اس کو نہیں پہچانتا۔

اُدھر سے کسی بچے کا زور سے آواز آیا۔ او لنگڑے سبزی والے۔ اس نے پھرتی سے ریڑھی گھمایا اور اُدھر کو ریڑھی لے گیا۔ ہم کو بہت غم ہوتا ہے کہ جس نے سیالکوٹ کے میدان میں یا علیؓ کا نعرہ مار کر ٹانگ کٹوا لیا وہ آج بینگن ٹماٹر کا نعرہ مارتا ہے اور لوگ اس کو لنگڑا سبزی والا بولتا ہے ہم کراچی والوں کو اور سارے پاکستان کو سناتا ہے کہ اگر یہ غازی لنگڑا نہ ہو جاتا تو سارا پاکستان لنگڑا ہو جاتا۔

تم غور کرو اور ہم کو بتاؤ کہ تم اس کو کیوں نہیں پہچانتا؟

سپاہی محمد اکرم

جنگِ ستمبر —

شب و روز کے آئینے میں

- سترہ دنوں کی مکمل ڈائری
- پاک فضائیہ کے لڑاکا بمبار طیاروں کی کُل تعداد ایک سو پینتیس تھی جن میں سے آل انڈیا ریڈیو نے چار سو بہتر مار گرائے۔

بھارت کے حکمرانوں نے پاکستان کو فتح کرنے کے لیے پہلا حملہ آزاد کشمیر پر کیا۔ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں امریکہ، برطانیہ اور روس کو چین کا بھوت دکھا کر جو پہاڑی ڈویژن تیار کرائے تھے وہ ہمالیہ کے پہاڑوں میں نہیں بلکہ کشمیر کی پہاڑیوں میں لڑانے کے لیے تیار کرائے تھے۔

۲۵ اگست ۱۹۶۵ء کی رات بھارتی توپ خانے نے آزاد کشمیر کے علاقے بھارت گلی اور درۂ حاجی پیر (ٹیٹوال سیکٹر) پر شدید گولہ باری کی۔ یہ گولہ باری ایک ہفتے سے ہو رہی تھی لیکن ۲۵ اگست کے آخری ۱۲ گھنٹوں میں یہ گولہ باری اس قدر شدید کر دی گئی کہ آزاد کشمیر فوج کے اندازے کے مطابق صرف بارہ گھنٹوں میں بیس ہزار گولے فائر کیے گئے۔

۲۶ اگست ۱۹۶۵ء کو انڈین آرمی کے پورے بریگیڈ نے آزاد کشمیر کی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ ہراول میں پیرا بٹالین تھی۔ آزاد کشمیر کی صرف ایک کمپنی جس کی نفری ایک سو کے قریب تھی، مورچہ بند تھی۔ ان ایک سو جوانوں نے ایک بھی گولی فائر نہ کی۔ جب دشمن پچاس گز تک آ گیا تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آزاد کشمیر کے مجاہدوں نے ان پر گولیوں اور گرنیڈوں کا مینہ برسا دیا۔

۲۷ اگست کو بھارتیوں نے سکیم بدل کر حملہ کیا۔ حملہ رات کے ایک بجے کیا گیا مگر سامنے سے نہیں، دائیں اور بائیں سے جس سے آزاد کشمیر کی چوکی بھارت گلی عقب سے کٹ گئی۔ معرکہ خونریز تھا۔ اُدھر پورا بریگیڈ جسے ڈویژن کے توپخانے کی امدادی گولہ باری حاصل تھی، اِدھر صرف ایک سو جوان جن میں دو کل کے حملے میں شہید اور پانچ شدید زخمی ہو چکے تھے۔ وہ پھر بھی لڑے مگر بریگیڈ کے سامنے جم نہ سکے۔ ان کے ۳۶ جوان شہید ہو گئے۔ ایک پلاٹون کی نفری پچیس تھی جس

سے بائیس جوان شہید ہو گئے تھے۔

درہ حاجی پیر اور بیڈوری کی چوکیوں پر بھی انڈین آرمی نے بریگیڈ کے حملے اور ڈویژن کے توپخانے کی آٹھ دنوں کی گولہ باری سے قبضہ کر لیا۔ ہر چوکی میں آزاد کشمیر کی نفری ایک ایک سو جوان تھی جنہوں نے چار دن تک مقابلہ کیا تھا مگر ۲۸ اگست کے روز انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ شدید گولہ باری سے کوئی مورچہ سلامت نہیں رہا تھا۔

بھارتیوں نے یہ تو نہ سوچا کہ انہوں نے کتنی زیادہ قوت سے کتنی تھوڑی سی نفری کو شکست دی ہے اور یہ حرفِ آغاز ہے مگر انہوں نے اسے حرفِ آخر سمجھ لیا اور "عظیم فتح" کے نشے سے سرشار پاکستان کی سرحد کے اندر گولہ باری کر دی جس کا نشانہ ایک معصوم سے سرحدی گاؤں اعوان شریف ضلع گجرات کے بے ضرر دیہاتی بنے۔ اگر بھارت کی یہ کارروائیاں عام سی قسم کی سرحدی جھڑپیں ہوتیں تو مفاہمت کی بات کی جا سکتی تھی لیکن یہ بھرپور حملہ پاکستان کی غیرت کے لیے چیلنج تھا ـــ درہ حاجی پیر، بھارت گلی، ٹیٹوال، کارگل اور بیڈوری کے بعد دشمن نے ۲۸ اگست کو ایک اور چوکی کھوڑا نکا پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ پسپا کیا گیا تو دشمن ٹولی پیر اور راولاکوٹ کی طرف بڑھا مگر اب پاک فوج میدان میں آ گئی تھی کیونکہ بھارتیوں کے حملے سیدھے پاکستان پر آ رہے تھے۔

میجر جنرل اختر حسین ملک (جنہیں مرحوم لکھتے قلم لرزتا ہے) نے دشمن کو اور آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے بلوچ اور پنجاب رجمنٹیں بھیج دی تھیں جنہیں دیکھ کر انڈین آرمی کو کمک اور مزید توپیں دے دی گئیں۔

یہ تھا وہ محاذ جسے شاستری نے اپنی مرضی کا محاذ کہا تھا اور جسے اپنے فوجی مشیروں کے کہنے کے مطابق اس نے پہاڑی ڈویژنوں کے لیے بہترین محاذ سمجھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پاکستان کے پاس کوئی پہاڑی ڈویژن نہیں

ہے۔

۳۰/اگست کو بھارتیوں نے پونچھ کی شمالی پہاڑیوں میں گولہ باری شروع کر دی جس کی زد میں چاند ٹیکری بھی تھی لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج کی رات ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے اور پاکستانی انہیں ان کی مرضی کے محاذ پر نہیں بلکہ اپنی مرضی کے میدان میں لڑائیں گے۔ بھارتی یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ وہ پونچھ کے شمالی علاقے پر قابض ہو کر باغ کی وادی پر قبضہ کریں گے جہاں سے وہ آزاد کشمیر کو آسانی سے لے لیں گے۔

۳۰/۳۱ اگست کی رات پاک فوج کے بریگیڈیئر عظمت حیات اور بریگیڈیئر ظفر علی خان کے بریگیڈ گجرات سے آگے نکل گئے تھے۔ ان کے ساتھ آزاد کشمیر کے بریگیڈیئر عبدالحمید خان کا بریگیڈ تھا۔ بریگیڈیئر امجد علی چوہدری کے توپ خانے نے رات کو ہی سرحد پر گولہ باری شروع کر دی تھی جس نے چھمب کے سیمنٹ اور لوہے کے مضبوط بنکروں اور دفاعی لائن کی مضبوطی کو ہلا ڈالا تھا۔ سحر کی تاریکی میں ہمارے تینوں بریگیڈ برق رفتار پیشقدمی کر گئے۔

یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کو تاریخِ پاکستان کے ایک درخشندہ باب کی سرخی لکھ دی گئی۔ چھمب کا سورج ابھر رہا تھا۔ انڈین آرمی کے غرور اور بھارتی حکمرانوں کی نخوت اور رعونت کا سورج پاکستانی توپخانے کی گولہ باری کی سیاہ گھٹاؤں، ٹینکوں اور پیادہ جوانوں کی یلغار کی گرد میں غروب ہو رہا تھا۔ دن کے ساڑھے دس بجے تک بھارتیوں کی قلعہ بندیاں — ملگوتیاں، چک پنڈت، مناور، جھنڈا، پھورا اور برسالہ — غازیوں کے قدموں تلے روندی جا چکی تھیں۔ بورے جال جو بھارتیوں کا مضبوط مورچہ بلکہ قلعہ تھا، خالی ہو رہا تھا کیونکہ بھارت کے دفاعی دستوں کو محاصرے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ بھارت کے فرانسیسی ٹینک ایکس، ہمارے دستوں کو روکنے کی سر توڑ کوشش کرتے رہے مگر پاکستانیوں نے رُخ بدل کر دیوا پر حملہ کر دیا پھر دیوا بھی ہاتھ میں آ گیا۔

فضا میں ایک واویلا سنائی دیا۔ یہ انڈین آرمی کے ایک شکست خوردہ کمانڈر

کی دہائی تھی جو وہ ہائی کمان کو دے رہا تھا۔ وہ وائرلیس پر کہہ رہا تھا "وسکی بھیجو۔ وسکی بھیجو —" شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے "وسکی" آ گئی۔ یہ بوتلوں کی شکل میں نہیں بلکہ یہ چار ویمپائر لڑاکا بمبار طیارے تھے جو اپنی بھاگتی ہوئی فوج کے قدم جمانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ذرا اس فوج کا اندازہ کیجیے جو تین بریگیڈوں کے آگے ٹینک، توپیں، مارٹر اور مشین گنیں، پٹرول اور ہر طرح کے ایمونیشن کے ٹرکوں اور لاشوں کے ڈھیر پھینکتی بھاگی چلی جا رہی تھی — انڈین آرمی کا نمبر ۱۰ ماؤنٹین (پہاڑی ڈویژن) ساتھ ۱۹۱، انڈین بریگیڈ گروپ اور ۹۳، انڈین انفنٹری بریگیڈ بھی تھا۔

آسمان میں بھارت کے چار ویمپائروں کی حکمرانی تھی۔ انہوں نے نہایت اطمینان سے پاکستانی دستوں پر آگ اگلنی شروع کر دی۔ ہمارے زمینی توپچیوں نے مقابلہ کیا مگر طیارے کا مقابلہ طیارہ ہی کر سکتا ہے۔

پاک فضائیہ کے دو شاہباز — سکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی شہید اور فلائٹ لیفٹیننٹ امتیاز بھٹی گجرات پر اُڑ رہے تھے۔ انہیں ایک آواز سنائی دی "دشمن ہمارے مورچوں پر فائرنگ کر رہا ہے۔ مقابلہ کرو" — دونوں شاہباز تاریخِ پاکستان کا پہلا فضائی معرکہ لڑنے کے لیے چھمب کے آسمان میں پہنچ گئے مگر اب وہاں چار ویمپائر ہی نہیں دو کینبرا بھی اڑ رہے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دو سیبر طیارے چار ویمپائروں اور دو کینبرا جیسے برتر اور تیز تر طیاروں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ مگر شاہبازوں نے جان کی بازی لگا دی۔ پاک فوج دیکھ رہی تھی۔ آسمان میں مشین گنوں کے دھماکے سنائی دینے لگے اور ویمپائر یکے بعد دیگرے بموں کی طرح پھٹنے لگے۔

چاروں ویمپائروں کے پرخچے چھمب کی فضا میں بکھر کر زمین پر دُور دُور جا گرے — کینبرا طیارے اپنے چار ساتھیوں کا حشر دیکھ کر کھسک گئے تھے — "وسکی کی بوتل" چکنا چور ہو گئی — بھارت کا فضائی قوت کا غرور بھی چکنا چور ہو گیا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ بھارتی بھاگ بھی رہے تھے، سامان بھی پھینکے چلے جا رہے تھے لیکن راستے میں بارودی سرنگیں بھی بچھاتے جا رہے تھے۔ ان کا توپخانہ پاکستانیوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ امریکہ کا ایمونیشن بیدردی سے پھونکا جا رہا تھا۔ مگر اس کے پیادہ اور بکتر بند دستوں کا مورال اور جذبہ اس حد تک ٹوٹ چکا تھا کہ پاکستانی توپخانے کا کرنل بابر او پی ڈیوٹی کے لیے ہیلی کاپٹر پر اُڑ رہا تھا۔ اسے ایک جگہ پچپن بھارتی سپاہی پوزیشن میں نظر آئے۔ اس نے ہیلی کاپٹر اتار کر تن تنہا انہیں للکارا اور سارے سپاہیوں اور عہدیداروں نے نہایت برخورداری سے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ نمبر ۵ سکھ لائٹ انفنٹری کے سُورمے تھے۔

۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز ہمارے فاتح دستوں کے راستے میں دریائے توی حائل ہوگیا۔ دشمن کو قدرے اطمینان نصیب ہوا کہ دریائے توی نے پاکستانیوں کو روک لیا ہے۔ انہوں نے دریا کے ادھر والے کنارے پر توپخانے کی گولہ باری سے آگ کی دیوار کھڑی کر دی۔

آج پاک فوج کے اس ڈویژن کی کمان جنرل محمد یحییٰ خان (سابق صدرِ پاکستان) نے سنبھال لی۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے انہوں نے بریگیڈیئر عظمت حیات کو حکم دیا کہ دریائے توی کو ہر حالت میں عبور کر جائیں۔

یہ مرحلہ آسان نہ تھا۔ ایک دریا، دوسرے دشمن کی گولہ باری۔ مگر شام ساڑھے سات بجے غازیوں نے معجزہ کر دکھایا جس میں بریگیڈیئر امجد علی چوہدری کے توپخانے کا کمال شامل تھا۔ دریا عبور کر لیا گیا۔ پیادہ دستے اور ٹینک بھی دریا پھلانگ گئے۔

دشمن اور زیادہ گھبرا گیا۔ قدرت نے انہیں اتنی بڑی آبی رکاوٹ مہیا کی تھی، وہ بھی پاکستانیوں کو نہ روک سکی۔ بارودی سرنگیں، توپوں اور ٹینکوں کی گولہ باری کی مسلسل بارش بھی انہیں نہ روک سکی۔ بھارتیوں کے لیے پاکستانی

دہشت بن گئے اور مقام پہ مقام فتح کرتے چلے گئے۔ آج بھارت کی فضائی قوت کہیں نظر نہیں آئی۔

پاک فضائیہ کو بری فوج کی مدد کے لیے بلایا گیا۔ سکواڈرن لیڈر محمد محمود عالم ایک فارمیشن لے کر گئے اور دشمن کی کئی توپوں اور گاڑیوں کو تباہ کر آئے جس سے پیشقدمی اور آسان ہوگئی۔

۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز بھی پیشقدمی کی رفتار میں فرق نہیں آیا۔ بریگیڈیئر عظمت حیات اور بریگیڈیئر عبدالحمید خان نے دشمن پر دباؤ برقرار رکھا تاکہ وہ دم نہ لے سکے۔

انڈین ایئر فورس کے چھ نیٹ طیارے اپنی بھاگتی اور دم توڑتی فوج کو مدد دینے کے لیے آئے۔ پیشتر اس کے کہ وہ ہمارے دستوں پر جھپٹا مارتے، پاک فضائیہ کے دو سٹار فائٹر (ایف۔ ۱۰۴) پہنچ گئے۔ چھ کے چھ نیٹ فارمیشن توڑ کر آسمان میں بکھر گئے۔ کوئی غوطہ لگا گیا، کوئی اوپر چلا گیا ہے اور جس کا جدھر منہ آیا، بھاگ اُٹھا۔ مگر ایک کو اپنے اڈے کا رُخ ہی یاد نہ رہا نہ یہ ہوش کہ ہندوستان کدھر اور پاکستان کدھر ہے۔ ہمارے شاہبازوں نے اسے گھیرے میں لے لیا اور اسے ہانک کر پسرور لا اتارا۔ اس کا نمبر ۱۰۸۳ E۱ تھا اور اسے سکواڈرن لیڈر برج پال سنگھ اڑا رہا تھا۔ اسے پاک فوج کے ایک افسر نے اپنی حراست میں لے لیا۔

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز جوڑیاں دو ہاتھ دُور رہ گیا تھا۔ دشمن نے ٹرڈی کے بلند علاقے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا انتظام کر لیا۔ وہاں سے توپخانے اور ٹینکوں کا فائر اتنی شدت سے آنے لگا کہ اپنا توپخانہ پیچھے ہٹ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دشمن یہاں سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ ہمارے دستوں کے سامنے رکاوٹیں بہت تھیں۔ چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں اور دشمن بلندی پر جہاں سے وہ ہر قسم کا چھوٹا بڑا فائر کر کے پاکستانیوں کو جنگ کے کڑے امتحان میں ڈال

رہا تھا۔

ٹروٹی کا یہ معرکہ خونریز معرکہ تھا۔ اپنے ٹینک پوزیشنیں بدل بدل کر آگ اگل رہے تھے، ہٹ بھی ہو رہے تھے، جوان شہید اور زخمی بھی ہو رہے تھے اور معرکے کی شدت اور خونریزی بڑھتی جا رہی تھی۔

شام کے پانچ بج گئے۔ اپنی دو پلٹنیں دشمن کے مورچوں کو کمزور کر کے اس کے پہلو میں پہنچ گئیں۔ دشمن اکھڑتا نظر آ رہا تھا۔ پاک فضائیہ کی مدد لی گئی تاکہ ٹروٹی کے مورچوں کو کمک نہ مل سکے۔ فضائیہ نے یکے بعد دیگرے تین پروازیں بھیجیں۔ شاہبازوں نے زمینی گنوں کی زد میں آ کر بھی ایک سڑک پر دشمن کے کئی ٹینک اور آگے کئی توپیں اور گاڑیاں تباہ کر دیں۔ یہ ٹینک ٹروٹی کے مورچے کو مضبوط کرنے کے لیے آ رہے تھے، مگر شاہبازوں کے راکٹوں کا شکار ہو گئے۔ ان کے شعلے اور گولہ بارود کے ذخیروں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر ٹروٹی کے مورچوں پر دہشت طاری ہو گئی۔

دشمن نے رات کے وقت دو جوابی حملے کئے لیکن بے شمار قیدی اور اسلحہ بارود پھینک کر پسپا ہو گیا۔

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء اتوار کے روز پاکستان کے لوگ دوپہر کے پروگرام میں ریڈیو سے فرمائشی گانے سن رہے تھے کہ پروگرام اچانک رک گیا اور آواز آئی ”ایک ضروری اعلان سنیئے ..... آزاد کشمیر فوج نے پاک فوج کی مدد سے جوڑیاں کے اہم مقام پر قبضہ کر لیا ہے“ — جوڑیاں فائر بندی لائن سے اٹھارہ میل اس طرف بھارت کا ایک اہم جنگی مقام تھا جسے لینے کے لیے دشمن کے ٹروٹی کے مورچے کو توڑنا لازمی تھا۔ وہ ٹوٹ گیا اور جوڑیاں پر قبضہ کر لیا گیا۔ اب بھارتی پسپا ہو کر اکھنور کو ایک مضبوط دفاعی مورچہ بنانے لگے۔

آج بھارتیوں کا توپخانہ زیادہ ہی عتاب کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ پاک فضائیہ کی مدد مانگی گئی۔ شاہبازوں نے کئی ایک توپوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

آل انڈیا ریڈیو سے آج پُراسرار سے اعلان سنائی دیے۔ ساڑھے چار بجے پروگرام روک کر اعلان کیا گیا ”یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ علاقہ نمبر ایک میں ایک دو دنوں میں دو جگہوں پر سخت بارش ہو گی“ — اس اعلان کو دہرایا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پھر پروگرام کو روکا گیا اور اعلان کیا گیا ”علاقہ نمبر ایک کے لیے آج کوئی وارننگ نہیں ہے“ — اس اعلان کو دہرایا گیا۔ اس سے ایک ہی روز پہلے بھارت کے وزیراعظم شاستری نے اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا ”دفاع کے متعلق حکومت اپنے بعض ارادوں کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی“ — اور وزیرِ دفاع چاون نے کہا تھا ”ہماری فوجیں دلیری سے لڑ رہی ہیں اور ہم نے مناسب کارروائی کا فیصلہ کر لیا ہے“

۵ ستمبر کی رات ہماری بڑی توپوں کے گولے اکھنور میں گر رہے تھے۔ بھارتی ہائی کمان اور حکومت کی بالائی سطح پر بھونچال آیا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ سے کشمیر نکلا جا رہا تھا۔

لاہور

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی سحر کی تاریکی میں بھارت نے اعلان جنگ کے بغیر پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس کا بڑا حملہ لاہور پر تھا جو سہ طرفی تھا۔ باٹاپور، بھینی اور برکی پر حملہ تین ڈویژنوں سے کیا گیا۔ باٹاپور اور بھینی پر نمبر پندرہ انفنٹری ڈویژن سے اور برکی پر نمبر سات انفنٹری ڈویژن سے۔ انہیں کمک اور دیگر مدد دینے کے لیے نمبر ۲۳ ماؤنٹین ڈویژن ساتھ تھا اور ایک نامعلوم ڈویژن امرتسر کے گرد و نواح میں پابرکاب تھا۔ ان سب کے ساتھ ایک ایک اضافی ٹینک رجمنٹ اور عقب میں کور کا توپخانہ تھا جو حملے کے وقت خاموش تھا کیونکہ بھارتی کمانڈروں کو جانے کس نے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ توپخانے کا ایمونیشن ضائع کیے بغیر لاہور میں داخل ہو جائیں گے۔

اس بے پناہ لشکر کو روکنے کے لیے جنرل سرفراز خان کا صرف ایک ڈویژن تھا۔ تین سو توپوں کے مقابلے میں صرف ایک سو توپیں تھیں۔ اُدھر تین جرنیل اِدھر صرف ایک جرنیل۔ اُدھر نو بریگیڈیئر اِدھر صرف تین بریگیڈیئر ——— بریگیڈیئر آفتاب احمد خان۔ بریگیڈیئر قیوم شیر اور بریگیڈیئر اصغر۔ دو روز بعد بھارت نے اپنا نامور چھاتہ بردار بریگیڈ نمبر پچاس بھی واہگہ کے میدان میں اتار دیا تھا۔ اس طرح حملہ آور لشکر کی نفری، صرف پیادہ پینتیس ہزار (۳۵۰۰۰) اور ہماری صرف پانچ ہزار تھی۔ اس میں دشمن کی ٹینک رجمنٹوں کی نفری شامل نہیں۔

اس کے ساتھ ہی دشمن جنگ کو وزیر آباد تک لے گیا جہاں اس کے طیاروں نے دھونکل، گکھڑ اور راہوالی کے ریلوے سٹیشنوں پر کھڑی گاڑیوں پر راکٹ اور بم برسائے۔ ان میں ایک مسافر گاڑی تھی جس میں متعدد پاکستانی شہید اور شدید زخمی ہوئے۔ شہید ہونے والوں میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ محمد بن قاسم کو بھی ایک مسلمان لڑکی نے پکارا تھا جسے اسی ہندو نے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ آج ہندو نے اپنی تاریخ کو دہرایا اور ایک اور مسلمان لڑکی کے خون نے قوم کو پکارا۔

محمد بن قاسم پاک فضائیہ کے شاہبازوں، فلائٹ لیفٹیننٹ آفتاب عالم خان اور فلائٹ لیفٹیننٹ امجد خان کے روپ میں فضا میں موجود تھا۔ یہ دونوں شاہباز چھمب جوڑیاں کی طرف جا رہے تھے کہ انہیں وائرلیس پر کہا گیا کہ راہوالی پر آجاؤ۔ وہ آئے تو انہیں اپنے نیچے چار مسٹیئر طیارے گاڑیوں پر جھپٹتے نظر آئے۔ آفتاب عالم خان نے اٹھائیس ہزار فٹ کی بلندی سے غوطہ لگایا اور ایک مسٹیئر کو فضا میں بھسم کر دیا۔ باقی تین تتر بتر ہو کر ہاتھ سے نکل گئے۔

بھارتی کمانڈر انچیف جنرل چوہدری نے نو بجے لاہور کے جم خانہ کلب میں جشنِ فتح منانے کا اعلان کر دیا۔

سرحدی چوکیوں پر رینجروں نے چھوٹے ہتھیاروں سے مقابلہ کیا۔ کوئی شہید

ہوئے، بعض پیچھے آگئے اور کچھ قید ہو گئے۔ آگے جنرل سرفراز خان کے ڈویژن کی پلٹنوں کی کمپنیاں نہر سے آگے تھیں جنہوں نے پوری کی پوری پلٹن کا مقابلہ کیا۔ وہ فی الواقع آخری گولی اور آخری سپاہی تک لڑے۔ دشمن کا دباؤ بے پناہ تھا۔ وہ ڈوگرائی تک آن پہنچا۔ سرحدی دیہات کے بچے، بوڑھے اور عورتیں نکل گئیں، جو نکل سکے، نکل آئے۔

اپنے توپخانے نے ٹارگیٹ پہلے سے رجسٹر کیے ہوئے تھے۔ کرنل امداد علی ملک اور کرنل گلزار احمد کے توپخانے نے قیامت بپا کر دی۔ پیادہ پلٹنوں کے افسروں اور جوانوں نے خطرناک حد تک قلیل تعداد کے باوجود جم کر مقابلہ کیا۔ سورج نکلتے ہی پاک فضائیہ کی مدد مانگی گئی۔ شاہبازوں نے ڈوگرائی سے اٹاری تک اور راوی سائیفن سے ہڈیارہ تک نہایت دلیرانہ حملے کیے۔ اس طرح توپخانے ٹینکوں اور پیادہ جوانوں اور پاک فضائیہ نے حملے کا دم خم توڑ دیا اور بھارتی حکمرانوں کو ذہن نشین کرا دیا کہ لاہور میں داخل ہونے کے لیے انہیں کم از کم یہ تین ڈویژن مروانے پڑیں گے۔

بھارتی کمانڈروں نے اعلان کر دیا ———

"ہم لاہور لینے کے لیے اسّی فیصد نفری مروا دیں گے۔"

جنرل سرفراز خان نے "آرڈر آف دی ڈے" دیا ——— "پاکستان کے جوانو! آخری سپاہی تک، آخری گولی تک لڑو۔ سنگینوں سے، خالی ہاتھوں سے ناخنوں سے لڑو۔ اپنے وطن کا ایک انچ بھی دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔"

باٹا پور کا پُل دشمن کے فائر کی زد میں ہونے کی وجہ سے اس کے قبضے میں تھا مگر یہ پُل اس کے لیے پل صراط بن گیا اور یہی پل جنرل سرفراز خان، بریگیڈیئر آفتاب احمد خان اور بلوچ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل تجمل حسین کے لیے جنگ کا انتہائی نازک مسئلہ بن گیا۔ انجینئرز کے جوانوں نے شہید اور زخمی ہو کر پُل میں ڈائنامیٹ لگایا مگر پُل نہ اڑا۔ آخر ۷/۶ ستمبر کی رات پُل مکمل طور پر اڑ گیا۔

۶ تاریخ نو بجے لاہور میں جشنِ فتح منانے والے ۷ ستمبر نو بجے بھی وہیں تھے جہاں ان سے پہلا تصادم ہوا تھا۔ میدان بھارتیوں کی لاشوں سے بھر گیا تھا پاکستانیوں کا جوش و خروش اور زیادہ بڑھ گیا تھا مگر ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ لاہور محفوظ ہے کیونکہ دشمن تازہ دم پلٹنوں اور ٹینکوں سے حملے پہ حملہ کر رہا تھا۔

۷ ستمبر کا دن اور ساری رات بھارتی توپخانہ بے دریغ آگ اگلتا رہا پاک فضائیہ مدد کو آتی رہی اور بری جوان دشمن کو بڑی ہی جانبازی سے روکے ہوئے تھے۔

۷ ستمبر رات کے وقت دشمن کے حملوں کی شدّت میں کمی محسوس کی گئی اور اس کے وائرلیس پر پیغامات، جو ہمارے وائرلیس سیٹوں پر بھی سُنے گئے، صاف بتا رہے تھے کہ بھارتیوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے اور اب وہ مرے ہوئے سپاہیوں کی کمی کو کمک کے ذریعے پورا کر رہے ہیں۔ جنرل سرفراز خان نے اس موقعے سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اس ارادے سے کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اپنے محفوظ STRIKE FORCT کو دشمن پر جوابی حملے کا حکم دیا۔ اس فورس کے کمانڈر بریگیڈیئر قیوم شیر تھے۔ یہ فیصلہ انتہائی دلیرانہ تھا۔ کیونکہ محفوظہ کی نفری اور قوت خطرناک حد تک کم تھی۔

۸ ستمبر کی سحر کی تاریکی میں ہمارے مختصر سے دستے نہر پار کر گئے۔ چند ایک ٹینک ساتھ تھے۔ بریگیڈیئر قیوم شیر نے بھینی کی طرف سے واہگہ کی سمت حملہ کیا اور بریگیڈیئر آفتاب احمد نے اس مقام سے شمال کی طرف رانی ٹوطلی اور شمشیر پوسٹوں کی طرف پیش قدمی کی جو اس قدر تیز اور شدید تھی کہ دشمن سرحد سے دُور پیچھے ہٹ گیا۔ اس حملے میں بھارت کے پندرھویں ڈویژن کا کمانڈر جنرل نرنجن پرشاد اپنے ہیڈکوارٹر کی چار جیپیں بمع جنگی دستاویزات بھسین کے قریب چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اس حملے سے یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ بی آر بی سے آگے مورچے قائم کر لیے گئے۔

دشمن اب سرحد سے باہر تھا۔ اور ڈوگرئی جیسا اہم گاؤں ہمارے جانبازوں کے قبضے میں تھا۔ ایک دفاعی مورچہ اس گاؤں سے ڈیڑھ میل آگے قائم کر دیا گیا جس پر دشمن نے فائربندی تک چھبیس بڑے حملے کیے۔ اسی طرح بھسین کے قریب بھی اپنا ایک مورچہ تھا جسے دشمن نے اکھاڑنے کے لیے پوری پوری پلٹنوں اور ٹینکوں سے حملے کئے مگر ناکام رہا۔ ان دونوں اگلے مورچوں میں شجاعت اور جذبۂ حب الوطنی کے جو مظاہرے ہوئے ان کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ خصوصاً ڈوگرئی کے اگلے مورچوں نے تو خود پاکستانیوں کو محوِ حیرت کر دیا۔

۲۰ ستمبر جب اقوامِ متحدہ میں فائربندی کا معاہدہ طے ہو گیا تو بھارت نے فائربندی سے پہلے پہلے بی آر بی پار کر کے لاہور کے کسی بھی حصے پر قبضہ کرنے کی خاطر کور آرٹلری کی گولہ باری شروع کر دی، اور تازہ دم بریگیڈوں سے حملے پہ حملہ شروع کر دیا۔ یہ شدت فائربندی کے پندرہ منٹ بعد تک رہی۔

۲۳ ستمبر کی سحر پورے تین بجے یعنی جب فائربندی ہو جانی چاہیے تھی، بھارتیوں نے باٹاپور سے مایوس ہو کر ساڑھے چار میل شمال میں بھینی کے مقام پر دو پلٹنوں سے حملہ کر دیا اور ان پلٹنوں کو آگے بڑھانے کے لیے دشمن نے جو گولہ باری کی وہ جنگ کی شدید ترین گولہ باری تھی۔ لیکن پاکستانیوں نے اس حملے کو پندرہ منٹ میں پسپا کر دیا اور فائربندی سوا تین بجے، طے شدہ وقت سے پندرہ منٹ بعد ہوئی۔

جب ۲۳ ستمبر کی صبح کا اُجالا نکھرا تو میدانِ جنگ کی کیفیت بھیانک اور ہولناک تھی۔ بھارتی افسروں اور سپاہیوں کی لاشیں ایک دوسری کے اُوپر پڑی تھیں۔ ان میں پہلے معرکوں کی لاشیں بھی تھیں۔ دشمن کے ٹینک اور ٹرک جل رہے تھے۔ بھارتی توپخانے کی آخری گولہ باری کا دھواں سیاہ گھٹا کی صورت آہستہ آہستہ بھارت کی سمت اڑا جا رہا تھا جیسے بھارتی حکمرانوں کے عزائم کی ارتھی مرگھٹ کو جا رہی ہو۔ لاہور کے مینار اور بُرج اسی شان سے کھڑے تھے جس شان سے ۵ ستمبر کی شام کھڑے تھے۔ جم خانہ کلب کی عمارت باغِ جناح کی ہریالی میں کھڑی مسکرا رہی

تھی اور جنرل چوہدری دلی میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔

برکی کے میدان میں دشمن کا جو حشر ہوا وہ اس سے بھی بدتر تھا۔

برکی۔ لاہور کا دوسرا دروازہ

لاہور میں داخل ہونے کے لیے انڈین آرمی کے ساتویں انفنٹری ڈویژن نے ۶ ستمبر کی صبح ہڈیارہ کی سمت سے حملہ کیا۔ وہاں سے سڑک سیدھی لاہور چھاؤنی میں آتی ہے۔ اس ڈویژن کا کمانڈر جنرل سیبل اور ہراول کے بریگیڈ کا کمانڈر بریگیڈیئر پیارا سنگھ تھا۔ ان کے مقابلے کے لیے بریگیڈیئر اصغر تھا جس کے پاس صرف دو پلٹنیں تھیں۔ اس تناسب کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھیے کہ بھارتی ڈویژن میں نو پلٹنیں تھیں۔ ہر ایک کی نفری کم از کم ایک ہزار اور زیادہ سے زیادہ بارہ سو تھی۔ اس کے برعکس ہماری پلٹن کی نفری ساڑھے چھ سو سے ساڑھے سات سو تک تھی۔ یعنی جس علاقے پہ دس ہزار پیادہ سپاہی حملہ کر رہے تھے اس کا دفاع صرف ڈیڑھ ہزار جوان کر رہے تھے۔

بھارتی بریگیڈ گھونڈی اور ہڈیارہ میں داخل ہوا اور دیہاتیوں پر ظلم و تشدد اور عورتوں پر دست درازیاں کرنے لگا۔

بھارت کا ساتواں انفنٹری ڈویژن تو واہگہ سے آگے نکل گیا تھا لیکن پندرھواں ڈویژن ہڈیارہ نالے تک بھی نہ پہنچ سکا۔ وہ بھی صرف بریگیڈ تھا جو ہڈیارہ نالے تک پہنچا تھا جہاں میجر شفقت بلوچ کی کمپنی نے اسے روک لیا تھا۔ پیچھے آنے والے بریگیڈ ابھی سرحد سے پرے چھوٹی نہر سے بھی پرے تھے۔ اس نہر کے پُل سے ان کے ٹرک گزر رہے تھے۔ کرنل محمد نواز سیال کے توپخانے نے یہ ٹارگیٹ رجسٹر کر رکھا تھا۔ ہماری اگلی توپوں نے گولہ باری شروع کر دی جو پُل پہ سے گزرتے ٹرکوں پر پڑی۔ ان ٹرکوں میں ایمونیشن تھا جو پھٹنے لگا اور ٹرک جلنے لگے۔ اس سے پُل بند ہو گیا اور پندرھویں ڈویژن کے باقی بریگیڈ دُور رُک گئے۔ بریگیڈیئر پیارا سنگھ کا بریگیڈ آگے نکل آیا تھا جو ہڈیارہ نالے پر رک گیا۔ نالے کا پُل اڑا دیا گیا مگر نالے پر چھوٹے چھوٹے دو تین اور پُل بھی تھے جو اڑائے نہ جا سکے۔ ان کی حفاظت کے لیے ڈزنلیٹر فورس کی آر آر جیپیں اور مشین گنیں پوزیشن میں چلی گئیں۔

دشمن نے نالے کو کئی جگہوں سے عبور کرنے کی کوشش کی لیکن اپنے توپخانے نے اسے نالے کے قریب نہ آنے دیا۔ "او پی" ہر جگہ موجود تھے۔ دوپہر کے بعد میجر شفقت بلوچ کی کمپنی کو بحفاظت پیچھے ہٹا لیا گیا۔ اب ہڈیارہ سے برکی تک اپنا کوئی دستہ نہیں تھا نہ کوئی مورچہ۔ دشمن کے سامنے میز کی طرح کھلا میدان تھا مگر وہ نالہ عبور کرنے کی بھی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے توپخانے نے بہت آگ اگلی اور مسلسل اگلی مگر پاکستانی توپخانے کی جوابی گولہ باری COUNTER BOMBARDMENT نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ دشمن نے ہڈیارہ نالے کے پل پر جب بھی عارضی پُل ڈالنے کی کوشش کی اس پر گولہ باری کی گئی اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔

برکی کا دروازہ تو دشمن کے لیے ۶ ستمبر کے روز ہی بند ہو گیا تھا لیکن بھارتی ڈویژن کمانڈر کے لیے مشکل یہ تھی کہ اسے واہگہ والے ڈویژن سے لاہور میں جا ملنا تھا۔ اس لیے اسے بہرصورت آگے آنا تھا۔ ۱۱ ستمبر تک ایک بریگیڈ بصد مشکل ہڈیارہ نالہ عبور کر سکا۔ لیکن توپخانے کی گولہ باری سے اسے اس طرح بکھیر دیا گیا تھا کہ یہ بریگیڈ ساری قوت مرکوز کر کے حملہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ برکی کا چوبارہ توپخانے کی ایک ایسی ابزرویشن پوسٹ (او پی) تھی جہاں سے دُور دُور تک دشمن کی نقل و حرکت نظر آتی تھی۔ جہاں کہیں وہ گولہ بارود یا پیٹرول جمع کرتا تھا وہیں ہمارے توپخانے کے گولے جا گرتے تھے۔

برکی کے علاوہ اور کئی جگہوں پر توپخانے کے 'او پی' بیٹھے ہوئے تھے جو دشمن کو سر نہیں اٹھانے دے رہے تھے۔ اس دوران اس کے ٹینکوں اور پیادہ دستوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر ہماری کمپنیوں نے اس کا ہر حملہ پسپا کر دیا۔

۱۰ ستمبر کی رات اسے تازہ دم کمک مل گئی جس سے اس نے برکی پر بھرپور حملہ کر دیا۔ یہ برکی کا پہلا اور آخری معرکہ تھا۔ دشمن کے ٹینک اور پیادہ دستے برکی

کے اندر آگئے۔ میجر عزیز بھٹی شہید اور توپ خانے کے صوبیدار شیر دل نے چوبارے سے اپنے توپخانے کی راہنمائی کرکے برکی کے سکول کی گراؤنڈ، سڑک اور برکی کے آگے اس قدر گولہ باری کرائی کہ دشمن کی ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر مارا گیا اور جو پیادہ دستوں کا حال ہوا وہ برکی کی گلیوں، سڑک اور میدان میں دوسرے دن نظر آرہا تھا۔ جلتے ہوئے ٹینکوں اور ٹرکوں نے سپاہیوں کے لیے پیچھے کو بھاگنے کی راہ روک لی تھی۔ سپاہی زندہ جل رہے تھے۔

معرکہ اس قدر شدید اور خونریز تھا کہ گماں ہوتا تھا کہ دشمن نہر پار کرلے گا لیکن ہماری کمپنیوں نے بی آر بی سے آگے والی پوزیشنیں نہ چھوڑیں اور توپخانہ آگ اگلتا رہا۔ اور یہ جذبہ نہیں حریت کا جنون تھا کہ ہمارے جانبازوں نے دشمن کو برکی سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ دوسری صبح برکی گاؤں میں لاشیں ہی لاشیں تھیں اور دشمن گاؤں سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس رات برکی میں شجاعت کے حیران کن مظاہرے ہوئے۔

اس کے بعد دشمن برکی کے قریب نہ آیا۔ اس کا صرف توپخانہ گولہ باری کرتا رہا جس کی نوعیت دفاعی تھی۔ دشمن برکی سے دستبردار ہوچکا تھا اور اب بھارت کا یہ ڈویژن واہگہ والے ڈویژن کو کمک دے رہا تھا۔

لاہور سیکٹر کے دو گاؤں، ڈوگرئی اور برکی کو دشمن نے اپنے ریڈیو سے خوب اُچھالا ہے۔ دونوں کے متعلق آل انڈیا ریڈیو نے فیچر تیار کیے ہوئے تھے جنہیں وہ اپنے مختلف سٹیشنوں سے نشر کرتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دو مقامات پر بھارتیوں نے سب سے زیادہ سپاہی اور جنگی سامان ضائع کیا ہے۔ بھارت میں برکی کے متعلق جو خبریں چھپتی رہی ہیں اور اب تک بھارت میں جنگ ستمبر کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں برکی کو قلعہ بند گاؤں FORTIFIED VILLAGE OF BURKI لکھا ہے۔ اب بھی جا کر دیکھئے برکی میدان میں ایک ایسا گاؤں ہے جس کے اردگرد کسی ندی نالے کی قدرتی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔

سیالکوٹ

بھارتی ہائی کمان کے پلان کے مطابق انڈین آرمی کا دوسرا بڑا حملہ سیالکوٹ پر تھا۔ بھارتیوں کے تباہ شدہ ٹینکوں اور جنگی قیدیوں سے جو آپریشن آرڈر ملے ہیں ان سے تصدیق ہوئی کہ سیالکوٹ پر بکتر بند ڈویژن سے حملہ کیا جائے گا اور یہ ڈویژن سیالکوٹ کے دفاع کو کچلتا ہوا گوجرانوالہ اور وزیر آباد کے درمیان جی ٹی روڈ کو کٹ کرکے چناب تک کے علاقے پر قبضہ کرلے گا۔ اگر اس وقت تک لاہور کا دفاع کمزور نہ ہوا تو یہ ڈویژن، ایک انفنٹری اور ایک ماؤنٹین ڈویژن کی مدد سے لاہور کے دفاع کو عقب سے دبوچ لے گا۔ لیکن بھارتی ہائی کمان نے اپنے کمانڈروں کو یقین دلایا تھا کہ لاہور کے دفاعی مورچے روندے جاچکے ہوں گے اور چناب تک کے علاقے پر قبضہ سارے پاکستان کو مفلوج کردے گا۔

ہائی کمان یعنی جنرل چوہدری نے اس کامیابی کا عرصہ بہتر (۷۲) گھنٹے اور حملے کا وقت لاہور پر حملے سے اڑتالیس گھنٹے بعد مقرر کیا تھا۔ چنانچہ سیالکوٹ پر بکتر بند ڈویژن کا حملہ ۸ ستمبر کی صبح ہوا، اور جس قوت سے ہوا، اس کے پیش نظر کوئی بھی جنگی مبصر پیشین گوئی کرسکتا تھا کہ اس قدر قوت کا حملہ ناکام نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کے حملے کو روکنے والی جو قوت تھی وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھی حملہ آور ول کی قوت یہ تھی ــــ نمبر ایک بکتر بند ڈویژن (ٹینک)، ڈویژن جس میں دو ٹینک رجمنٹیں، ۶۲ کیولری اور ۲ رائل لانسرز اضافی تھیں۔ گویا بکتر بند قوت ایک ڈویژن سے زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ نمبر چھبیس انڈین انفنٹری ڈویژن، نمبر ۱۴ انفنٹری ڈویژن اور نمبر چھ ماؤنٹین ڈویژن تھا اور پیشقدمی کی شدت اور برق رفتاری کو برقرار رکھنے کے لیے ساتھ ایک اور لڑاکا موٹرائزڈ بریگیڈ تھا۔ اس بے پناہ لشکر کو مدد دینے کے لیے توپخانے کی کم و بیش پانچ سو توپیں تھیں جن میں مارٹر گنیں بھی شامل ہیں۔ یہ سارا لشکر پوری کور تھی جس کی کمان ایک اینگلو انڈین لیفٹیننٹ جنرل ڈن کر رہا تھا۔

سیالکوٹ کا محاذ یعنی سیالکوٹ کے شمال سے جسڑ تک کا میدان ٹینکوں کی جنگ کے لیے نہایت موزوں تھا۔ ساون میں بارشیں کم ہونے کی وجہ سے میدان خشک تھا یعنی کوئی قدرتی آبی رکاوٹ نہیں تھی۔ دشمن کے پاس اس قدر توپخانہ اور اتنے زیادہ ٹینک اور میکانکی ذرائع تھے کہ وہ اتنے وسیع میدان میں من مانی کر سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سیالکوٹ کے دفاع کے لیے بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) عبدالعلی ملک کا پیادہ بریگیڈ تھا اور ان کے دائیں بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) امیر عبداللہ خان نیازی کا ادھورا بریگیڈ تھا جسے دو پلٹنیں اور ڈیڑھ سکواڈرن ٹینک۔ یونٹ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ توپوں کا تناسب بھی یہی تھا۔

سیالکوٹ پر اڑتالیس گھنٹے تاخیر سے حملہ کرنے سے جنرل چوہدری کا مقصد یہ تھا کہ اس وقت تک وہ ہمارے ٹینکوں کو لاہور، بیدیاں اور قصور کے دفاع پہ بکھیر چکا ہوگا اور وہ اپنی بکتر بند قوت کو سیالکوٹ پر مرکوز کر دے گا جہاں دفاع میں کوئی اکیلی ڈھیلی ٹینک رجمنٹ ہوگی۔ دشمن کا یہ منصوبہ کسی حد تک کامیاب رہا۔ لیکن دشمن کی بکتر بند قوت سے نمٹنے کے لیے ایسے انتظامات کر لیے گئے تھے کہ ضرورت کے مطابق اپنے ٹینک بروقت پہنچ سکیں۔

جنرل عبدالعلی ملک کو سیالکوٹ کے مشرق میں سرحد سے پرے سامبا کے علاقے میں شک تھا کہ بھارتی بکتر بند ڈویژن وہاں جمع ہو رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی سوچ لیا کہ بکتر بند ٹکر اسی میدان میں ہوگی۔ حالانکہ دشمن ان کے دائیں طرف حملے کا دھوکہ دے رہا تھا جہاں جنرل نیازی تھے یعنی ظفروال کے علاقے میں۔

اس سے بھی دائیں جسڑ کے مقام پر بھی دشمن نے حملے کا دھوکہ دیا۔ وہاں بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) مظفرالدین تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر دشمن کو اس انداز سے الجھا لیا کہ اس کے دھوکے کا اثر نہ سیالکوٹ محاذ پر پڑنے دیا نہ لاہور

محاذ پر۔ انہوں نے جسڑ کا پل اڑا کر دشمن کے تمام تر دھوکے فریب اور عزائم دریا کے پار ہی ختم کر دیے۔

۷ ستمبر کے روز جنرل ملک نے سامبا کے علاقے کی چھان بین کرنے کے لیے پاک فضائیہ کی مدد مانگی اور شاہبازوں کو وہاں راکٹ اور گنیں فائر کرنے کی ہدایت دی۔ ایک شاہباز نے اس علاقے پر غوطے میں جا کر راکٹ فائر کر دیے۔ نیچے سے جو شعلے اٹھے اور جو مسلسل دھماکے ہونے لگے ان سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ دشمن کی اجتماع گاہ ہے۔ شاہبازوں نے وہاں خوب راکٹنگ اور گن فائرنگ کی۔ دشمن کا بکتر بند ڈویژن وہیں تھا۔ اس کی تصدیق شاہبازوں نے بھی کر دی۔

۷/۸ ستمبر کی رات جس توپخانے نے چھب جوڑیاں کی قلعہ بندیاں توڑیں اور پیادہ اور بکتر بند دستوں کو اکھنور تک پہنچایا تھا، اس کا بیشتر حصہ بریگیڈیئر امجد علی چوہدری کی کمان میں سیالکوٹ آ گیا۔

یہ خاص طور پر پیش نظر رکھا جائے کہ سیالکوٹ محاذ تین حصوں میں منقسم تھا — سیالکوٹ، چونڈہ اور جسڑ — جب ہم چونڈہ کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب سیالکوٹ نہیں ہوتا۔ یہ دو الگ الگ محاذ تھے اور جسڑ بالکل الگ۔

۷ ستمبر کی صبح ساڑھے تین بجے بھارت کا انفنٹری ڈویژن چاروا۔ باجرہ گڑھی کے راستے حملہ آور ہوا۔ رینجروں اور فرنٹیئر فورس نے جم کر مقابلہ کیا۔ دشمن کے توپخانے کا فائر بڑا ہی شدید اور تیز تھا اور دشمن کا دباؤ بھی بے پناہ۔ بھارتی فرنٹیئر فورس کی پوزیشنوں کے پیچھے آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دن بھر اور رات کو بھی اس کوشش میں مصروف رہے۔ اپنے توپخانے نے کارگر گولہ باری سے دشمن کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

۸ ستمبر بھارت کا مشہور و معروف بکتر بند ڈویژن میدان میں آ گیا اور پیادہ ڈویژن کی مدد سے معراکے، چوبارہ، گڈگورا اور پھلورا کے دیہات پر قبضہ کر لیا۔

اُدھر سیالکوٹ جموں محور پر بھارت کے نمبر چھبیس پیادہ ڈویژن نے حملہ کیا تھا جسے روک لیا گیا تھا۔ اس روز چھمب جوڑیاں سے بریگیڈیئر عظمت حیات کا بریگیڈ سیالکوٹ کے دفاع میں آگیا۔

دشمن دراصل چونڈہ کے وسیع میدان پر قبضہ کر کے اسے مضبوط اڈہ بنانا اور یہاں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ چناب تک کے علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے اسے ایسے اڈے کی شدید ضرورت تھی۔ یہ ایک ایسی وجہ تھی کہ چونڈہ جنگِ عظیم دوم کے بعد جنگوں کی تاریخ میں ٹینکوں کی دوسری بڑی جنگ کا میدان بن گیا۔ جنگِ ستمبر میں اس جنگ کو فیصلہ کن جنگ تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ بھارت کا بکتر بند ڈویژن ہندو کی جنگی قوت کے غرور اور فخر کی حیثیت رکھتا تھا۔ جنرل چوہدری کو ذاتی طور پر بھی اس بکتر بند قوت پر بہت ناز تھا۔ اس میں اس کی اپنی ٹینک رجمنٹ، سولھویں کیولری بھی تھی جسے اس نے "فخرِ ہند" کا خطاب دے رکھا تھا۔ اسی ٹینک ڈویژن کے نشے میں جنرل چوہدری اپنے آپ کو ٹینکوں کی جنگ کا ماہر کہا کرتا تھا۔

چونڈہ کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہم اسی محاذ کو زیادہ تفصیل سے بیان کریں گے۔ ۸ ستمبر کی صبح جنرل عبدالعلی ملک (جو اس وقت بریگیڈیئر تھے) کو اطلاع ملی کہ دشمن کے ٹینک نخنال سے معراجکے تک پھیلے ہوئے بڑھے آرہے ہیں۔ اس وقت یہ بریگیڈ چونڈہ سے دُور تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ دشمن چونڈہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ جنرل نیازی (وہ بھی اس وقت بریگیڈیئر تھے) ظفروال کی طرف روانہ ہو گئے۔ بریگیڈیئر عبدالعلی کے ساتھ کرنل (اب بریگیڈیئر) نثار احمد خان کی ٹینک رجمنٹ تھی جو مکمل طور پر تیاری کی حالت میں تھی۔ اسے بدیانہ کی طرف روانہ کر دیا گیا تاکہ دشمن اُدھر سے نہ آگے نکل آئے۔ چونڈہ پر مورچہ مستحکم کرنے کے لیے لیفٹیننٹ کرنل محمد جمشید کی پیادہ بٹالین کو بھیج دیا گیا۔ دشمن ابھی بدیانہ تک نہیں پہنچا تھا۔ بدیانہ کو میدانِ جنگ میں نازک حیثیت حاصل تھی۔

کرنل نثار کی رجمنٹ کے ایک سکواڈرن نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھلورا اور ڈگری کے محاذ پر دشمن کے پورے کالم پر حملہ کر دیا۔ تصور فرمائیے کہ ایک سکواڈرن یعنی آٹھ یا دس ٹینکوں نے دشمن کے بکتر بند ڈویژن سے ٹکر لی تھی۔ دشمن کے کئی ٹینک تباہ ہوئے اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ دشمن کی مزید تباہی کا باعث پاک فضائیہ بنی۔ اپنے توپخانے نے بھی دشمن کے متعدد ٹینک تباہ کیے۔

دشمن نے گڈگور کو مضبوط مورچہ بنا لیا۔ جب وہاں سے پیشقدمی کی تو میجر محمد احمد کے سکواڈرن نے حملہ کیا۔ یہ ٹینکوں کا ایک خونریز معرکہ تھا جس میں میجر محمد احمد بُری طرح جھلس گیا اور پیچھے آنے سے انکار کر دیا۔ اسے زبردستی ہسپتال بھیجا گیا۔ سکواڈرن لڑتا رہا۔ دشمن کے متعدد ٹینک تباہ ہوئے اور وہ پسپا ہونے لگا۔ ہمارے ٹینک سواروں نے احکام کے بغیر معراجکے تک بھاگتے دشمن کا تعاقب کیا لیکن انہیں واپس بلا لیا گیا کیونکہ وہ مرکز سے دُور نکل گئے تھے۔

اسی دن کے پچھلے پہر میجر رضا نے ٹینکوں اور میجر محمد حسین نے اپنے پیادہ جوانوں سے گڈگور کے مقام پر دشمن پر شدید حملہ کر دیا۔ دشمن کا خیال تھا کہ پاکستانی ایک کے بعد دوسرا حملہ اتنی جلدی نہیں کریں گے لیکن اچانک اس پر پاکستانی توپخانے کے گولے پڑنے لگے۔ میجر رضا نے ٹینکوں کو روک کر فائر کرنا شروع کر دیا اور میجر محمد حسین کے پیادہ جوان "یا علیؓ" اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ٹینکوں اور پیادہ دستوں کا تعاون خوب تھا۔ پیادہ جوان دشمن کی پوزیشنوں میں جا گھسے تھے۔ میجر رضا کے ٹینکوں نے دشمن کے ٹینکوں کو بے بس کیے رکھا۔ اس بے خوفی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دشمن کے ٹینکوں کا پورا سکواڈرن تباہ ہو گیا اور پیادہ سورمے مرے بھی خوب اور بھاگے بھی تیز۔ جانی نقصان زیادہ تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سکواڈرن جنرل چوہدری کی اپنی پیاری سولھویں کیولری کا سکواڈرن تھا جسے اس نے "فخرِ ہند" کا خطاب دے رکھا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ ٹینک اندھیرے میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ گڈگور کو ہی مورچہ بنا لیا گیا۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دشمن سے پانچ میل کا علاقہ لے لیا گیا۔ دشمن کے بیس ٹینک تباہ ہوئے اور بے شمار سپاہی مارے گئے اس میں دشمن کا وہ نقصان شامل نہیں جو توپخانے اور خصوصاً پاک فضائیہ نے عقب میں کیا تھا اپنے چار ٹینک بیکار ہوئے، سات جوان شہید اور تیئیس زخمی ہوئے۔

دشمن کے تباہ شدہ ٹینکوں سے جو کاغذات برآمد ہوئے ان سے پتہ چلا کہ یہ بھارت کا آرمرڈ (بکتر بند) ڈویژن ہے جسے "سیاہ ہاتھی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ انہی کاغذات سے اس ڈویژن کے عزائم بے نقاب ہوئے جو بڑے خوفناک تھے۔

دشمن کے حملے کی شکل یہ تھی کہ ایک بہت ہی لمبے چوڑے محاذ پر اسے تین کالموں میں حملہ کرنا تھا۔ ایک ٹینک رجمنٹ (پونا ہارس)، کونخنال، سبز کوٹ اور خانپور کے راستے ٹھیروا اور ڈگری پر قبضہ کرنا تھا۔ دوسرا کالم یہ تھا کہ سولہویں کیولری کو گورکھا رجمنٹ کے ساتھ رنگور اور چوبارہ کے راستے سڑک کے ساتھ ساتھ پھلورا پر قبضہ کرنا تھا۔ تیسرا کالم موٹر بریگیڈ اور نمبر ۲ لانسرز کا تھا جسے سبز پیر اور مست گڑھ کے راستے بھاگووال پر قبضہ کرنا تھا۔ مگر ہماری صرف ایک ٹینک رجمنٹ نے تینوں کالموں کا راستہ روک لیا۔

فائر بندی تک دشمن نے بڑی شدت سے حملے کیے اور چونڈہ کو اڈہ بنانے کی کوشش کی لیکن توپخانے کی دلیرانہ اور کارگر گولہ باری، اپنے ٹینک سواروں اور پیادہ دستوں کی جانبازی اور پاک فضائیہ کی بے مثال جرأت نے اسے کہیں بھی قدم نہ جمانے دیے۔

سیالکوٹ سیکٹر میں جنرل ٹکا خان تھے اور چونڈہ سیکٹر میں جنرل ابرار حسین۔

۹ ستمبر کو دشمن نے ایک ٹینک رجمنٹ اور ایک پیادہ پلٹن سے چوبارہ پر جوابی حملہ کیا۔ توپخانے کے علاوہ اسے لڑاکا بمبار طیارے بھی مدد دے رہے تھے۔ پاک فضائیہ فوراً پہنچ گئی۔ شاہبازوں نے بھارتی ہوابازوں کو ایک گولی بھی فائر نہ کرنے دی۔ دشمن کے بری دستے پسپا ہو گئے۔

۱۰/۹ ستمبر کی رات دشمن نے جموں کی سمت سے سیالکوٹ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی اور وہاں ٹینک جمع کئے۔ ان ٹینکوں کو ہماری ٹینک شکار پارٹیوں نے رات کو جا کر تباہ کیا۔ یہ ایک دلیرانہ اقدام تھا جس سے دشمن نے اس طرف ٹینکوں کا اجتماع نہ کیا۔

۱۰ اور ۱۱ ستمبر دشمن نے سیالکوٹ، چونڈہ اور جسڑ پر بے پناہ گولہ باری کی۔ یہ ہمارے دفاعی مورچوں کو ختم کرنے کا اہتمام تھا جو ہمارے توپخانے اور شاہبازوں نے ناکام کر دیا۔ چونڈہ محور پر تو صبح دو بجے سے آٹھ بجے تک گولہ باری جاری رہی اور انڈین ایئر فورس بھی راکٹ اور بم پھینکتی رہی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ بہت بڑا حملہ آنے والا ہے ـــــ اور وہ حملہ دن کے گیارہ بجے آگیا۔ یہ بھارت کے بکتر بند ڈویژن کا بھرپور حملہ تھا جس میں ایک بکتر بند ڈویژن اور امدادی توپخانے کی پوری شدت اور عتاب تھا۔

اس کا مقابلہ ہماری تین ٹینک رجمنٹوں سے تھا۔ یہ معرکہ بہت ہی تیز اور بہت ہی خونریز تھا۔ ٹینک ٹینکوں پر آگ اگل رہے تھے۔ ٹینک شکن پیادہ دستے ٹینکوں میں پس رہے تھے۔ دونوں طرف کے توپخانے زمین و آسمان کو ہلا رہے تھے۔ طیاروں کے غوطے، راکٹ اور بم قیامت میں ہولناک اضافہ کر رہے تھے۔ آسمان میں جنگ، زمین پر جنگ۔ اور اس سارے منظر کو سیاہ دھوئیں اور گرد نے چھپا رکھا تھا۔ میدان جنگ پھلورا اور گڈگور کا علاقہ تھا۔ یہ چونڈہ کا ایک خونی معرکہ تھا جس میں پاکستان کے جانبازوں، پیادہ جوانوں، ٹینک سواروں، توپچیوں اور شاہبازوں نے شجاعت اور بے خوفی کے جو مظاہرے کیے وہ پوری کتاب کا موضوع ہے۔ انسان جلتے ٹینکوں میں جل رہے تھے۔ پاکستانی آر آر گنز اور راکٹ لانچروں والے کھلے میدان میں ٹینکوں سے لڑ رہے تھے۔ یہیں سے اس روایت نے جنم لیا تھا کہ پاکستانی جانباز سینوں سے بم باندھ کر ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے تھے۔ یہ روایت بے بنیاد ہے مگر جس انداز

سے انہوں نے یہ معرکہ لڑا وہ ٹینکوں کے آگے لیٹ کے ہی انہیں روکنے کے مترادف تھا۔

اس معرکے میں بھارتیوں نے ایک ایسی چال چلی جسے بیان کرنے کے لیے نہ ہماری زبان میں الفاظ اور اصطلاحیں ہیں نہ ہندو کی اپنی زبان میں۔ چال یہ تھی کہ بھارتیوں نے پہلے حملے میں ہمارے سرحدی دیہات کے سینکڑوں لوگوں کو جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں، قید کر لیا تھا۔ ٹینکوں کے اس معرکے میں بھارتی ان معصوموں کو آگے لے آتے اور انہیں اپنے مورچوں کے سامنے کھڑا کر کے ہمارے مورچوں پر فائر کرنے لگے۔ انہوں نے زندہ پاکستانیوں کو ڈھال بنا لیا تھا۔ پاک فوج کے لیے یہ وقت بڑا ہی نازک اور صبر آزما تھا۔ یہ ایک دشواری تھی۔ پھلورا ہاتھ سے نکل گیا۔ اُن معصوم دیہاتیوں کا کیا حشر ہوا؟ گرد و غبار میں کوئی دیکھ نہ سکا۔

۱۳ ستمبر کو بھی دشمن نے وہی منظر پیدا کر دیا۔ اس کے ٹینکوں نے الڑ کی طرف سے چونڈہ تک آنے کی کوشش کی۔ ہمارے توپخانے نے بڑی توپوں کو بھی آگے لے جا کر بہت سے ٹینک تباہ کیے۔ اسی روز دشمن بدیانہ پر حملہ آور ہوا کیونکہ اسے شک تھا کہ یہاں پاکستان کی دفاعی لائن میں شگاف ہے۔ ساتھ ہی گڈگور اور چوبارہ سے بھی دشمن کے ٹینک حملہ آور ہوئے۔ اب محاذ بہت زیادہ پھیل گیا تھا۔ اپنی کچھ اور ٹینک رجمنٹیں دوسرے محاذوں سے پہنچ گئی تھیں۔ اس وسیع محاذ کو زد میں لینے کے لیے توپخانے کی بڑی اور میڈیم توپوں نے سیالکوٹ محاذ سے بھی چونڈہ کے مغرب میں فائر کیا اور دشمن کے ٹینکوں کا بے تحاشہ نقصان ہوا۔

۱۴ ستمبر دشمن نے چونڈہ پر دو طرفی حملہ کیا۔ ایک پھلورا۔ چونڈہ سڑک کے ساتھ ساتھ اور دوسرا سیالکوٹ چونڈہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ۔ ہماری دفاعی پوزیشنیں نیم دائرے میں تھیں جنہوں نے خوب مقابلہ کیا اور ۱۵ ستمبر تک ٹینکوں کی جنگ جاری رہی۔

۱۶ ستمبر دشمن نے جسوراں کی طرف سے حملہ کیا۔ اسے وہ خالی علاقہ سمجھ رہا تھا مگر وہاں اپنے ٹینک اور پیادہ دستے گھات میں بیٹھے تھے۔ دشمن کو یہاں تک آگے آنے دیا گیا کہ وہ چونڈہ ریلوے سٹیشن تک پہنچ گیا۔ دراصل بھارتی سڑک کے پانچویں سنگِ میل تک پہنچنا چاہتے تھے جس کے لیے بھارتی ہائی کمان نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو سڑک کو اس سنگِ میل سے کاٹے گا، اسے مہاویر چکر دیا جائے گا۔

چونڈہ ریلوے سٹیشن کے قریب "جے ہند" کا نعرہ بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی بھارتیوں پر تین اطراف سے قیامت ٹوٹ پڑی۔ یہ جنرل عبدالعلی ملک کا بریگیڈ تھا۔ بھارتی ٹینک اور پیادہ سپاہی تیزی سے تباہ و برباد ہونے لگے لیکن بھارتیوں نے اس روز جرأت اور ہمت و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ وہ اس معرکے میں ٹینک پہ ٹینک اور پلٹن پہ پلٹن جھونکتے چلے گئے۔ یہ چونڈے کا ایک اور شدید اور بھیانک معرکہ تھا جس میں دشمن کا بے دریغ نقصان ہو رہا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ آج وہ پانچویں سنگِ میل پر سڑک کو کٹ کر لے گا۔ بھارتی اس مقصد کے لیے دل کھول کر قربانی دے رہے تھے۔ اس معرکے میں اپنے دشمن کو خراجِ تحسین نہ پیش کرنا غیر جنگ جویانہ حرکت ہو گی۔ اس نے پانچویں سنگِ میل تک پہنچنے کے لیے یکے بعد دیگرے تین یونٹ، کمانڈر (کرنل)، مروا لیے مگر دباؤ کم نہ کیا۔ شام کے اندھیرے کے ساتھ ہی بھارتی ڈھیلے پڑ گئے کیونکہ اب ٹینک ان کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی معرکہ ختم ہو گیا۔ بریگیڈیئر عبدالعلی ملک کے جانبازوں کو جس قدر خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے لیکن دشمن بھی شاباش کا حقدار ہے جس نے دو ہزار سے زائد افسر اور جوان مروا لیے اور کئی قیدی چھوڑ گیا۔ ان بھارتیوں کو ہم بزدل نہیں کہہ سکتے۔

توقع تھی کہ دشمن اس قدر کمر توڑ نقصان کے بعد فوراً میدان میں نہیں آ سکے گا لیکن اس کے پاس اتنی نفری اور ٹینک تھے کہ اس نے اگلے ہی روز علی الصبح اسی شدت کا ایک اور حملہ کیا جس کا عشر کل والے حملے کا سا

ہؤا، پھر اس نے بوتر ڈوگرانڈی اور جانیوال کے علاقے پر ہلہ بولا۔ پاکستانی ٹینک سواروں نے یہاں بھی خوب مقابلہ کیا اور دشمن کے بہت ٹینک تباہ کیے۔ پھر دشمن نے چونڈہ پر مغرب سے حملہ کیا جسے پسپا کیا گیا۔ بھارتی چند ایک ٹینک، لاشیں اور قیدی پیچھے چھوڑ گئے۔

اس معرکے کے بعد بھارت کے بکتر بند ڈویژن کی مرکزیت اور جمعیت بکھرنے لگی تھی۔ دراصل اس کا زہر یار اجا چکا تھا۔ اور ہندوستان کا فخر چونڈہ کی مٹی میں مل چکا تھا۔ کچھ یہ وجہ تھی کہ دشمن نے اب اپنے بکتر بند ڈویژن کو متحدہ طور پر لڑانے کی بجائے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے لڑانا شروع کر دیا اور کچھ اس امید سے بھی ایسا کیا کہ پاکستان کے ٹینکوں کو جن کی تعداد بہت کم ہے زیادہ سے زیادہ وسیع میدان میں پھیلا کر کمزور کر دیا جائے۔

اس کے علاوہ دشمن کی پیادہ پلٹنوں نے ایک فریب کاری سے کام لیا۔ وہ اس طرح کہ بھارتی پلٹن رات کے وقت فائر کیے بغیر ہماری پوزیشنوں کی طرف "یا علیؓ" کے نعرے لگاتی آتی تھی۔ پہلی بار ہمارے جوان دھوکے میں آ چلے تھے لیکن روشنی راؤنڈ فائر کر کے دیکھا کہ "یا علیؓ" کے نعرے لگانے والوں کی وردی ہری تھی۔ انہیں اور آگے آنے دیا گیا۔ ہمارے تین ٹینک کھڑے تھے۔ انہوں نے وسیع مثلث بنالی۔ جب بھارتی اس مثلث میں آگئے تو وہ سمجھے کہ وہ پاکستانیوں کے عقب میں پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے "جے ہند" کا نعرہ لگایا۔ اپنے تینوں ٹینکوں نے مشین گنوں کا فائر کھول دیا۔ جو بھارتی نکل کر بھاگے انہیں انفنٹری کے جوانوں نے سٹین گنوں اور گرینیڈوں سے وہیں رکھا۔ ان میں صرف وہی زندہ رہے جنہوں نے بھاگنے کی بجائے ہتھیار پھینک کر ہاتھ کھڑے کر دیے۔ اس طرح تین چار بار ہؤا اور ہر بار بھارت نے ایک ایک پلٹن "یا علیؓ" کے نعرے کی نذر کر دی۔ بھارتیوں کی چال جیت کھیلی جا چکی تھی۔

ان کے ہاتھ میں ایک بڑا مقام جسوراں رہ گیا تھا جو ان سے ۱۹ ستمبر کے روز ہماری ایک ٹینک رجمنٹ کے دو سکواڈرنوں اور فرنٹیئر فورس

کی ایک کمپنی نے جانبازانہ معرکہ لڑ کر لے لیا۔

چھوٹی پارٹیوں میں بکھر کر لڑنے کا تجربہ بھارتیوں کے لیے اچھا ثابت نہ ہؤا۔ ہمارے ٹینک تو پہلے ہی سکواڈرن سکواڈرن ہو کر لڑ رہے تھے۔ دشمن کو اس تجربے میں بوتر ڈوگرانڈی، جسوراں، فتح پور، سدریکے اور منڈی کے بیریاں واپس دینے پڑے۔ پھر انہیں ریلوے لائن سے بھی پیچھے ہٹا دیا گیا اور اس روز انہوں نے چونڈے پر جو حملہ کیا وہ انہیں بہت مہنگا پڑا۔

۱۹ اور ۲۰ ستمبر بھارتیوں نے بعض مقامات پر حملے کیے جو فوراً پسپا کر دیے گئے۔ لیکن یہ بھارتیوں "بُرظلم" تھا کیونکہ اپنی بکھری ہوئی فوج کے بعض دستوں کو خیریت سے پیچھے ہٹا لینے کے لیے انہوں نے یہ حملے کیے تھے۔ اس دوران بہت سے جنگی قیدی ہاتھ آئے۔ قیدیوں کی جذباتی اور جسمانی حالت بتاتی تھی کہ نہ تو ان کا کوئی مذہب رہ گیا ہے نہ جذبہ۔

۲۱، ۲۲ ستمبر اور فائر بندی تک توپخانوں کی جنگ جاری رہی۔ بھارتی اب جہاں سے پیچھے ہٹتے تھے وہاں کے گاؤں کو آگ لگا جاتے تھے۔ فوجوں کی واپسی کے بعد سرحدی دیہات کو دیکھا گیا تو کسی بھی گھر کی چھت نہیں تھی نہ کواڑ تھے۔ وہ فائر بندی کے بعد دیہات کو جلاتے رہے تھے — اب بھارت کا سیاہ ہاتھی بلی بن گیا تھا اور یہ بلی کھمبا نوچ رہی تھی۔

برطانیہ کے مشہور اخبار "مرر" کا وقائع نگار "بریان ہیجن" فائر بندی کے وقت چونڈہ سیکٹر میں موجود تھا وہ لکھتا ہے:

> بھارتی بُری طرح ناکام ہوئے۔ پاکستانیوں کی نفری کم تھی، ہتھیار بھی کم مگر وہ ہیبت ناک غضب سے لڑے اور جیت گئے۔

کھیم کرن

قصور کے راستے لاہور میں داخل ہونے کے لیے چھ ستمبر کی صبح انڈین آرمی

کا نمبر چار ماؤنٹین ڈویژن نمبر اکتالیس ماؤنٹین بریگیڈ اور نمبر دو انڈی پینڈنٹ آرمرڈ (بکتر بند) بریگیڈ گروپ جس کی نفری اور قوت ڈویژن کے برابر تھی، حملہ آور ہوئے۔

چھ ستمبر صبح پانچ بجے انڈین آرمی نے بیدیاں ہیڈورکس پر حملہ کیا تاکہ یہاں سے بی آر بی پار کی جائے۔ وہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ نے اس حملے کو روک کر پسپا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کھیم کرن کے سامنے ہماری سرحدی پوسٹ برج پنجواں، روہی وال اور بیلا نوالہ پر بھی حملہ کیا۔ دشمن کا توپخانہ خاموش تھا، ٹینک اور پیادہ دستے فائر کرتے آ رہے تھے۔ ان تمام مقامات پر ہمارے توپخانے کے 'او پی' موجود تھے جنہوں نے گولہ باری سے دشمن کو خاصا نقصان پہنچا کر ہر مقام سے حملہ پسپا کر دیا۔ اس دوران دشمن کے طیارے ہماری پچھلی پوزیشنوں پر راکٹ فائر کرتے رہے۔ بہت سے ٹینک سرحد سے پرے کھیم کرن سڑک پر آ رہے تھے۔ ہمارے کھیم کرن پوسٹ کے 'او پی' نے بروقت اور صحیح گولہ باری سے کئی ٹینک تباہ کر دیئے اور جو سلامت رہے وہ بھاگ گئے۔

ڈوگرے روہی وال گاؤں کے جنوب سے آگے نکل آئے جس سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ہماری دفاعی لائن کو بازو کش OUT FLANK کر لیں گے۔ ہماری ایک رائفل کمپنی نے شجاعت کا مظاہرہ کیا اور بروقت اس پہلو پر پہنچ گئی۔ توپخانے کے 'او پی' نے نہایت کارگر گولہ باری کرائی۔ جس سے ڈوگرے بکھر کر بھاگے اور مرے۔ ان کا سیکنڈ ان کمانڈ میجر ملکیت سنگھ چودہ سپاہیوں کے ساتھ ہتھیار ڈال کر پاک فوج کی قید میں آ گیا۔

دشمن کی اس کیفیت کو دیکھ کر یہ جانبازانہ فیصلہ کیا گیا کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور دفاعی جنگ لڑنے کی بجائے جوابی حملہ کر کے جنگ دشمن کے ملک میں لڑی جائے۔ حملہ روک کر فوراً حملہ کرنا ناممکن سی بات ہوتی ہے اور اس حال میں جب کہ اپنے پاس قوت بھی کوئی نہ ہو، جوابی حملے کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

قصور کے دفاع میں اپنا جو ڈویژن تھا وہ کوئی اضافی یا مکمل ڈویژن نہیں بلکہ ادھر اُدھر سے یونٹیں اکٹھی کر کے اور مختلف ہیڈکوارٹروں سے افسروں کو بلا کر ایک فوج بنائی گئی تھی۔ جو پورا ڈویژن نہیں تھی۔ کمان میجر جنرل (اب لیفٹیننٹ جنرل) عبدالحمید خاں کو دی گئی۔ ان کے پاس کل پانچ پلٹنیں تھیں اور محاذ اٹھائیس میل لمبا۔ اس کے مقابلے میں دشمن کے پاس کم و بیش تیس پلٹنیں تھیں۔

۷ ستمبر دشمن کے توپ خانے نے قصور کی دفاعی پوزیشنوں پر شدید گولہ باری جاری رکھی اور اس کے طیاروں نے بھی دل کھول کر راکٹ اور بم برسائے۔ اسی روز بریگیڈیئر صاحب داد کا بریگیڈ بھی اس محاذ پر پہنچ گیا۔ اسی شام روہی نالہ پر پل ڈال کر فرنٹیئر فورس نے نالے کے پار برج ہیڈ کے مورچے قائم کر لیے۔ پھر ایک ٹینک رجمنٹ نالہ پار کر گئی۔

۶ اور ۷ ستمبر کو بھارتی حملے کرتے رہے تھے لیکن قیدی اور لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتے رہے۔ ۸ ستمبر کی صبح بریگیڈیئر صاحب داد کے بریگیڈ نے پیش قدمی شروع کر دی۔ اپنی ایک ٹینک رجمنٹ کرنل صاحبزادہ گل شہید کی قیادت میں کھیم کرن کے اس انسپکشن بنگلے تک پہنچ کر دشمن پر آگ برسانے لگی جس بنگلے میں بیٹھ کر شاستری نے اپنے اخباری نمائندوں سے کہا تھا کہ ہم اب اپنی مرضی کا محاذ کھولیں گے۔ اس رجمنٹ نے دشمن کو بہت نقصان پہنچایا۔ دشمن نے کھیم کرن کو بچانے کے لیے توپ خانے کا استعمال بے دردی سے کیا۔ اس کے ٹینکوں نے دور سے بہت آگ برسائی مگر کھیم کرن اب بھارتیوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ دشمن نے پاکستانیوں کی توجہ کھیم کرن سے ہٹانے کے لیے بیدیاں محاذ پر شدید حملہ کیا لیکن مشرقی پاکستانیوں نے اس کا یہ داؤ چلنے نہ دیا۔ ان کے پہلو میں ایک بلوچ رجمنٹ بھی تھی جس نے نہر سے بہت آگے مورچے قائم کر رکھے تھے۔

کرنل صاحبزادہ گل شہید کی ٹینک رجمنٹ نے پنجاب رجمنٹ اور فرنٹیئر فورس کی ایک ایک پلٹن کے ساتھ ایسا ہلہ بولا کہ دشمن کو دور پیچھے دھکیل کر دائیں اور بائیں

سے کھیم کرن کو دونوں بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ دشمن کی پسپائی چھب جوڑیاں سے ملتی جلتی تھی۔ ہمارے جانبازوں نے دباؤ برقرار رکھا اور آگے بڑھ گئے۔

دشمن کا لشکر بکھر کر چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جو پارٹی اپنے مرکز سے وابستہ رہ گئی تھی وہ دفاع میں لڑی، باقی پارٹیاں یا تو بھاگ اٹھیں یا جنگی قیدی بن گئیں۔

۸ ستمبر کے تیسرے پہر کرنل صاحبزادہ گل شہید کے ٹینک کھیم کرن سے بارہ میل آگے ایسے ہی ایک اور بڑے قصبے ولٹوہا تک جا پہنچے۔ میجر جنرل گوربخش سنگھ کے ماؤنٹین ڈویژن کی پسپائی کو بھارتی حکمرانوں نے ایک قابل تعریف جنگی چال کہہ کر خفت مٹانے کی کوشش کی۔ مگر صورتِ حال بڑی مختلف تھی۔

۹ ستمبر پاک فوج کے یہ مختصر سے بکتر بند اور پیادہ دستے دائیں طرف اور آگے بڑھ گئے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت تک دو ہزار بھارتی مارے جا چکے تھے۔ میدانِ جنگ میں چھوٹے بڑے ایمونیشن کے بند بکسوں اور پیٹرول کے ڈرموں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

اس روز ہماری ایک اور ٹینک رجمنٹ اسی طرح کی پیشقدمی کرتی ہوئی کھیم کرن کے بائیں آٹھ میل اصل اتر سے بھی آگے نکل گئی۔ ایک دشواری یہ پیش آئی کہ ٹینکوں کی پیشقدمی اس قدر تیز تھی کہ انفنٹری ساتھ نہ دے سکی۔ شام ہو چکی تھی۔ اس لیے ٹینکوں کو پیچھے بلا لیا گیا۔ دشمن کو ذرا سنبھلنے کا موقع تو مل گیا لیکن اسے ایسی ضرب لگائی جا چکی تھی کہ اب وہ صرف دفاع میں لڑ سکتا تھا۔ اس میں حملہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ اس کا مزید دم اس طرح نکالا گیا کہ ہمارے بڑے توپ خانے نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا اور اتنی اتنی بڑی گنوں کو اس قدر آگے لے گئے جہاں سے فیروزپور کو زد میں لیا جا سکتا تھا۔ اسے جرأت مندانہ اقدام اس لیے کہا جاتا ہے کہ اتنی بڑی گنیں دور اوپر فضا سے نظر آجاتی ہیں اور دشمن کے طیاروں کا آسان شکار ہوتی ہیں۔ طیارہ شکن دستوں

کی یقین دہانی پر یہ توپیں آگے لے جائی گئیں اور کھلے میدان میں رکھ کر فیروزپور کے فوجی ٹارگیٹوں مثلاً راڈار، آرڈننس فیکٹری، ریلوے سٹیشن اور چھاؤنی کے علاقے پر گولہ باری کی گئی۔ ٹارگیٹ فضا سے دیکھے اور ان کے فوٹو لیے گئے تھے۔ گولہ باری رات کے وقت کی گئی جسے آل انڈیا ریڈیو پاک فضائیہ کی بمباری کہتا رہا۔ کیونکہ بھارتی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اتنی دور سے ٹارگیٹ کو دیکھے بغیر اتنی صحیح گولہ باری بھی ہو سکتی ہے۔

۱۰ ستمبر کو دشمن نے پاکستانیوں کی توجہ کھیم کرن محور سے ہٹانے کیلئے بیدیاں محاذ پر ایک اور شدید حملہ کیا جو وہاں کے دفاعی دستوں نے جانبازی سے پسپا کر دیا۔

ہماری ایک ٹینک رجمنٹ کو شمال کی جانب امرتسر روڈ کو بتیسویں (۳۲) سنگ میل پر کاٹنے اور وہاں مورچے بنانے کا حکم ملا۔ اس کے ساتھ فرنٹیئر فورس کی ایک پلاٹون تھی۔ اس ٹینک رجمنٹ کی پیشقدمی بھی روایات کے عین مطابق بہت تیز تھی اور دشمن کی مزاحمت شدید۔ رجمنٹ کمانڈر کرنل نذیر تھے۔ ان کی چالوں نے دشمن کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ دشمن نے سامنے سے بھی حملہ روکنے کی کوشش کی اور دائیں پہلو سے بھی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ہماری دونوں یونٹیں گاؤں پہ گاؤں لیتی جا رہی تھیں لیکن دشمن کے ساتھ مسلسل تصادم کی وجہ سے ٹینک رجمنٹ کو ایسی چالیں چلنی پڑیں کہ رجمنٹ کے سکواڈرن ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ اسی طرح پیادہ دستے بھی پھیلتے چلے گئے۔ انہوں نے امرتسر روڈ مطلوبہ سنگِ میل پر کاٹ لیا لیکن کئی ایک ٹینک دلدل میں بھی پھنس گئے یہ دلدل دشمن نے چھوٹی چھوٹی نہروں کو توڑ کر رات کے وقت پھیلادی تھی جس سے ہمارے ٹینکوں کی رفتار سست ہو سکتی تھی۔

مسلسل پیش قدمی اور جگہ جگہ دشمن کے تصادم کی وجہ سے اپنے کئی ایک ٹینک تباہ اور بیکار بھی ہو چکے تھے آخر میں جا کر محاذ اتنا پھیل گیا کہ ٹینکوں اور انفنٹری کا رابطہ ٹوٹ گیا اور ٹینک پھنس بھی گئے جس سے اس رجمنٹ کا بہت نقصان ہوا۔

لیکن دشمن کا جو نقصان ہوا وہ میلوں وسیع میدان میں نظر آرہا تھا۔

اس روز دشمن نے چونڈہ پر حملے پہ حملہ کرنا شروع کر دیا۔ ان معرکوں کی خونریزی اور شدت کو دیکھتے ہوئے کھیم کرن محور سے کئی ایک ٹینک چونڈہ بھیج دیے گئے اور کھیم کرن کے علاقے میں دفاعی پوزیشن اختیار کر لی گئی۔ گویہ پوزیشن دفاعی تھی لیکن بھارتیوں کے لیے ایسا خطرہ بن گئی جسے دلی تک محسوس کیا گیا اور وہاں کے مرکزی حکومت کے دفاتر الہ آباد منتقل ہونے لگے۔ بھارتیوں نے پاکستانیوں کے دو حملے دیکھ لیے تھے۔ ایک چھمب جوڑیاں اور دوسرا کھیم کرن ولٹوہا اصل اتر محور۔ ان کی برق رفتاری سے وہ ہر لمحہ خوفزدہ رہنے لگے۔ پیش بندی کے طور پر انہوں نے اس محاذ کو دوسرے محاذوں سے یونٹیں بلا کر اور ریزرو سے کمک لے کر مستحکم کر لیا اور ہمارے مورچوں پر مسلسل گولہ باری شروع کر دی۔

۱۱ ستمبر۔ انہوں نے ایک ٹینک رجمنٹ (دکن ہارس) اور سکھ رجمنٹ سے ہماری پوزیشنوں پر حملہ کیا۔ سکھ رجمنٹ دلیری سے ہمارے عقب میں آنے کی کوشش کرنے لگی۔ جس کے صلے میں آدھی رجمنٹ ماری گئی اور کرنل اننت سنگھ باقی ماندہ پلٹن سے ہتھیار ڈلوا کر پاک فوج کی قید میں آگیا۔ دکن ہارس سکھوں کو پاکستانیوں کی قید میں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

۱۰، ۱۱ اور ۱۲ ستمبر۔ دشمن نے تازہ دم ٹینک رجمنٹوں اور انفنٹری سے شدید حملے کیے۔ حملوں کا انداز یہ ہوتا تھا کہ پہلے شدید گولہ باری ہوتی تھی۔ اس آتشیں چھاتے تلے بھارتی بکتر بند اور پیادہ دستے بڑھتے چلے آتے تھے۔ جوں ہی گولہ باری بند ہوتی تھی، بھارتی "جے ہند" کا نعرہ لگا کر ہلہ بول دیتے تھے۔ وہ ہمارے چھوٹے ہتھیاروں اور گرینیڈوں کی ایسی زد میں ہوتے تھے کہ بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ کئی بار ایسے ہوا کہ بھارتی سپاہی گرد و غبار میں ہمارے مورچوں کے اندر آگرے۔

ایک بار قیدیوں نے بتایا کہ ان کے توپ خانے کے کمانڈر نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اس نے پاکستانی مورچوں پر اتنی زیادہ گولہ باری کی ہے کہ وہاں کوئی انسان زندہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ یہ بھارتی اس خوش فہمی میں ہمارے مورچوں تک

چلے آئے۔ اسی خوش فہمی میں بھارتیوں نے ٹینک بھی خوب ضائع کیے۔

ہمارے ڈویژن کمانڈر نے دشمن کو حملوں کے قابل نہ چھوڑنے کیلئے چھوٹی چھوٹی پارٹیوں اور ٹینک ہنٹنگ پارٹیوں سے شب خون مارنے کی ہدایت جاری کی۔ ان جانباز پارٹیوں نے دشمن میں ہر رات کھلبلی مچائی اور اسے سوچنے سے بھی معذور کر دیا۔

ہمارے قبضے میں صرف کھیم کرن نہیں بلکہ اور بھی بہت سے مقام تھے جن میں مضبوط مورچہ سنکترہ میں تھا۔ ۱۷ ستمبر کے روز دشمن نے اس مورچے کو توڑنے کے لیے ڈویژنل آرٹلری سے گولہ باری اور ایئر فورس سے بمباری کی۔ پھر ٹینکوں سے شدید حملہ کیا۔ یہ بریگیڈ کا حملہ تھا جس کا حشر ہر حملے جیسا ہوا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر رات بھارتی حملہ کرتے تھے اور ہر بار پسپا ہوتے تھے۔

۲۰ ستمبر سے ۲۳ ستمبر صبح تین بجے تک بھارتیوں نے ہمارے مورچوں پر اتنی شدید گولہ باری کی جس کے متعلق جنگِ عظیم میں لڑے ہوئے افسروں کی رائے ہے کہ جرمنوں اور اتحادیوں نے بھی نہیں کی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق آخری تین دنوں میں بھارتیوں نے ستر ہزار گولہ فائر کیا تھا۔ اس گولہ باری کے سائے اور گرد و غبار میں وہ اپنے پیادہ دستوں کو بے رحمی سے ہمارے مورچوں کی طرف دھکیلتے تھے جن میں سے وہی زندہ بچے جو ہمارے مورچوں میں آگئے یا دور پیچھے رہے۔ لیکن ایسے خوش نصیب بہت کم تھے۔

کھیم کرن کے آخری چھتیس گھنٹے ہمارے جانبازوں کے لیے قیامت سے کم نہ تھے۔ فائر بندی ہونے والی تھی اور بھارتی حکمرانوں کے جھوٹ سے پردہ اٹھنے والا تھا۔ وہ نو آکاش وانی کی زبان سے ابھی تک کہہ رہے تھے "قصور پر ہمارا قبضہ ہے"۔ مگر حقیقت بے نقاب ہونے والی تھی۔ بھارتیوں نے تمام تر قوت اور بارود کھیم کرن سے پاکستانیوں کو پیچھے ہٹانے کے لیے داؤ پر لگا دیا لیکن ہمارا ایک بھی مورچہ نہ اکھاڑ سکے۔

فائر بندی کی صبح کھیم کرن محورِ ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر سو بھارت کے ٹینک جل رہے تھے اور لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے جن میں آخری معرکے کے زخمی بھی تڑپتے دیکھے گئے۔ کھیم کرن پر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

راجستھان

بھارت کے ۷ اور ۸ ستمبر کے اخباروں میں اس طرح کی خبریں شائع ہوئی تھیں ——— ''سندھ میں ہماری فوجوں کی فاتحانہ پیش قدمی ——— سندھ کے ایک بڑے شہر پر ہماری فوج کا قبضہ ——— شام تک حیدر آباد سے پاکستان کو دو حصوں میں کاٹ دیا جائے گا۔''

جب جنگ ختم ہوئی تو راجستھان میں بھارت کا دو ہزار مربع میل علاقہ ہمارے قبضے میں تھا۔

یہ محاذ سب سے لمبا تھا یعنی بہاولپور سے گھوٹکی تک دو سو پچاس میل اور اسی محاذ پر ہماری فوج بہت کم تھی اس سیکٹر کو بھارت نے پاکستان کا ایسا دروازہ سمجھ لیا تھا جس کے کواڑ نہیں تھے۔ یہاں اس نے گیارہویں انفنٹری ڈویژن سے حملہ کیا تھا تاکہ حیدر آباد کو قبضے میں لے کر کراچی کو پاکستان سے کاٹ دیا جائے۔ اس حملے میں اس نے طیارے اور توپخانے کا بھی خوب استعمال کیا اور اپنی قوت بڑھاتا رہا۔ اس سیکٹر کی مختصراً تشریح یوں ہے کہ یہ سندھ سے ملتا ہے۔ بھارتی علاقے میں کشن گڑھ اور گھڈارو جیسے بڑے قلعے ہیں جو مسلمانوں نے تعمیر کیے تھے۔ ان کے علاوہ سرکاری تارہ، بھٹولہ، اینامسر، گدرا، مونا باؤ، سندرا اور میاجلار بڑی چوکیاں ہیں۔ مونا باؤ ایک ریلوے سٹیشن ہے جس پر ہمارا قبضہ تھا۔

۸ ستمبر کی صبح بھارتیوں نے ہمارے علاقے میں گدرا پر ایک پلٹن اور

ٹینکوں سے حملہ کر دیا۔ وہاں رائفل بردار رینجر تھے جو ٹینکوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور پیچھے ہٹ آئے۔ اسی طرح بھارتیوں نے کئی ایک سرحدی دیہات پر قبضہ کر کے دیہاتیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور ان کے مویشیوں اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔ اِدھر خبر پہنچی تو حُر میدان میں کود آئے۔ انہوں نے غیر فوجی اور غیر منظم انداز سے جوابی حملہ کیا اور بھارتیوں کے قبضے سے ایک دو گاؤں چھڑا لیے۔ یہیں سے ڈیزرٹ فورس (صحرائی فوج) نے جنم لیا۔ رینجرز اور حُروں کو اکٹھا کر کے صحرائی فوج بنائی گئی جس کی کمان بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) خداداد خان کو دے دی گئی۔

اِدھر کھوکھرا پار کے علاقے میں بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) خواجہ اظہر خان کا بریگیڈ تھا جس میں صرف دو پلٹنیں تھیں۔ یہ دونوں پلٹنیں رن کچھ میں لڑ چکی تھیں۔ اس لیے صحرائی لڑائی کے رموز سے آگاہ تھیں۔ جب دشمن کھوکھرا پار پر حملے کے لیے بڑھ رہا تھا، یہ پلٹنیں دفاعی پوزیشنوں میں جا رہی تھیں۔ انہوں نے دفاع میں آتے ہی دشمن کا حملہ روکا اور کھیم کرن کی طرح جوابی حملہ کر دیا۔ ان کے سامنے، بھارتی علاقے میں چھ میل اندر مونا باؤ ریلوے سٹیشن تھا۔ ہماری پلٹنوں نے ۹ ستمبر کی شام مارٹر گنوں کی گولہ باری کی اور علی الصبح حملہ کر دیا۔

دشمن کو توقع نہیں تھی کہ ان پر حملہ بھی ہوگا، کیونکہ انہیں بتایا گیا کہ تم مزاحمت کے بغیر حیدر آباد تک پہنچ جاؤ گے۔ ان پر حملہ ہوا تو وہ اس انداز سے پسپا ہوئے کہ مارٹر گنوں کا بے شمار ایمونیشن پیچھے چھوڑ گئے۔ مونا باؤ کا ریلوے سٹیشن اور دیگر علاقہ ہمارے قبضے میں آگیا۔

۱۲ ستمبر کے روز جنرل خواجہ اظہر خان کی دو پلٹنوں نے پنج شیلا کے مقام پر حملہ کیا۔ بھارتیوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مونا باؤ کے صدمے سے سنبھل گئے ہیں لیکن فرنٹیئر فورس اور پنجاب رجمنٹ کی بے جگری کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ وہ بہت سی لاشیں، جو بیس قیدی، راشن، ایمونیشن اور شراب کا ذخیرہ

پیچھے چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔

۱۵ ستمبر: پنجاب رجمنٹ کی صرف ایک کمپنی نے شکر بُو کے مقام پر حملہ کیا۔ یہ حملہ اس قدر تیز تھا کہ دست بدست معرکے تک نوبت آ گئی۔ لیکن بھارتی سپاہی پاکستانی سنگینوں کا مقابلہ کرنے سے پہلے ہی پوزیشنیں چھوڑ گئے۔ پوزیشنوں میں وہی بھارتی رہے جو مرے ہوئے یا شدید زخمی تھے۔ آگے ایک اور مقام کھارن چوکی تھا۔ دن کے تیسرے پہر پاکستانیوں نے وہاں حملہ کیا مگر ان کا ایمونیشن محض ضائع ہوا کیونکہ بھارتی بغیر مقابلے کے چوکی خالی کر گئے۔ وہاں بھی راشن، ایمونیشن اور شراب کا ذخیرہ پڑا ہوا ملا۔ بھارتی ہماری ان دو پلٹنوں کو سپلائی سے بے نیاز کر گئے تھے۔

معلوم نہیں بھارتیوں کو کس نے بتا دیا کہ جنگ اس طرح بھاگ بھاگ کر نہیں لڑی جاتی۔ چنانچہ شام کو انہوں نے ٹینکوں کی مدد سے حملہ کر دیا۔ ہماری دو آر آر (ٹینک شکن گنوں) نے صرف ایک ایک گولہ داغ کر دو ٹینک تباہ کر دیے۔ بھارتیوں کا موڈ اسی سے خراب ہو گیا اور پندرہ منٹ غیر دلچسپ سی گولہ باری کر کے واپس چلے گئے لیکن لاشوں کے علاوہ سامان بہت چھوڑ گئے۔ اس کے بعد روہیری کے مقام کو بھی قبضے میں لے لیا گیا۔ یہاں حُروں کو بھی ساتھ ملا لیا گیا۔ وہ صحرا کے ماہر کھوجی ہونے کی وجہ سے دشمن کے علاقے کی خبریں لے آتے تھے۔ جب فائر بندی کا وقت قریب آنے لگا تو بھارتیوں نے جوابی حملے شروع کر دیے جو انہیں بہت مہنگے پڑے۔

راجستھان کا دوسرا پہلو — صحرائی فوج

دوسری طرف صحرائی فوج لڑ رہی تھی۔ اُس طرف بھارتی سات آٹھ میل سرحد کے اندر آ گئے تھے۔ صحرائی فوج میکانکی سہولتوں اور بڑے ہتھیاروں سے محروم تھی۔ اس کے پاس دو چار لائٹ مشین گنیں، گرینیڈ اور رائفلیں تھیں۔ اس کے برعکس دشمن کو توپ خانے اور ٹینکوں کی مدد حاصل تھی۔ کراچی جانے

والی سڑک اور ریلوے لائن کی حفاظت اسی فورس کے ذمے تھی۔ اس فرض کو یہ فورس صرف اس طرح خوش اسلوبی سے ادا کر سکتی تھی کہ دشمن کو سرحد سے دور رکھے۔ چنانچہ اس فورس کے کمانڈر جنرل خداداد خان (جو اس وقت بریگیڈیئر تھے) نے ۷ ستمبر لیفٹیننٹ کرنل آفتاب علی کی قیادت میں جیسلمیر کی طرف ایک دستہ بھیجا۔ انہیں کچھ جیپیں دے دی گئی تھیں۔ لیکن راستہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ اصل مقام تک صرف کرنل آفتاب علی کی جیپ پہنچ سکی۔ یہ حملہ نہ ہو سکا۔

۸ ستمبر کو دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے پوچینا کی طرف ایک دستہ بھیج دیا گیا۔ بھارتی دھوکے میں آ گئے اور میاجلر جیسے اہم مقام کو چھوڑ آئے۔ صحرائی فوج نے میاجلر پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ فائر بندی تک صحرائی فوج نے چند اور چوکیاں دشمن سے لے لیں اور اس طرح یہ بے مایہ سے دستے دشمن کی سرحد کے اندر اٹھائیس میل تک چلے گئے۔

۱۸ ستمبر: بھارتیوں نے مارٹروں اور توپوں کی مدد سے ایک پاکستانی چوکی پر حملہ کیا۔ یہ معرکہ ساری رات جاری رہا۔ صبح دشمن پسپا ہو گیا۔ صحرائی فوج کے اس دستے نے دشمن کا تعاقب کیا اور اس کی چوکی سرکاری تارہ پر قبضہ کر لیا۔ دشمن بہت سے اسلحہ بارود کے علاوہ پکا پکایا کھانا بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ صحرائی جنگ میں گھیرے میں آنے کا خطرہ ہر لحظہ رہتا تھا کیونکہ صحرا بہت وسیع تھا جسے فائر کی زد میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔

۱۹ اور ۲۰ ستمبر تک صحرائی فوج نے ان تمام تر دشواریوں کے باوجود دشمن کے ان اہم قلعوں اور چوکیوں پر قبضہ کیا — شاہ گڑھ، قلعہ گھٹارو، لونگانیوالہ، ایئر فیلڈ، دھرمی کھوہ، بھیٹے والا، رائے چند والا اور سانچو — ان معرکوں میں دشمن بے شمار اسلحہ اور راشن وغیرہ پیچھے چھوڑ گیا۔

فائر بندی ہوئی تو پیش قدمی روک دی گئی۔ یہ واحد محاذ ہے جہاں پاکستانی اتنی دور دشمن کے علاقے میں چلے گئے تھے۔ چنانچہ بھارتیوں نے اس

سیکٹر میں فائر بندی کا ذرہ بھر احترام نہ کیا بلکہ بہے گرینیڈیئرز اور سکھ لائٹ انفنٹری
جیسی چنی ہوئی پلٹنیں منگا کر بڑے حملے شروع کر دیے۔ بھارت کے اعتبار تو
ابھی تک کر رہے تھے کہ سندھ کے ایک بڑے شہر پر قبضہ ہے مگر وہ راجپوتانہ
کے لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے چنانچہ انہوں نے ایک ماؤنٹین
بریگیڈ اور توپ خانے سے ۲۲ ستمبر کے روز اچھری ٹوبہ پر حملہ کر دیا جو پسپا کر
دیا گیا۔

۲۶ ستمبر کے روز انہوں نے اسی قوت کا ایک حملہ سرکاری تارہ پر کیا۔
وہ بھی پسپا کر دیا گیا۔

۳۰ ستمبر کے روز بھارت کے ایک دو افسر اور بہت سے سپاہی سانچو چوکی
میں آئے اور التجا کی کہ انہیں پانی کی ضرورت ہے۔ وہاں صحرائی فوج کی
صرف ایک کمپنی تھی۔ مسلمانوں نے اپنی روایت کے مطابق انہیں کہا کہ پانی
لے جاؤ۔ پانی پر ہمارا قبضہ تھا۔ پانی کے بہانے ہندوؤں نے اپنی فوج بلا لی اور
صحرائی فوج کی کمپنی کو دھوکے سے چوکی سے باہر کیا اور مورچے سنبھال لیے۔

۳۱ ستمبر بھارتیوں نے ایک اور چوکی رنہال پر حملہ کیا۔ وہاں صحرائی فوج
کے ایک دستے کے علاوہ بہاولپور کے نواب کی باڈی گارڈ بھی تھی جس کے
کمانڈر نواب کے بیٹے شہزادہ عباس تھے انہوں نے خوب مقابلہ کیا بھارتیوں
کو بے شمار نقصان اٹھانا پڑا۔

یکم اکتوبر کو جنرل خداداد اقوام متحدہ کے مبصروں کو آگے لے گئے وہاں
بھارت کے ہر قلعے اور چوکی پر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ان مبصروں نے
تسلیم کیا اور بھارتیوں کو بھی سمجھایا کہ یہ مقامات پاکستانیوں کے قبضے میں ہیں
جو تمہیں کسی معاہدے کے بعد ہی واپس ملیں گے۔ اس کے باوجود اگلے
ہی روز یعنی ۲ اکتوبر کو بھارتیوں نے توپ خانے کی بے پناہ گولہ باری کے
بعد رائے چند والا اور ملیر پر پیادہ پلٹنوں سے حملہ کر دیا۔ وہاں اپنی نفری

تھوڑی تھی جس نے مقابلہ تو بہت کیا لیکن توپوں اور مارٹروں کی گولہ باری
کے سامنے جم نہ سکے اور دونوں چوکیاں چھوڑ آئے۔

۱۲ اور ۱۳ اکتوبر کے روز بھارتیوں نے توپ خانے اور طیاروں
سے قلعہ گھٹارو پر بھرپور حملہ کیا۔ یہ قلعہ بھارت کے علاقے میں سرحد سے سولہ
میل اندر ہے۔ وہاں چند ایک حُر اور صحرائی فوج کی دو پلاٹونیں یعنی ساٹھ ستر
جوان تھے۔ انہوں نے دشمن کو رائفلوں کے بچے تلے فائر سے قلعے کے قریب
نہ آنے دیا۔ توپوں کا وہ کچھ نہ بگاڑ سکے۔ ان کے پاس نہ توپ تھی نہ مارٹر گن۔ دشمن
نے ان کے لیے کمک کے راستے بھی بند کر دیے تھے۔ اسی وقت دشمن نے شاہ گڑھ
اور لونگا نیوالا پر بھی حملہ کر دیا۔ صورتِ حال بہت نازک اور خطرناک تھی۔ کمک
بھیجی گئی جسے بھارتی پلٹن نے راستے میں روک لیا اور وہاں خونریز معرکہ ہوا۔
اس کے باوجود بھارتی قلعہ نہ لے سکے۔ انہوں نے آر آر (ٹینک شکن) گنوں کے
گولے قلعے کی دیواروں میں فائر کیے لیکن مٹی کی چوڑی دیواروں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔
آخر حُر کسی طرح قلعے سے نکل گئے اور بھارتیوں کے عقب میں چلے گئے اور ایک
قسم کی گوریلا جنگ لڑنے لگے۔ اس کارروائی نے بھارتیوں کے پاؤں اکھاڑ دیے اور
وہ کئی قیدی چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔

جنرل خداداد خان نے یہ قیدی اس شرط پر ہندوؤں کو واپس کر دیے کہ وہ
آئندہ کہیں بھی حملہ نہیں کریں گے مگر بھارتیوں نے ۲۱ اکتوبر شاہ گڑھ کے قلعے پر
حملہ کر دیا۔ صحرائی فوج کے دستے نے جو قلعے کے اندر تھا، ۵ نومبر تک مقابلہ کیا۔
مگر دشمن نے ارد گرد بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں تاکہ قلعے کو ہم کمک نہ دے
سکیں۔ تمام راستے مسدود ہونے کی وجہ سے کمک نہ جا سکی۔ آخر صحرائی فوج کے
اس دستے کو قلعے سے دست بردار ہونا پڑا۔

اقوام متحدہ کے مبصروں کو رپورٹ دی گئی۔ ان کے سربراہ جنرل بروس
میکڈانلڈ نے ذاتی طور پر مداخلت کی۔ آخر اس نے جھنجلا کر کہا ”ہندوستانیوں

کو معاہدوں اور اخلاقیات پر لیکچر دینا بے کار ہے۔ یہ لوگ بے اصول ہیں" اور وہ واپس چلا گیا۔

۶ نومبر کی رات بھارتیوں نے سادھے والا اور لونگا نیوالا پر بے تحاشہ گولہ باری شروع کر دی پھر بھاری قوت سے حملہ کر دیا۔ اسی وقت انہوں نے اسی شدت سے قلعہ گھٹارو پر حملہ کیا۔ یہ حملہ تو پسپا کر دیا گیا لیکن سادھے والا اور لونگا نیوالا سے ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا۔

اس وقت جنرل خداداد خان نے ہائی کمان سے اجازت لی کہ ہمیں بھی ایک حملہ کرنے کی اجازت دی جائے ورنہ بھارتی ہمیں یہاں ٹکنے نہیں دیں گے۔ انہیں اجازت دے دی گئی۔

یکم اور ۲ دسمبر کی رات حملے کی تیاری کی گئی۔ صحرائی فوج کو چھ مارٹر گنیں بھی مل گئیں۔ آگے دشمن کا پورا بریگیڈ تھا۔ علی الصبح ہمارے صحرائی جانبازوں نے مارٹر گنوں کے فائر سے دشمن کے بریگیڈ پر حملہ کر دیا۔ صبح کے دس بجے تک دشمن اکھڑنے لگا اور پسپا ہونے لگا۔ لیکن حُر اس کے عقب میں چلے گئے اور گھات لگا لگا کر پسپا ہوتے بھارتیوں کو مارا۔ ایک جیپ میں پانچ بھارتی افسر بھاگے جا رہے تھے۔ حُروں نے پانچوں کو مار ڈالا۔

دشمن کا بریگیڈ صحرا کی وسعت اور ریتلی ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک گیا۔ بے شمار سپاہی بھاگ بھاگ کر پیاس سے مر گئے۔ یہ معرکہ دشمن کے علاقہ میں اٹھائیس میل اندر لڑا گیا۔ دشمن کا یہ حشر ہوا کہ وہ اپنی لاشیں بھی نہ لے جا سکا۔ اس کے بعد بھارتیوں کو کسی بھی مقام پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

سلیمانکی

سلیمانکی ایک اور مقام تھا جسے دشمن پاکستان میں داخل ہونے کے لیے استعمال کر سکتا تھا لیکن اس نے اسے ایک ضمنی محاذ بنایا تھا تاکہ لاہور کا دفاع بکھر جائے۔

وہاں پاک فوج کا صرف ایک بریگیڈ پوزیشن میں موجود تھا جس کی کمان بریگیڈیئر محمد اکبر خان کے ہاتھ تھی۔ اس بریگیڈ کے ساتھ ٹینک نہیں تھے اور ان کے مقابلے میں بھارتی بریگیڈ گروپ تھا جس کے ساتھ ٹینک رجمنٹ بھی تھی۔

جب اس پاکستانی بریگیڈ کو اطلاع ملی کہ لاہور پر دشمن نے حملہ کر دیا ہے تو اس نے سلیمانکی پر حملے کا انتظار کیے بغیر سرحد پار جا کر دشمن پر حملے میں پہل کرنے کی سکیم بنالی۔ شام چھ بجے پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی نے رینجرز کی ایک پلاٹون کو ساتھ ملا کر سرحد پار صادقہ کے مقام پر دشمن کی پوزیشن پر حملہ کر دیا۔ بھارتیوں نے تمام تر ہتھیاروں سے گولیوں اور گولوں کی بارش برسادی لیکن جو جانباز حملہ کرنے گئے تھے وہ کسی سکیم کے مطابق اور ترتیب سے گئے تھے۔ انہوں نے دباؤ برقرار رکھا۔ یہ حملہ کامیاب رہا اور دشمن لاشیں اور چند ایک قیدی مورچوں میں چھوڑ کر پسپا ہو گیا۔

بھارتیوں کا دوسرا اہم اور مضبوط مورچہ جھنگڑ کے مقام پر تھا۔ اس پر قبضہ کرنا بھی ضروری تھا۔ ورنہ وہاں سے حملہ آنے کا خطرہ تھا۔ ہمارے بریگیڈ کی پنجاب رجمنٹ کی صرف ایک کمپنی نے جھنگڑ کے مورچوں پر حملہ کیا۔ وہاں بھارتیوں نے صادقہ والی پسپائی کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ جم کر لڑے۔ پاک فوج کے جوانوں نے "یا علیؓ" اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگا کر ہلہ بول دیا۔ بھارتی دست بدست جنگ کے لیے ڈٹ گئے۔ پہلے تو گرینیڈوں کی جنگ ہوئی۔ بھارتی خوب مقابلہ کر رہے تھے۔ آخر کار پاکستانیوں نے سنگینوں سے "چارج" کر دیا اور ان کے مورچوں میں کود گئے۔

سنگین بازی میں ہندو مسلمان کا مقابلہ کم ہی کر سکتا ہے۔ قریب اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ بھارتی مورچوں سے نکل کر بھٹے کی طرف بھاگے۔ ان پر گرینیڈ پھینکے گئے۔ جو مورچوں سے پیچھے بھاگے انہیں سٹین گنوں اور گرینیڈوں سے ختم کیا گیا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا جس نے بعض بھارتیوں کو پناہ میں لے لیا۔

صرف تین قیدی ہاتھ آئے۔ باقی زیادہ تر مارے گئے۔

اگلے ہی روز بھارتیوں کا ایک اور مورچہ جو نور محمد گاؤں کے قریب تھا وہ بھی اسی طرح کے جانبازانہ معرکے سے اکھاڑ دیا گیا۔ پیش قدمی جاری رکھی گئی۔ پیچھے سے اپنا توپ خانہ حفاظتی فائر دے رہا تھا۔ ہمارے پیادہ جوانوں کی پیش قدمی اس قدر تیز تھی کہ ہراول کے دستے اپنے توپ خانے کی گولہ باری میں جا پہنچے۔ بٹالین کمانڈر نے بروقت اگلے دستوں کو روک لیا اور گولہ باری رکوائی ورنہ اپنے جوان اپنے ہی فائر سے ضائع ہو جاتے۔ وہ اب جھنگڑ، صادقہ اور نور محمد سے آگے ایک اور گاؤں، پکّا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رات کے دس بج رہے تھے جب ایک اور پنجاب رجمنٹ پندرہ سولہ میل دور سے آکر اس بریگیڈ میں شامل ہوئی۔ آرام کیے بغیر وہ اس حملے میں شریک ہو گئی۔ پکّا گاؤں تک پہنچنے کے لیے ایک جھیل میں سے گذرنا تھا۔ ایک تو راستے میں یہ جھیل حائل تھی، دوسرے دشمن توپوں، مارٹروں اور مشین گنوں کا فائر کر رہا تھا۔ ان دونوں دشواریوں کو جذبے نے سہل کر دیا۔ جوان جھیل میں اتر گئے۔ انہیں حفاظتی فائر دیا گیا۔ جھیل کو صرف پار کر جانا ہی دشمن کے لیے حیران کن تھا۔ جب اندھیرے میں اس کے مورچے پر حملہ ہوا تو دشمن پسپا ہو گیا۔

۶ ستمبر کی رات گذر گئی۔ ۷ ستمبر کے روز ہمارا بریگیڈ بھارتیوں سے چھینے ہوئے مورچوں کو درست کرنے لگا تو بھارتیوں نے پورے غیظ و غضب سے جوابی حملہ کر دیا۔ انہیں ایسا ہی حملہ کرنا چاہیے تھا۔ پاکستانی دستوں کے مورچے ابھی لڑنے کے لیے موزوں نہیں تھے نہ سیکشنوں وغیرہ کو طریقے سے ڈیپلائے کیا جا سکا تھا۔ تاہم جوان مقابلے میں جم گئے۔ دشمن نے توپ خانے کی گولہ باری اور تیز کر دی، مگر ہمارے جوان برداشت کرتے رہے اور سارا دن دشمن کو روکے رکھا حالانکہ وہ کل مسلسل حملے کرتے کرتے نڈھال ہو چکے تھے۔

رات بھارت کی ایک پلٹن نے ہماری ایک کمپنی کی پوزیشن پر حملہ کر دیا۔ یہ بھارتیوں کی قوت اور حملے کی شدت میں اضافہ تھا۔ اس نئی بھارتی پلٹن

میں زیادہ تر سکھ تھے۔ ہماری جس کمپنی پر سکھوں نے حملہ کیا تھا، اس نے ایک گولی بھی فائر نہ کی۔ سکھ بڑھے چلے آئے۔ جب وہ ہماری پوزیشنوں کے علاقے میں آ گئے تو انہوں نے "ست سری اکال" کا نعرہ لگا کر روشنی راؤنڈ فائر کر دیے جو ان کے ہیڈ کوارٹر کے لیے اشارہ تھا کہ انہوں نے مورچہ لے لیا ہے۔ روشنی راؤنڈوں سے ایک ایک سکھ نظر آ گیا۔ پاکستانیوں نے ان پر فائر کھول دیا اور گرنیڈوں کا مینہ برسا دیا۔ سکھ اور ان کے ہندو ساتھی بے طرح مرنے لگے۔ ان کی چیخ و پکار اور گالیوں سے رات دہل رہی تھی۔ شاید ہی کوئی سکھ یا ہندو زندہ واپس نکلا ہو۔

بھارت نے اس محاذ پر ایک اور بریگیڈ (۶۷، انفنٹری) بھیج دیا لیکن جوابی حملے کی ہمت نہ کی۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ بھارت نے تو ایک اور تازہ دم بریگیڈ بھیج دیا۔ اس کے جواب میں پاک فوج نے اپنی ایک پلٹن واپس بلا کر اس کی جگہ ایک ایسی پلٹن بھیج دی جس میں پنشنز اور ریٹائرڈ فوجی تھے اور جو بوڑھے تھے۔ ان بوڑھوں نے مورچوں میں جاتے ہی دشمن کی قریبی پوزیشنوں کو با آواز بلند کہا: "ہندوستانیو! پہلے تم ہمارے بچوں سے لڑتے رہے ہو۔ اب سنبھل جاؤ، ان کے باپ مورچوں میں آ گئے ہیں"۔

فائر بندی تک ہمارے بریگیڈ اور ان باپوں نے دشمن کے تیس گاؤں قبضے میں لے لیے۔

یہاں بھی فائر بندی کے بعد بھارتیوں کو اپنی ناک رکھنے کا مسئلہ پیش آ گیا۔ انہوں نے اپنے ایک گاؤں پر ہمارے دستوں کے قبضے کو متنازعہ قرار دے کر خبرداری کا نوٹس بھیجا کہ اگر نصف گھنٹے تک گاؤں سے تم نے مورچے نہ ہٹائے تو ہم حملہ کر دیں گے۔ ہمارے بریگیڈ کمانڈر نے کہا کہ ابھی آ جاؤ، گاؤں سے مورچے نہیں ہٹیں گے۔

۲۵ ستمبر کے روز دشمن نے نمبر ۹ گورکھا رجمنٹ سے بھرپور حملہ کر دیا۔ گورکھوں

نے اعلان کیا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا اس گاؤں میں جا کر کھائیں گے۔ گورکھوں نے فی الواقع شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہمارے مورچوں کے عقب میں آگئے مگر گورکھوں کا حشر یہ ہوا کہ پوری کی پوری رجمنٹ صاف کر دی گئی۔ صرف دو سو پچاس گورکھے زندہ رہے جنہیں جنگی قیدی بنا لیا گیا۔

بھارت کا ایک بریگیڈیئر سامنے آیا اور اس نے بریگیڈیئر اکبر خان سے معافی مانگی کیونکہ ہمارے جوان اس معرکے کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گورکھوں کو ختم کرکے وہ دشمن کی دوسری پوزیشنوں پر حملہ کر رہے تھے۔ آخر بھارتی بریگیڈیئر کی التجا پر فائر روک لیا گیا اور بھارتی دُور پرے چین سے بیٹھ گئے۔

پاک فضائیہ کے شاہین

بھارت کو اپنے ہوائی بیڑے پر اتنا ہی ناز تھا جتنا بکتر بند ڈویژن پر تھا۔ اس کے پاس دیس دیس کے طیارے تھے۔ اور سب سے زیادہ ناز تو بھارت کو روس کے مِگ طیاروں پر تھا۔ مِگ ۲۱ وہ لڑاکا طیارہ ہے جس نے کوریا کی فضا میں امریکی ہوائی بیڑے کے چھکّے چھڑا دیئے تھے۔ پاکستان پر حملے سے ایک دو روز پہلے بھارت نے ان طیاروں کو وزیر آباد اور گوجرانوالہ پر اڑا کر پاکستانیوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی۔

بھارت کی ایئر فورس کے مقابلے میں پاک فضائیہ کی حیثیت فلائنگ کلب سے زیادہ نہ تھی۔ جس کے پاس فضا میں لڑنے کے لیے پرانی قسم کے سیبر طیارے تھے اور وہ بھی انڈین ایئر فورس کے لڑاکا طیاروں کا ایک جزو تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی ہر شاہباز کو سورہ الانفال کی اس آیت کی ایک ایک نقل دے دی گئی تھی جس میں خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے —— "اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہیں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آئیں گے ..... اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہے"۔ —— یہ آیت ہر شاہباز کی جیب میں تھی۔

یکم ستمبر۔ چھمب جوڑیاں کی فضا میں بھارت نے پہلی بار اپنے ہوائی بیڑے کا جنگی مظاہرہ کیا اور کھل کر کیا۔ اس نے چار مسٹیئر اور دو کینبرا طیارے پاک فوج کی پیش قدمی روکنے کے لیے بھیجے۔ اِدھر سے صرف دو شاہباز گئے۔ زمین و آسمان دم بخود تھے کہ یہ دو سیبر طیارے کتنی دیر تک فضا میں نظر آئیں گے لیکن فلک نے دیکھا اور زمین پر کٹتی دونوں فوجوں نے دیکھا کہ چار مسٹیئر شاہبازوں کے ہاتھوں فضا میں پھٹے اور دونوں کینبرا طیارے ایک بھی گولی چلائے بغیر بھاگ گئے۔ ان دو شاہبازوں نے پاک فضائیہ کے لیے شجاعت اور فضائی معرکہ لڑنے کا معیار قائم کر دیا۔ اس معرکے کا اثر پاک فوج پر نہایت خوشگوار پڑا۔ جوانوں کے حوصلے اور بڑھ گئے اور وہ اپنے آپ کو فضائی خطروں سے محفوظ سمجھنے لگے۔

۲ ستمبر کو جب دشمن جوڑیاں کو بچانے کے لیے جم کر لڑ رہا تھا، پاک فضائیہ کی مدد بلائی گئی۔ پاک فضائیہ نے یکے بعد دیگرے دو پروازیں بھیجیں۔ ایک کے قائد سکواڈرن لیڈر محمد محمود عالم تھے جن کی کینوپی زمینی فائر سے چکنا چور ہو گئی۔ جیٹ طیارے کی کینوپی کا فضا میں ٹوٹ جانا، بہت خطرناک ہوتا ہے لیکن عالم نے اس نقصان اور خطرے کے باوجود دشمن کی کئی توپیں اڑائیں۔

دوسری پرواز کے شاہبازوں نے اکھنور سے آتے ہوئے ٹینکوں اور بے شمار گاڑیوں کو تباہ کرکے جوڑیاں کے بھارتی مورچوں کی کمک روک دی۔

۳ ستمبر۔ دشمن کے چھ نیٹ طیارے چھمب جوڑیاں کے محاذ پر آئے۔ ہمارے دو سٹار فائٹر (ایف ۱۰۴) پہنچ گئے جنہیں دیکھتے ہی بھارتی ہوا باز بکھر کر بھاگے لیکن ایک کو اپنے اڈے کا رُخ بھی یاد نہ رہا۔ اسے شاہبازوں نے گھیر لیا اور پسرور لا اتارا۔

یہ نیٹ طیارے دراصل پاک فضائیہ کے فلائٹ لیفٹیننٹ یوسف علی خان اور فلائنگ آفیسر خالق کے ساتھ جو پہلے ہی فضا میں موجود تھے، معرکے میں اُلجھ چکے تھے جس میں فلائٹ لیفٹیننٹ یوسف کا طیارہ شدید چوٹیں کھا چکا تھا۔ پھر بھی وہ لڑ

رہا تھا۔ اتنے میں سٹار فائٹر پہنچ گئے اور ویمپائر بکھر کر بھاگ گئے مگر سکواڈرن لیڈر
برج پال سنگھ نہ بھاگ سکا۔

۴ اور ۵ ستمبر کو بھی فضائیہ نے چھمب جوڑیاں کی پیش قدمی کی رفتار تیز کرنے
کے لیے متعدد پروازیں بھیجیں۔

۶ ستمبر۔ پاک فضائیہ کے لیے کڑی آزمائش کا دن تھا۔ دونوں ملکوں کی
کھلی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ اب پاک فضائیہ کے سامنے چار کام تھے ـــ دشمن
کے ہوائی حملوں کو روکنا، دشمن کے اڈوں پر ہوائی حملے کرنا، پاک فوج کو مدد دینا اور
گشتی پروازیں کرنا ـــــ بظاہر ناممکن تھا کہ پاک فضائیہ یہ سارے مشن سنبھال سکے
گی۔ شاہبازوں کے پاس ایمان کی قوت اور حب الوطنی کا جذبہ تھا یا اللہ کا وہ
فرمان ان کے حوصلے بڑھا رہا تھا جو انہوں نے جیبوں میں ڈال رکھا تھا۔ ورنہ طیاروں
کی تعداد مایوس کن تھی۔

دشمن نے فضائی حملے کی ابتدا راہوالی، دھونکل اور گکھڑ ریلوے سٹیشنوں پر
کھڑی ریل گاڑیوں پر بمباری اور فائرنگ سے کی جس سے ایک مسافر گاڑی کے کئی
مسافر شہید اور زخمی ہو گئے۔ ہمارے دو شاہباز فلائٹ لیفٹیننٹ آفتاب عالم خان
اور فلائٹ لیفٹیننٹ امجد خان چھمب جوڑیاں کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں واپس
وزیر آباد کی فضا میں آنے کو کہا گیا۔ انہوں نے بروقت پہنچ کر ایک مسٹیر کو فضا
میں ختم کر دیا اور باقی بھاگ گئے۔

لاہور سیکٹر میں بری فوج کو پاک فضائیہ کی شدید ضرورت تھی لیکن ڈویژن
کمانڈر فضائیہ کی قوت کی کمی کو دیکھتے ہوئے توپخانے سے کام لے رہا تھا۔ آخر مجبور
ہو کر پاک فضائیہ کو بلایا گیا۔ جنرل سرفراز خان کے الفاظ میں "پاک فضائیہ کے طیارے
اس قدر جلدی پہنچے جیسے پہلے ہی فضا میں موجود تھے" ـــــ انہوں نے آتے ہی
بھارتی حملہ آوروں میں تباہی بپا کر دی۔ اس کے بعد ایک اور پھر ایک اور پرواز
بھیجی گئی۔ ایک پرواز نے دشمن کے عقب میں جا کر ٹینک اور گاڑیاں تباہ کیں۔
امرتسر سے ہزاروں سکھوں اور ہندوؤں کا قافلہ، سکوٹروں، سائیکلوں، کاروں

اور بسوں میں اور پا پیادہ بھی لاہور کو لوٹنے کے لیے آ رہا تھا۔ شاہباز ٹینکوں اور
گاڑیوں سے فارغ ہو کر اس عجیب و غریب فوج پر جھپٹ پڑے اور لاہور کو
لوٹنے والے نہ لاہور پہنچ سکے نہ امرتسر واپس جا سکے۔

اس روز شام سے پہلے پہلے پٹھانکوٹ پر حملہ کیا گیا جہاں چودہ طیارے
جن میں پوری مگ فورس شامل تھی، تباہ کیے گئے۔ اسی شام ایک حملہ ہلواڑہ کے
ہوائی اڈے پر بھیجا لیکن انڈین ایئر فورس کے ہنٹر طیاروں کا ایک غول ان پر
ٹوٹ پڑا۔ فضا میں تین اور دس کا خونریز معرکہ ہوا جس میں سکواڈرن لیڈر رفیقی
اور فلائٹ لیفٹیننٹ یونس حسن شہید ہو گئے۔ صرف فلائٹ لیفٹیننٹ سیسل چوہدری
واپس آیا لیکن ان تین شاہبازوں نے دشمن کے چھ ہنٹر مار لیے تھے۔

اسی شام پاک فضائیہ کی ایک پرواز آدم پور بھیجی گئی، جہاں زمین سے طیارہ شکن
توپوں اور فضا میں ہنٹر طیاروں نے ہمارے شاہبازوں کا حملہ روکنے کی پوری
کوشش کی۔ ہمارے شاہباز تین طیاروں کو مار آئے۔

پاک فضائیہ کے بمباروں نے شام پانچ بجے سے ہی جام نگر کے ہوائی اڈے
پر بمباری شروع کر دی۔ تیسری پرواز آدھی رات کے بعد گئی۔ جام نگر کا ہوائی
اڈہ ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ لیکن سکواڈرن لیڈر شبیر عالم صدیقی اور ان کا نیوی گیٹر
سکواڈرن لیڈر اسلم قریشی واپس نہ آ سکے۔

اسی رات بمبار طیارے (بی ۔ ۵۷) آدم پور پر بھی حملہ آور ہوئے اور
خوب تباہی مچائی۔ بمباروں کی ایک پرواز پٹھانکوٹ بھی بھیجی گئی تاکہ وہاں
کی رہی سہی کسر بھی پوری کر آئیں۔ یہی پرواز پٹھانکوٹ سے واپس آئی تو
اڈے سے بم اٹھا کر ہلواڑہ چلی گئی۔

انڈین ایئر فورس پہلے ہی دن بائیس لڑاکا بمبار طیاروں سے محروم
ہو گئی۔ بھارتی ہوابازوں نے کراچی اور راولپنڈی پر ہوائی حملے کیے اور
کسی بھی فوجی یا فضائی اڈے یا ٹھکانے کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

۷ ستمبر۔ انڈین ایئر فورس نے مشرقی پاکستان میں چاٹگام، جلیسور، لال منیر ہاٹ، رنگ پور، سٹاکہ گاؤں اور کرمی ٹولہ (ڈھاکہ) پر راکٹ اور بم گرائے۔ لیکن بے مقصد اور بغیر کسی نقصان کے۔ مشرقی پاکستان میں پاک فضائیہ کا صرف ایک سکواڈرن تھا۔ جونہی بھارتی طیارے واپس گئے، شاہباز اڈے سے اڑے اور کلائی کنڈہ کے اڈے پر جا جھپٹے۔ بھارتیوں نے اپنے اُن طیاروں کو نہایت قرینے سے کھڑا کر رکھا تھا جو مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے واپس آئے تھے۔ شاہبازوں نے تمام طیاروں کو زمین پر نذرِ آتش کر دیا۔

اسی اڈے پر ایک اور پرواز بھیجی گئی۔ اب انڈین ایئر فورس کے بارہ ہنٹر فضا میں موجود تھے۔ اس روز ہمارا ایک شاہباز فلائنگ آفیسر افضال شہید ہوا اور دشمن ۱۴ کینبرا اور ۲ ہنٹر طیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

۷ ستمبر۔ دشمن نے پاک فضائیہ کے تاریخی اڈے سرگودھا کی طرف بھرپور توجہ دی اور لڑاکا بمبار طیاروں کو غول در غول بھیجا۔ ان میں سے چار مسٹیر زمینی توپچیوں نے گرا لیے۔ ایک ایف ۱۰۴ سے ایک شاہباز نے گرایا اور پانچ سکواڈرن لیڈر محمود عالم نے صرف تیس سیکنڈ کے عرصے میں گرائے۔ اس روز کے بعد انڈین ایئر فورس نے دن کے وقت سرگودھا پر حملہ کرنے کی کبھی جرأت نہ کی۔

اس روز فاضلکا سیکٹر میں گشتی پرواز بھیجی گئی۔ چونڈہ، سیالکوٹ، جبڑ اور لاہور سیکٹر میں بھی بری فوج کی مدد کے لیے طیارے بھیجے گئے جنہوں نے متعدد ٹینک اور گاڑیاں تباہ کیں

کشمیر کے ہوائی اڈے سری نگر پر بھی پاک فضائیہ نے حملے کیے جہاں تین باربردار طیارے تباہ کیے۔ رات ہلواڑہ اور جودھ پور پر بمباروں نے کئی حملے کیے۔

پہلے دو دنوں میں انڈین ایئر فورس کو ساٹھ طیاروں سے محروم کیا گیا۔

۸ ستمبر۔ جب بھارت نے بکتر بند ڈویژن سے چونڈہ سیالکوٹ پر حملہ کیا تو یہ پاکستانی شاہبازوں کے لیے کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ اس روز انہوں نے کم و بیش بیس پروازیں صرف چونڈہ سیالکوٹ سیکٹر پر بھیجیں۔ انہوں نے درختوں کی بلندیوں تک اُڑ اُڑ کر ٹینک اور گاڑیاں تباہ کیں ورنہ لوہے اور آگ کے اس سیلاب کو روکنا آسان نہ تھا۔

اتنی زیادہ مصروفیت اور جنگی سرگرمیوں کے باوجود دوسرے محاذوں کو فراموش نہ کیا گیا۔ ایک پرواز کھیم کرن گئی جہاں ایک بھارتی طیارہ گرایا گیا۔ اس کا ہوا باز ہمارے علاقے میں پیراشوٹ سے اتر آیا۔ جسے گرفتار کر لیا گیا۔

رات بمبار طیاروں نے جودھ پور ہوائی اڈے کا ستیاناس کیا۔

۹ ستمبر۔ بمبار طیاروں کو چونڈہ سیالکوٹ کے محاذ پر بھیجا گیا جہاں انہوں نے جموں کی طرف سے آنے والی دشمن کی کمک کو تباہ کیا۔

بمباری کے لیے ایک پرواز جودھ پور بھی گئی تاکہ بھارتیوں کو یہ اڈہ قابلِ استعمال بنانے کی فرصت نہ دی جائے۔

بھارتی ہوابازوں نے کینبرا بمباروں سے رسالہ والا، لائل پور، چک جھمرہ اور سرگودھا پر بمباری کی لیکن بم بکھر کر گرے۔

اس روز سیالکوٹ پانچ پروازیں، واہگہ دو، دو کھیم کرن اور نوگڈرد سیکٹر پر بھیجی گئیں۔ اس روز کا مجموعی شکار یہ تھا —— فوجی گاڑیاں ۴۵، ٹینک ۱۶ توپیں ۱۵ —— اور ایک مال بردار ریل گاڑی۔

رات آدم پور اور پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈوں پر پھر بمباری کی گئی۔ انڈین ایئر فورس کے لڑاکا طیاروں نے ہمارے بمباروں کا تعاقب کیا لیکن مایوس لوٹ گئے۔

۱۰ ستمبر کی سحر کے اندھیرے میں بھارتی ہوابازوں نے ایک بار پھر سرگودھا چک جھمرہ اور رسالہ والا پر بم ضائع کیے۔

ایک پرواز کھیم کرن بھیجی گئی جس نے بھارت کا ایک نیٹ طیارہ گرایا۔

امرتسر میں بھارتیوں نے ایک ریڈار نصب کر رکھا تھا جس کی حفاظت کے لیے بے شمار طیارہ شکن گنیں موجود تھیں۔ ریڈار چھاؤنی کی گنجان آبادی میں نصب کیا گیا تھا تاکہ پاکستانیوں کو شک بھی نہ گزرے کہ یہاں ریڈار ہو سکتا ہے۔ بہر حال اتنا معلوم ہو گیا کہ یہاں کہیں ریڈار ہے۔ پہلا حملہ ۱۲ سیبر اور دو ایف ۱۰۴ سے کیا گیا۔ ریڈار کا دفاع صرف مضبوط ہی نہیں بلکہ ظالم تھا۔ اس قدر زمینی گنیں تھیں جو آسمان کو آگ سے بھر دیتی تھیں۔ اپنے دو سیبر طیاروں کو چوٹیں پڑیں لیکن اڈے تک پہنچ گئے۔ ریڈار کو معمولی سا نقصان پہنچا۔

چونڈہ سیالکوٹ محاذ کو بھی مدد دی گئی اور چند ایک ٹینک اور گاڑیاں تباہ کی گئیں۔ دو پروازیں گڈر و کی طرف بھیجی گئیں جہاں ڈیڑھ درجن فوجی گاڑیاں اور ایک مال بردار گاڑی کے چار ڈبے تباہ کیے گئے۔

۱۰ ستمبر کے روز مشرقی پاکستان کے شاہبازوں نے مغربی بنگال کے ایک ہوائی اڈے باغ ڈوگرہ پر حملہ کیا جہاں ایک ہنٹر ایک ویمپائر، ایک ہیلی کاپٹر اور ایک بار بردار طیارے کو تباہ کیا۔

اس رات ہلواڑہ پر بھی بمباری کی گئی۔ اور اسی رات بمباروں نے چونڈہ کی فضا میں جا کر پاک فوج کو مدد دی اور دشمن کی اگلی پچھلی پوزیشنوں پر بمباری کی۔

۱۱ ستمبر کی سحر انڈین ایئر فورس نے چھ کینبرا طیاروں سے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر بمباری کی۔ تمام بم ہوائی اڈے سے دُور گرے۔

اس روز جو پروازیں چونڈہ سیکٹر کو بھیجی گئیں، انہیں خوب شکار ملا۔ ۱۴ ٹینک اور ۷۵ گاڑیاں الگ تباہ کیں۔ پھلورا کے قریب دشمن کی ایک ٹینک رجمنٹ ٹینکوں میں پٹرول ڈال رہی تھی۔ پٹرول سے لدی ہوئی گاڑیاں جمگھٹ کی صورت میں کھڑی تھیں۔ اس سے بہتر شکار کہاں مل سکتا تھا۔ شاہبازوں نے

نہ کوئی ٹینک سلامت چھوڑا نہ کوئی گاڑی۔ طیارہ شکن گنوں نے بہت آگ اگلی تھی مگر تو بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

لاہور سیکٹر کو بھی تین پروازوں سے مدد دی گئی۔ متعدد توپیں، ٹینک اور گاڑیاں تباہ کی گئیں۔

امرتسر کے ریڈار پر چند بار حملے کیے جا چکے تھے مگر کامیاب حملہ آج کیا گیا۔ ریڈار کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ پاک فضائیہ کا ایک شاہباز سکواڈرن لیڈر منیر الدین احمد شہید ہو گیا۔

سری نگر کے ہوائی اڈے کی طرف بھی توجہ دی گئی لیکن وہاں اقوامِ متحدہ کا ایک طیارہ کھڑا تھا اس لیے شاہبازوں نے حملہ نہ کیا۔ انہیں ایک اور شکار مل گیا۔ وہ گلمرگ کے قریب متعدد فوجی گاڑیاں تھیں جنہیں تباہ کیا گیا۔

رات کو ہلواڑہ اور پٹھانکوٹ پر بمباری کی گئی۔

۱۲ ستمبر شاہبازوں نے دشمن کے اس بکتر بند اور پیادہ لشکر کی سپلائی اور کمک کو پیچھے جا کر تباہ کیا جو چونڈہ سیالکوٹ پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہاں کم و بیش اڑھائی تین ہزار گاڑیاں اور ریلوں وغیرہ کا سامان تھا جسے بھسم کر دیا گیا۔

رات کو بھارتی ہوابازوں نے ملتان اور نواب شاہ پر بمباری کی جس کا مقصد بھارتی ہوابازوں کے سوا اور کسی کو سمجھ نہیں آ سکتا۔

اس روز لاہور اور کھیم کرن کے میدانوں میں خونریز معرکے لڑے جا رہے تھے۔ شاہبازوں کو مدد کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے دشمن کے اٹھارہ ٹینک اور ساٹھ گاڑیاں تباہ کرنے کے علاوہ دشمن کے مورچوں پر مشین گنوں سے فائرنگ کی۔

ڈالی کے مقام پر بھارت کے ایک بریگیڈ پر بھی شاہبازوں نے حملہ کیا اور خوب تباہی مچائی۔

اس سے دو روز پہلے تک انڈین ایئر فورس کا جو حشر ہو چکا تھا اس کا اعتراف

آل انڈیا ریڈیو سے بھارت کے ایک صحافی فرینک موریس نے ان الفاظ میں کیا
کہ انڈین ایئر فورس کا کمانڈر انچیف ہندوستانی فضا کی حفاظت کی ضمانت دینے
سے قاصر رہ گیا ہے۔ فرینک موریس نے فضائی معرکوں پر تبصرہ کرتے ہوئے
کہا کہ انڈین ایئر فورس نے پاکستان ایئر فورس کے ہاتھوں جو نقصان اٹھایا
ہے اسے پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔

رات کے وقت جودھ پور، پٹھانکوٹ اور جام نگر کے ہوائی اڈوں پر
بمباری کی گئی۔

۱۳ ستمبر کی رات دشمن کے کینبرا طیاروں نے سرگودھا پر بمباری کی مگر
اڈے کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اردگرد کے دیہاتیوں کو بہت قربانی دینی
پڑی۔

اس روز جو پروازیں چونڈہ گئیں ان کے شاہبازوں کو بہت دشواری
کا سامنا ہوا۔ نیچے بہت ہی قریبی معرکہ لڑا جا رہا تھا۔ گرد و غبار میں کچھ نظر نہ
آتا تھا اور اپنے پرائے کی بھی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ ایسے معرکوں میں اکثر ہواباز
اپنے ہی ٹینکوں اور مورچوں پر راکٹ مار دیتے ہیں اور توپچی اپنے ہی طیاروں
کو مار گراتے ہیں۔ لیکن شاہبازوں اور بری غازیوں کا آپس میں رابطہ ایسا
تھا کہ ایسا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ اس دشواری کے پیش نظر شاہبازوں نے دشمن
کے عقبی مورچوں اور سپلائی لائن کو نشانہ بنایا جس سے دشمن کے اگلے دستے
بہت کمزور ہو گئے۔

اسی روز گورداسپور ریلوے سٹیشن پر ایک لمبی مال بردار ریل گاڑی جو
گولہ بارود سے بھری ہوئی تھی، تباہ کر دی گئی ایک شاہباز سکواڈرن لیڈر
علاؤالدین احمد نے گاڑی کے اس قدر قریب جا کر راکٹ فائر کئے کہ دھماکے کی زد
میں آگیا اور شہید ہو گیا۔

امرتسر کے قریب فلائٹ لیفٹیننٹ یوسف علی خان نے ایک نیٹ طیارہ
مار گرایا۔

جموں کے ہوائی اڈے پر بہت سے باربردار طیارے کھڑے تھے جنہیں
ہمارے بمباروں نے تباہ کر دیا۔ ایک حملہ سری نگر کے ہوائی اڈے پر بھی کیا گیا
جہاں دو باربردار طیارے تباہ کئے گئے۔

رات کو ہلواڑہ اور آدم پور کے ہوائی اڈوں پر بمباری کی گئی۔ دشمن نے
ان اڈوں کو پھر سے قابل استعمال بنا لیا تھا۔ آدم پور کے اڈے پر چھ مسٹیئر طیارے
جلتے نظر آئے۔

رات کے وقت بھارتی ہوابازوں نے اپنے ہوائی اڈوں کی تباہی کا انتقام
پشاور اور کوہاٹ کے دیہاتیوں اور شہریوں سے لیا۔ کوہاٹ پر بمباری کرنے والے
ایک کینبرا کو ہمارے ایک ایف ۱۰۴ کے شاہباز نے گرا لیا۔

۱۴ ستمبر۔ مشرقی پاکستان کے شاہبازوں نے مغربی بنگال کے ایک ہوائی
اڈے بارک پور پر حملہ کیا اور ایک باربردار طیارہ، ایک کینبرا اور ایک ڈکوٹا تباہ
کیا۔ ایک پرواز اگرتلہ کے ہوائی اڈے پر بھی گئی مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ قریب ہی فوجی
بارکیں تھیں انہی پر فائرنگ کی گئی اور بے شمار بھارتی سپاہیوں کو ہمیشہ کی نیند
سلا دیا گیا۔

چونڈہ کا معرکہ اور شدید ہو گیا تھا۔ پاک فوج کی مدد کے لیے چھ پروازیں بھیجی
گئیں۔ کھیم کرن کے مورچوں کو بھی مدد دی گئی جہاں شاہبازوں نے دلٹوہا
سے پیچھے کمک کے طور پر آنے والے بیس ٹینکوں اور بہت سی فوجی گاڑیوں کو
تباہ کیا۔ راجستھان کے مورچوں کو بھی پاک فضائیہ نے دشمن کی توپوں اور گاڑیوں پر
حملہ کر کے بہت مدد دی۔

۱۶ ستمبر تک انڈین ایئر فورس کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ دن کے وقت اس کا
کوئی طیارہ نظر نہیں آتا تھا۔ اب شاہبازوں کو شکار ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ مثلاً سکواڈرن
لیڈر عالم کو شکار کی تلاش میں آسمان کھوجنا پڑا۔ اسے دریائے بیاس سے دور پرے
دو ہنٹر نظر آئے۔ اس نے تھوڑی سی دیر کے معرکے میں دونوں کو مار گرایا مگر عالم

کا نمبر ۲ دشمن کی زد میں آ چکا تھا۔ وہ پیراشوٹ سے کود گیا اور جنگی قیدی بن گیا۔

اس روز چونڈہ کی فضا میں بھی شاہبازوں کی حکمرانی رہی رات کو بمباروں نے آدم پور اور ہلواڑہ کے مرمّت شدہ ہوائی اڈوں کو پھر مرمّت کے قابل بنا دیا۔

بمباروں کی ایک پرواز پہلی بار انبالہ ہوائی اڈے پر بھیجی گئی۔ یہ اڈہ ابھی محفوظ تھا اور دشمن اب بمباروں کے لیے یہی اڈہ استعمال کر رہا تھا۔

رات کو بھارتی کینبرا طیارے سرگودھا پر بم گرا گئے جو اڈے سے دُور گرے۔

لاہور، ابرکی اور بیدیاں کے محاذوں پر جو سیبر طیارے گئے انہوں نے بھارتی فوج سے بھری ہوئی بارہ گاڑیاں تباہ کیں۔ راجوڑی کے قریب دوسری پرواز نے پندرہ گاڑیاں تباہ کیں۔

بڑا شکار گڈرو ریلوے سٹیشن پر ملا۔ ایک مال بردار ریل گاڑی سے گولہ بارود اتارا جا رہا تھا کہ شاہباز پہنچ گئے اور ساری گاڑی کو شعلوں اور دھماکوں کی لپیٹ میں چھوڑ کر بھارتی سپاہیوں کو گولہ بارود کے بکس اٹھانے کی مشقت سے فارغ کر آئے۔

رات کے وقت رام گڑھ کے بھارتی مورچوں پر بمباری کی گئی جس سے چند ٹینک، گاڑیاں، ایمونیشن اور پٹرول کا ذخیرہ تباہ ہوا۔

۱۸ ستمبر کو بھی اس تاؤ گیٹ پر بم برسائے گئے کیونکہ یہ دشمن کی اجتماع گاہ اور ذخیرہ تھا۔

کھیم کرن محور میں اصل اُتر سے پرے شاہبازوں کو چند ایک ٹینک اور بہت ساری گاڑیاں مل گئیں جنہیں وہ تباہ کر آئے۔ ایک اندازے کے مطابق چودہ ٹینک تباہ ہوئے تھے۔

فیروز پور کے آسمان میں چار شاہبازوں اور چار بھارتی ہوابازوں کا مقابلہ ہو گیا۔ یہ بھارت کے نیٹ طیارے تھے۔ شاہبازوں نے دو کو مار گرایا اور دو معرکے سے منہ موڑ گئے۔

رات کو بمباروں نے جام نگر پر بمباری کی اور انبالہ پر بھی زوردار حملہ کیا۔

۱۹ ستمبر۔ دشمن نے چونڈہ پر ایک اور شدید حملہ کیا۔ شاہبازوں کی مدد لی گئی جنہوں نے دشمن کے مورچوں پر ہزار ہزار پونڈ کے بم گرائے۔

کوئی بیس ٹینک، گاڑیاں اور پیادہ دستے تباہ کیے۔ اس روز اس محاذ پر ایک نیٹ طیارہ بھی گرا لیا گیا جس کا ہوا باز فلائٹ لیفٹیننٹ مہادیو پیراشوٹ سے اتر آیا اور جنگی قیدی بن گیا۔

بمباروں نے جودھ پور اور ہلواڑہ کے ہوائی اڈوں پر بمباری کی۔ جودھ پور کے اڈے پر تیل پٹرول کا ایک ذخیرہ اڑا اور کئی جگہوں سے شعلے اٹھتے نظر آئے۔ اس رات کینبرا طیاروں نے سرگودھا پر بمباری کی مگر حسبِ معمول کوئی نقصان نہیں ہوا۔

۲۰ ستمبر کے روز فائر بندی کے معاہدے پر دستخط ہو گئے اس کے ساتھ ہی بھارتیوں نے بری حملوں میں شدت پیدا کر دی اور ہر محاذ پر تازہ کمک بھیج دی۔ دن کے پچھلے پہر تین ہنٹر اور چار نیٹ طیارے لاہور کی فضا میں اڑتے نظر آئے۔ معلوم نہیں کہ ان کا مشن کیا تھا۔ ہمارے چار سیبر طیاروں نے انہیں للکارا اور لاہور کے اوپر معرکہ لڑا گیا جس میں دو ہنٹر طیارے گرا لیے گئے۔ اپنا ایک سیبر ضائع ہوا۔ لیکن ہوا باز پیراشوٹ سے اُتر آیا۔

۲۱ ستمبر انبالہ کے ہوائی اڈے پر حملہ کیا گیا اور خوب تباہی مچائی گئی۔ ایک امریکی نامہ نگار انبالہ میں موجود تھا۔ اس کے بیان کے مطابق وہاں بھارت کے پچیس لڑاکا بمبار طیارے جو پاکستان میں کسی جگہ حملے کی تیاری کر رہے تھے، تباہ ہوئے۔

اسی رات ہلواڑہ، آدم پور اور جودھ پور کے ہوائی اڈوں پر بھی بمباری کی گئی۔

ایک کینبرا طیارہ گرایا گیا جس کا نیوی گیٹر طیارے کے ساتھ جل بھن گیا لیکن ہوا باز، فلائٹ لیفٹیننٹ من موہن لال پیراشوٹ سے اتر آیا اور جنگی قیدی بن گیا۔

لاہور سیکٹر پر بھارتیوں نے جنگ کا شدید ترین حملہ کر دیا تاکہ فائر بندی سے پہلے پہلے لاہور کے کسی حصے پر قبضہ کر لیا جائے۔ دشمن کے توپخانے نے قیامت بپا کر دی جسے خاموش کرنا اپنے توپخانے کے بس سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

شاہبازوں نے حیران کن جانبازی سے ان توپوں کو خاموش کیا۔

اس روز انڈین ایئر فورس نے مدین پر حملہ کیا اور چار ہزار پونڈ کے بم گرائے۔ ریڈار کو نقصان پہنچا۔ بھارتی ہوابازوں نے قریب کی دیہاتی آبادی پر آتش گیر گولیاں فائر کیں جن سے جھونپڑیوں کو آگ لگ گئی۔

لاہور سیکٹر پر اس روز بھی دشمن کے توپخانے کا بہت دباؤ تھا جسے کم کرنے کے لیے پاک فضائیہ کو پانچ پروازیں بھیجنی پڑیں۔ انہوں نے بہت سی توپیں اور چند ایک ٹینک تباہ کیے۔

گڈرو اور ڈالی کے محاذ کو بھی فضائیہ نے مدد دی۔ شاہبازوں نے وہاں ٹینک اور چند گاڑیاں تباہ کیں۔

جنگ کے آخری روز شاہبازوں نے کیم کرن، لاہور اور چونڈہ کے محاذ پر کئی ٹینک، توپیں اور گاڑیاں تباہ کیں اور کیم کرن کی فضا میں بھارت کے سابق کمانڈر انچیف کریاپا کے بیٹے فلائٹ لیفٹیننٹ کریاپا کو مار گرایا گیا۔ وہ پیراشوٹ سے اتر آیا تھا۔ اسے قیدی بنا لیا گیا۔

صبح تین بجے جنگ ختم ہو گئی۔

ایئر مارشل نور خان نے کہا ——— "بھارت سے جنگ لڑ کر پاک فضائیہ صحیح سلامت رہی اور پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی" ——— انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا ——— "میرے سامنے یہ مسئلہ نہیں تھا کہ ہوابازوں کو حملوں کے لیے بھیجوں کیسے۔ بلکہ دشواری یہ پیش آگئی تھی کہ انہیں بڑھ بڑھ کر حملے کرنے سے روکوں کیسے؟"

فضائی معرکوں کا سکور یہ تھا ——— دشمن کے ایک سو دس طیارے گرائے

گئے جن میں سینتیس کو فضائی معرکوں میں گرایا گیا۔ تینتالیس کو زمین پر تباہ کیا گیا اور تیس کو زمینی توپچیوں نے گرایا۔ یہ خاص طور پر پیشِ نظر رکھیے کہ پاک فضائیہ نے ان اعداد و شمار میں بھارت کے وہ پچیس طیارے شامل نہیں کیے جو ایک امریکی نامہ نگار کی عینی شہادت کے مطابق انبالہ کے ہوائی اڈے پر تباہ ہوئے تھے۔ اس طرح بھارت کے تباہ شدہ طیاروں کی تعداد ایک سو پینتیس بنتی ہے۔

شاہبازوں نے ڈیڑھ سو ٹینک، چھ سو فوجی گاڑیاں، گولہ بارود کی چار ریل گاڑیاں اور سو کے قریب توپیں تباہ کیں، دراصل یہ اعداد و شمار کہیں زیادہ ہیں لیکن پاک فضائیہ نے صرف اس تباہی کو اپنے ریکارڈ میں لکھا ہے جس کی شہادت دوسرے شاہبازوں نے دی ہے۔ دوسرے ذرائع دشمن کا نقصان اس سے دگنا بتاتے ہیں۔

پاک فضائیہ نے سات بھارتی ہوابازوں کو جنگی قیدی بنایا اور ایک بھارتی طیارے کو صحیح و سالم اتار کر قبضے میں لیا۔

پاک فضائیہ کے چودہ طیارے ضائع ہوئے۔ ان میں چار فضائی معرکوں میں اور دو زمینی فائر سے ضائع ہوئے۔ ایک دشمن کی گولہ بارود کی ریل گاڑی پر حملہ کرتے ہوئے اپنے ہی راکٹوں کی زد میں آگیا تھا۔ دو اپنے ہی زمینی فائر کی زد میں آگئے تھے۔

بھارت نے فضا میں ہاری ہوئی جنگ آل انڈیا ریڈیو کی فضائی لہروں پر جیت لی۔ آل انڈیا ریڈیو نے پاک فضائیہ کے تمام ہوائی اڈے تباہ کر دیئے اور پاک فضائیہ کے ایک سو پینتیس طیاروں میں سے چار سو بہتر مار گرائے۔

پاک بحریہ کے غازی

پیشتر اس کے کہ پاک بحریہ کے کارناموں کا ذکر کیا جائے، انڈین نیوی اور پاک بحریہ کی قوت کے تفاوت کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

	پاکستان	بھارت
طیارہ بردار بحری جہاز	×	۱
(اس پر اسی لڑاکا طیارے تھے)		
آبدوز	۱	×
تباہ کن جہاز	۷	۲۱
(آبدوز شکن فریگیٹ شامل ہیں)		
کروزر	۱	۲
مائن سویپر	۸	۷
تیل بردار	۱	۱
متفرق	×	۱۶
	۱۸	۴۸

۶ ستمبر کی صبح پاکستان پر بھارت کے حملے کی اطلاع ملتے ہی پاک بحریہ انتہائی تیزی سے کھلے سمندروں میں نکل گئی اور جہازوں نے اپنے اپنے سٹیشن سنبھال لیے۔ بحری کمانڈر اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کس ہیبت ناک قوت کے مقابلے میں جا رہے ہیں۔ پاک بحریہ جیسی چھوٹی بحری طاقت کو ختم کرنے کے لیے انڈین نیوی کا طیارہ بردار جہاز "وکرانت" جنگی جہاز "رانا"، "رنجیت" اور "میسور" ہی کافی تھے۔

انڈین نیوی جنگ کے پہلے روز سمندر سے غائب رہی۔ اگلا دن بھی انڈین نیوی کو کھلے سمندروں میں تلاش کرتے گزرا۔ ۸/۷ ستمبر کی رات پاک بحریہ کو دوارکا کے قلعے کی تباہی کا حکم ملا۔ دوارکا کی اہمیت یہ تھی کہ وہاں بھارت کا ایک طاقتور ریڈار سٹیشن تھا جو جام نگر کو حملے کے لیے خبردار کرتا تھا۔ اور مغربی پاکستان میں ہوائی حملے کرنے کے لیے اپنے طیاروں کی راہنمائی کرتا تھا۔ دوارکا ایک فوجی ٹھکانہ بھی تھا جہاں انڈین نیوی کا تارپیڈو سکول بھی تھا

۸/۷ ستمبر رات پاک بحریہ کے جہازوں نے پہلے دوارکا کے ساحلی توپخانے کو خاموش کیا پھر دوارکا پر گولہ باری کی اور تارگیٹ کو بالکل ہی بھسم کر ڈالا۔ حملے کے بعد انڈین ایئر فورس نے ہمارے بحری جہازوں پر حملہ کیا جن میں سے بحری توپچیوں نے تین کو گرا لیا۔

توقع تھی کہ انڈین نیوی دوارکا کا انتقام لینے کے لیے کھلے سمندروں میں آئے گی مگر پاک بحریہ جس تیزی سے سمندر پر چھا گئی تھی اور جس طرح اس نے پہلی ضرب لگائی تھی اس سے دہشت زدہ ہو کر انڈین نیوی بندرگاہوں سے باہر نہ آئی۔ بعد میں [illegible] اطلاع ملی کہ جب دوارکا پر گولہ باری ہو رہی تھی، بھارت کے چار فریگیٹ جہاز خلیج کچھ میں موجود تھے مگر ساحل کے اور اندر جا کر دبک گئے تھے۔

دن پہ دن گزرتے گئے۔ بحری غازی بے تاب و بیقرار کھلے سمندروں میں پھرتے رہے۔ ہماری آبدوز "غازی" بھارت کی ایک بڑی بندرگاہ کے سامنے سمندر کے اندر کھڑی رہی۔ بندرگاہ میں انڈین نیوی کے تینوں بڑے جنگی جہاز "رانا"، "میسور" اور "رنجیت" کھڑے تھے۔

اس دوران پاک بحریہ نے کراچی کی بندرگاہ میں داخل ہونے والے اور یہاں سے لنگر اٹھانے والے جہازوں کو جنگی علاقے سے اپنی حفاظت میں نکالا۔ ان میں دو تین جہاز فوجی اور جنگی سامان سے بھی لدے ہوئے آئے تھے۔ پاک بحریہ کے جہاز دُور تک جا کر انہیں اپنی حفاظت میں لائے۔

آخر ۲۲ ستمبر انڈین نیوی کے چار فریگیٹ جہاز جو آبدوز کا پتہ دُور سے لگا لیتے ہیں اور اسے مار بھی لیتے ہیں، باہر آئے۔ فریگیٹ کو آبدوز شکن کہا جاتا ہے۔ اِدھر اکیلی آبدوز تھی جس کا کپتان کانڈر نیازی تھا۔ اس نے چاروں سے ٹکر لے لی اور ایک کو تارپیڈو کی زد میں لے کر ڈبو دیا۔ باقی تین نے "غازی" کو گھیرے میں لے کر مارنے کی بہت کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

دوسرے دن فائر بندی ہو گئی۔ آل انڈیا ریڈیو نے حسبِ عادت بے بنیاد خبر نشر کی کہ پاکستان نیوی نے جو جہاز ڈبویا ہے وہ ہمارا فریگیٹ نہیں بلکہ ایران کا ایک مسافر بردار جہاز تھا۔

"دشمن (پاکستان) تمام محاذوں پر جس غیظ و غضب سے لڑ رہا ہے، اس کے پیشِ نظر انڈین آرمی کے لیے پاکستان کی سرحد میں پیش قدمی کرنا آسان نہیں رہا۔"

"ٹائمز آف انڈیا"۔ بمبئی

۱۴ ستمبر ۱۹۶۵

وہ کوئی اور تھا

"اس مٹی میں شہیدوں کا خون مل
گیا ہے۔ میں نے اس پاک مٹی پر کھڑے
ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ ایک شہید کی
ماں کو دھوکا دیا ہے۔"

اگر میرے بریف کیس پر میرا نام نہ لکھا ہوتا تو ہم دونو ریل کار کی ایک ہی سیٹ پر پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ اور اجنبی رہتے۔ گندمی رنگ کا وہ جواں سال آدمی مسکرا رہا تھا جیسے اپنے آپ سے کوئی مذاق کر کے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ وہ لٹھے کی بُش شرٹ اور خاکی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر سنجیدگی کا تاثر نمایاں تھا ہم ریل کار کی آخری سیٹ پر بیٹھے تھے جہاں سے پچھلے شیشے سے ہمیں پیچھے کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ میں لاہور شہر کو تیزی سے پیچھے ہٹتا اور اُونچی اُونچی عمارتوں اور شاہی مسجد کے بلند میناروں کو چھوٹا ہوتا دیکھ رہا تھا۔ سورج اُبھرتا چلا آ رہا تھا۔

"عنایت اللہ صاحب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے چونک کر اجنبی ہم سفر کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی تھی۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو میں نے کم ہی انسانوں میں کبھی دیکھی ہو گی۔ اس مسکراہٹ اور آنکھوں کی اس انوکھی سی چمک کے بغیر وہ بالکل عام سا انسان تھا ـــــ مہنگائی اور معاشرتی خلفشار کا مارا ہوا پاکستانی جو سینے میں سَو دُکھ چھپا کر تصوّروں میں مسکرانے کی کوشش کرتا رہتا ہے ـــــ میں نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس نے کہا ـــــ "آپ کے بیگ پر آپ کا نام پڑھا ہے۔ ساتھ آپ کے پرچے کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔"

"میں راولپنڈی جا رہا ہوں۔" میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ "اور آپ؟"

"گوجر خان۔" اس نے کہا اور میں نے دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ قدرے ماند پڑ گئی تھی۔ کہنے لگا۔ "میں جنگِ ستمبر کے متعلق آپ کے سارے ہی مضامین پڑھ چکا ہوں اور باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔" اس نے ذرا توقف سے پوچھا۔ "آپ جنگی کہانیاں کیوں لکھتے ہیں؟ ..... اس لیے کہ پرچہ زیادہ فروخت ہو یا آپ سچے دل سے پاک افواج کے کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لیے لکھ رہے ہیں؟"

"آنے والی نسلوں کے لیے۔" میں نے اُسے کہا۔ "اگر جنگی کہانیوں کی وجہ سے پرچے کی فروخت کم ہو گئی تو بھی میں یہ کہانیاں لکھتا رہوں گا۔"

"کیا آپ نے کبھی جائزہ لیا ہے کہ لوگ کب تک یہ کہانیاں سنتے رہیں گے اور کب اکتا جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔ "کیا ایسا وقت بھی آئے گا جب قوم ان کہانیوں سے منہ موڑ لے گی؟"

"شاید نہیں۔" میں نے کہا۔ "پاکستانی ایک غیور قوم ہے۔ کوئی بھی پاکستانی ان زخموں کو نہیں بھول سکتا جو اس نے دشمن کے ہاتھوں کھائے ہیں۔ پاکستانی اپنی اُن بہو بیٹیوں کو بھی نہیں بھول سکتے جو دشمن کی درندگی کا شکار ہو گئیں اور پاکستانی اپنے ان شہیدوں کو کیسے بھول سکیں گے جو ہماری ماؤں بہنوں کی آبرو پر قربان ہو گئے۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح شہید ہوئے تھے؟" اس نے معصوم سے لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے ان کی لاشیں دیکھی ہوں گی، انہیں اس وقت نہیں دیکھا ہو گا جب ان کی آخری سانس کے ساتھ ان کے سینے سے آخری نعرۂ حیدری نکلا تھا۔ اور اس نعرے کے ساتھ ہی ان کی روح نکل گئی تھی میں نے انہیں دیکھا تھا۔" ..... اس نے لمبی آہ بھری اور دکھے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ "میں نے ان کی لاشوں کو ان ہاتھوں سے اٹھایا تھا۔"

"آپ فوج میں ہیں؟"

"تھا" اس نے کہا "سروس پوری ہو گئی ہے۔ خدا کا شکر ادا کیا کرتا ہوں کہ اس کی ذات نے ستمبر کی جنگ لڑنے کی سعادت عطا فرمائی تھی۔"

"آپ کون سے محاذ پر تھے؟"

"میں سارے ہی محاذوں پر تھا" اس نے مسکرا کر کہا "محاذ ایک ہی تھا، ایک ہی سرحد تھی۔ راجستھان کا صحرا بھی ہمارا، ٹیٹوال کی وادیاں بھی ہماری تھیں۔ ہم جہاں جہاں لڑ رہے تھے اس جگہ کا ایک ایک انچ ہمارے لیے پورے پاکستان جتنا قیمتی تھا۔ اس ایک انچ سے پیچھے ہٹنے کو ہمارے جوان پورے پاکستان سے پیچھے ہٹ جانے کے برابر سمجھتے تھے۔ ان کے قدم جہاں جم گئے، جم گئے۔ وہاں سے ان کی لاشیں اٹھائی گئی تھیں۔۔۔" وہ چپ ہو گیا اور کچھ سوچ کر بولا "آپ نے ایک جنگی واقعہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا۔ 'وہ پیاسا شہید ہوا'۔۔۔ وہ واقعی سچا واقعہ تھا لیکن عنایت صاحب! پیاسا شہید ہونے والا وہی ایک نہیں تھا۔ سب پیاسے شہید ہوئے تھے۔ ان کی بوتلیں یا تو پانی سے بھری ہوئی تھیں اور انہیں پانی پینے کی مہلت نہیں ملی تھی یا ان کی بوتلیں بالکل خالی تھیں کیونکہ محاذ پر پہنچنے کی جلدی میں وہ اپنے ساتھ پانی لے جانا بھول گئے تھے۔ مورچوں میں پانی بھی پہنچتا رہا تھا اور کھانا بھی لیکن پانی کا گھونٹ یا روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے ضمیر پر کچھ ایسا بوجھ محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ہم فرض کی ادائیگی کے دوران عیاشی کر رہے ہوں۔ جنگ ختم ہوئے اڑھائی برس گزر چلے ہیں لیکن میں اب بھی کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو۔۔۔" وہ چپ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو گئی تھیں اور وہ ریل کار کے پچھلے شیشے سے باہر دیکھنے لگا تھا۔ اور میں اس کی آنکھوں کے تاثر سے اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ محاذ پر جا پہنچا ہے۔

اس نے ایک جھٹکے سے گردن میری طرف گھمائی اور پرجوش لہجے میں بولا "آپ کو ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ اس وقت تک آپ نے جو کچھ لکھا

ہے وہ جسموں کی کہانیاں ہیں۔ آپ نے ابھی اُن روحوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا جنہوں نے ان جسموں کے اندر بیٹھ کر انسانوں کو اسی طرح لڑایا تھا جس طرح انسان ٹینک میں بیٹھ کر ٹینک کو لڑاتا ہے۔ یہ بات بالکل سچ ہے بھائی جی! کہ انسان ٹینک بن گئے تھے لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ سوچ میں پڑ گیا، اور ایسے انداز سے مسکرایا جیسے کسی سوال کا جواب نہ پا کر کھسیانا ہو گیا ہو۔ کہنے لگا "میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ شاید آپ بتا سکیں کہ ان میں اتنی ہمت اور اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی؟ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کی ماؤں کے دودھ میں کوئی اثر تھا۔۔۔" اس نے مجھ سے پوچھا "آپ نے کسی شہید کی ماں کو کبھی دیکھا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں نے ایک شہید کی ماں کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے بیٹے کے تابوت کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا بیٹا راجستھان کے محاذ پر زخمی ہوا تھا۔ یہ سادھیوال کا آخری معرکہ تھا جو فائر بندی کے بعد لڑا گیا تھا۔ اس سیکٹر میں فائر بندی کے بعد معرکے لڑے گئے تھے کیونکہ پاکستان کی صحرائی فوج (ڈیزرٹ فورس) نے اس طرف سے دشمن کے سینکڑوں مربع میل پر قبضہ کر لیا تھا۔ دشمن نے اس علاقے کو چھڑانے کے لیے فائر بندی کے بعد بریگیڈوں کی نفری سے حملے شروع کر دیے تھے۔ اس کے پاس توپخانہ بھی تھا اور لڑاکا طیارے بھی لیکن ادھر انڈس رینجرز کے چند سو رائفل بردار اور ان کے ساتھ سندھ کے حُر تھے۔ نہ کوئی توپ نہ طیارہ۔ ڈیزرٹ فورس کے جوانوں نے ان تپتے ہوئے ظالم ریگزاروں میں نہ صرف دشمن کے بریگیڈوں کے حملے روکے بلکہ ان بریگیڈوں کو صحرا میں بکھیر کر جوابی حملے کیے اور دسمبر ۱۹۶۵ تک دشمن کے دو ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہو گئے۔

سادھیوال کا آخری معرکہ دشمن کی سرحد کے بیس میل اندر لڑا گیا تھا اور پاکستان کے صحرائی غازیوں نے دشمن کے سینے پر جا جھنڈا گاڑا تھا۔ یہ تو ایک

معجزہ تھا جو ان غازیوں نے کر دکھایا۔ چھ سات سو رائفل برداروں نے پانچ ہزار کے بریگیڈ کا کم ہی کبھی مقابلہ کیا ہوگا۔ بھارت کے اس بریگیڈ میں سکھ لائٹ انفنٹری اور بمبئے گرنیڈیئرز جیسی چنی ہوئی پلٹنیں بھی تھیں۔ بھارتی حکمرانوں نے ان چنی ہوئی اور جنگ کی تجربہ کار پلٹنوں کو اس لیے اس بریگیڈ میں شامل کیا تھا کہ سادھیوال سیکٹر میں انڈین آرمی کی پسپائی سے بھارتی عوام میں ان کی ساکھ ختم ہو گئی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اس سیکٹر سے پاکستان کی صحرائی فوج کو پیچھے دھکیلنا چاہتے تھے۔ اس بریگیڈ کی انہوں نے اس حد تک خاطر مدارت کی تھی کہ جس صبح پاکستانیوں نے سادھیوال پر جوابی حملہ کیا اس صبح پورے بھارتی بریگیڈ کے لیے بہت بڑے "کڑاہ" میں حلوہ پک رہا تھا۔

پاک صحرائی دستوں کے پاس اس روز پہلی بار مارٹر گنیں آئی تھیں ورنہ وہ ان کے بغیر لڑتے رہے تھے۔ جب حملہ شروع کرنے سے پیشتر مارٹر گنیں فائر کی گئیں تو ایک گولہ "کڑاہ" میں جا گرا اور پورے بریگیڈ کا حلوہ ریت پر بکھر گیا۔ اس کے بعد ساڑھے چار گھنٹے چند سو مجاہدوں نے رائفلوں سے توپوں، مارٹر گنوں اور بھارتی بریگیڈ کی چار پلٹنوں (جن میں چنی ہوئی پلٹنیں بھی شامل تھیں) کو ریگزار اور صحرائی ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں بالکل اسی طرح بکھیر دیا جس طرح وہ ان کے حلوے کو بکھیر چکے تھے۔ اور سادھیوال کی چوکی ان کے قبضے میں آگئی۔

میں اس معرکے کے چند روز بعد اس محاذ پر گیا تھا۔ دشمن کی سینکڑوں لاشوں کو پاکستانی مجاہد ایک ہی جگہ دبا چکے تھے اور صحرائی لومڑیاں لاشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہی تھیں۔ دور دور تک ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں کئی لاشوں پر وردی بھی نہیں تھی۔ صرف بنیان اور انڈر ویئر تھے کیونکہ یہ سورمے پاکستانی ڈیزرٹ فورس کے حملے کی شدت سے بوکھلا کر بھاگے تو صحرائی ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک

گئے تھے۔ جانے کتنے دن یا کتنی دیر بھٹکتے رہے اور جسم سے وزن کم کرنے کے لیے انہوں نے رائفل، ایمونیشن، بوٹ اور وردی بھی کہیں پھینک دی تھی۔ ان لاشوں پر کوئی زخم نہیں تھا، کوئی چوٹ نہیں تھی۔ وہ ریگزار میں پیاسے مر گئے تھے۔ وہ بھٹک گئے تھے۔ یہی تھے بھارت کے وہ چنے ہوئے سورمے جو پاکستان کو فتح کرنے کے لیے حیدرآباد اور رحیم یار خان تک پہنچنے کے لیے آتے تھے۔

ہاں تو میں شہید کی ماں کی بات کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا اسی معرکے میں زخمی ہو کر ہسپتال آیا تھا۔ میں جس روز رحیم یار خان پہنچا اس روز قوم کا یہ بیٹا ہسپتال میں شہید ہو گیا تھا۔ اس کی میت تابوت میں رکھی تھی اور تابوت ہسپتال کے سامنے پڑا تھا۔ ہسپتال کی منڈیر پر پاکستان کا سبز جھنڈا بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔ شہید کی ماں تابوت کے پاس زمین پر بیٹھی تھی اور میں اس کے چہرے کو بڑے ہی غور سے دیکھ رہا تھا اور اس قابلِ صد احترام چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ماں کی آنکھیں خشک تھیں، ہونٹ نیم وا اور چہرے پر ایسا تاثر تھا جسے میں سنجیدگی بھی نہیں کہہ سکتا، متانت بھی نہیں، نہ میں اسے دکھ اور درد کہہ سکتا ہوں۔ میں اس تاثر کو بیان نہیں کر سکتا۔ ماں چپ چاپ تابوت کو دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں بھی نہیں جھپک رہی۔ دو چار لمحوں بعد اس نے ہولے سے سر اٹھایا اور اوپر منڈیر پر جھومتے سبز جھنڈے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر اس مقدس جھنڈے کو دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ نظریں نیچے کر کے اپنے بیٹے کے تابوت کو دیکھنے لگی۔

اب اس کے چہرے کا تاثر نمایاں اور قابلِ فہم تھا۔ وہ ایک ماں تھی جو اپنے جوان بیٹے کی لاش پر چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی لیکن اس کی ذات میں پاکستان کی جو عظیم ماں تھی اسے رونے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے چہرے کا

تاثر صاف بتا رہا تھا کہ یہ ماں اس سبز جھنڈے کو دیکھ کر اندر رہی اندر فخر سے کہہ رہی ہے کہ اس پرچم کی ہریالی میں میرے جگر کا خون شامل ہے۔

"اور عنایت صاحب!" میرے ہم سفر نے میری بات سُن کر کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ ستمبر میں کتنے جگر کٹ گئے ہیں جن سے ابھی تک خون ٹپک ٹپک کر اس پرچم کی ہریالی میں شامل ہو رہا ہے؟... کسی کو معلوم نہیں۔ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ لیکن بھائی جی! ایک بات ضرور ہے کہ ایک شہید کی ماں کو دیکھو تو لگتا ہے جیسے ہر شہید کی ماں کو دیکھ لیا ہے"۔

وہ پھر چپ ہو گیا۔ ریل کار "تر کی ڈو میلی" کی پہاڑیوں سے گزر رہی تھی اور وہ پیچھے ہٹتی چٹانوں، ریل کی پٹڑی اور درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا شاید اس کے ذہن میں کوئی بات آ گئی تھی جسے وہ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"بہت سی باتیں ہیں جو کہی بھی نہیں جا سکتیں"۔ اس نے کہا۔ "آپ فوجیوں کے کچھ زیادہ ہی ہمدرد معلوم ہوتے ہیں ورنہ آپ جنگی کہانیاں نہ لکھتے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ یہ کہانیاں حاصل کرنے کے لیے آپ کو کتنا خوار ہونا پڑتا ہو گا اور آپ کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہوں گے..... میں سینے میں ایک بھید لیے پھرتا ہوں۔ ابھی تک کسی کو نہیں بتایا۔ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ گناہ تو نہیں؟ میں نے میدانِ جنگ میں جھوٹ بولا ہے اور ایک شہید کی ماں کو فریب دیا ہے..... ہو سکتا ہے کہ ایسے کئی اور واقعات ہوتے ہوں۔ بھائی جی! ستمبر کی جنگ عجیب و غریب طریقے سے لڑی گئی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ ڈیڑھ ہزار میل لمبے محاذ پر کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ کہنے کو تو یہی کچھ ہے کہ ہم نے حملہ روک لیا تھا لیکن کس طرح روکا؟ اس جواب کے اندر اتنی ہی کہانیاں ہیں جتنی پاک فوج کی نفری تھی۔ ہم بے شک منہ زور ہو کر لڑے لیکن کمانڈروں کی سکیموں کو خراب نہیں ہونے دیا۔ ان کے حکم کی

پوری پابندی کی۔ اس کے باوجود کئی موقعے ایسے بھی آئے جہاں ایک سپاہی کو اپنی "موت" کے متعلق خود فیصلہ کرنا پڑا۔ ہمارے ہر ایسے سپاہی نے وہی فیصلہ کیا جو ملک کی سلامتی کے لیے موزوں تھا۔ یہی فیصلے وہ کہانیاں ہیں جو میں چاہتا ہوں کہ تاریخ میں آ جائیں۔ بھائی جی! ضرورت یہ ہے کہ کسی شہید کی جگہ جو نیا جوان پاک فوج میں بھرتی ہو تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جس کی رائفل مجھے دی گئی ہے وہ شہید ہوا تھا اور اس رائفل یا مشین گن سے اس نے وطن کی عزت بچائی تھی......

"بات یہ ہے عنایت صاحب! میں نے اپنے گاؤں کے ایک لڑکے کو فوج میں بھرتی کروایا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی زمین خاصی ہے جو اس وقت بھی انہوں نے بٹائی پر دے رکھی تھی اور اب بھی بٹائی پہ دی ہوئی ہے۔ یہ لڑکا باپ کے مرنے کے بعد آوارہ سا ہو چلا تھا۔ شہہ زور نہیں تھا۔ اُسے دراصل شہر کی سیر اور سنیما کی لت پڑ گئی تھی"۔

"کہاں کا رہنے والا تھا؟"

"یہ نہ پوچھیے"۔ اس نے کہا۔ "میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا نہ اس کے گاؤں کا نام۔ اچھا ہوا کہ آپ نے میرا نام نہیں پوچھا میں اپنا بھی نام نہیں بتاؤں گا۔ آپ میری بات سُن لیں پھر آپ خود ہی محسوس کریں گے کہ مجھے واقعی نام نہیں بتانا چاہیے"۔

اس نے کہانی آگے چلاتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکے کو میں نے اپنے گروپ میں بھرتی کرایا تھا۔ ٹریننگ کے بعد وہ میری پلٹن میں آ گیا۔ فوجی ٹریننگ نے اسے خاصا سیدھا کر دیا تھا، لیکن پلٹن میں آ کر وہ پھر سنیما کا شوقین ہو گیا۔ میں اسے اکثر نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔ مجھے زیادہ تر یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اچھا سپاہی نہیں بن سکے گا۔ بنیادی چیز ڈسپلن ہوتا ہے۔ اس میں ڈسپلن کی

بھی کچھ کمی تھی......

"تین سال گزر گئے اور وہ دن آ گیا جس دن کے لیے سپاہی کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔ خبر ملی کہ دشمن نے اعوان شریف پر گولہ باری اور مشین گن فائرنگ کر کے ایک مسجد اور بہت سے لوگوں کو شہید کر دیا ہے۔ یہ لڑکا میرے پاس آیا۔ اُسے جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تھی تو میرے پاس بھاگا آتا تھا۔ میں اس وقت حوالدار تھا۔ اس کی مشکلیں یہی ہوتی تھیں کہ آج سیکشن کمانڈر سے تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ کمپنی کمانڈر کے پیش کروں گا یا یہ کہ رات ملٹری پولیس نے بازار میں پکڑ لیا تھا یا ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں جو وہ مجھے آ بتاتا تھا تو میں اُسے دو چار گالیاں دے کر اور مل ملا کر اسے چھڑا لیا کرتا تھا.....

"اس روز اعوان شریف پر بھارتی گولہ باری کی خبر سن کر بھی وہ میرے پاس آیا۔ خاصا پریشان تھا۔ پوچھنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ میں نے بغیر سوچے کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوگا۔ اس نے اور زیادہ پریشان ہو کر پوچھا، ہم جوابی فائر نہیں کریں گے؟ میں نے کہا کہ حکم ملا تو ضرور کریں گے۔ اس نے بےچین ہو کر کہا۔ 'استاد جی! ہم بے غیرت تو نہیں ہیں۔ دشمن آ کر ہمارے بچوں کو مار جائے تو ہم پھر بھی حکم کا انتظار کرتے رہیں گے؟....'"

"وہ مجھے استاد جی کہا کرتا تھا۔ اعوان شریف پر دشمن کی گولہ باری سے اس کی جو حالت ہو رہی تھی اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے اپنے دشمن، اپنی سرحد اور اپنے فرض کو پہچان لیا تھا۔ سپاہی میں اسی وصف کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اس جیسے گھامڑ اور لاپروا سپاہی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگے گی لیکن اس میں تو ایسی تبدیلی آئی کہ دو روز بعد اس کا سیکشن کمانڈر مجھے کہنے لگا۔ "یار اپنے گرائیں کو تم نے کونسا تعویذ دیا ہے؟ بڑا "جنگی" ہو گیا ہے"۔۔۔ اس روز کے بعد وہ شام کے وقت میرے پاس آ بیٹھتا اور جنگ کی ہی باتیں کرتا سنتا رہتا۔ ایک

روز پوچھنے لگا کہ جنگ میں کوئی ہمیں فائر کرنے سے روکے گا تو نہیں؟.....

"اور چھمب جوڑیاں کی فتح کے بعد جنگ چھڑ ہی گئی۔ ہماری پلٹن پہلے روز تو کھیم کرن سیکٹر میں تھی لیکن سیالکوٹ پر حملہ ہوا تو بہت سے ٹینکوں اور ہماری پلٹن کو سیالکوٹ بھیج دیا گیا..... باتیں تو بڑی لمبی ہیں صاحب! میں آپ کو صرف اس جوان کا واقعہ سناتا ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی پلٹن میں تھے، کمپنیاں مختلف تھیں۔ کھیم کرن پر جوابی حملے کے دوران میں۔ نے ایک روز موقع نکال کر اس سپاہی کے پلاٹون کمانڈر سے پوچھا کہ وہ کس حال میں ہے اور کیسے چل رہا ہے۔ اس کے پلاٹون کمانڈر نے کہا کہ جوان کمال کر رہے ہیں۔ کوئی بھی ڈھیلا نہیں۔ مجھے تسلی ہو گئی.....

"ہم دس تاریخ کی رات سیالکوٹ سیکٹر میں آ گئے۔ دشمن کا بہت زور تھا۔ کبھی تو ڈر لگتا تھا کہ سیالکوٹ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ کھیم کرن کا محاذ بھی کم ظالم نہیں تھا لیکن سیالکوٹ کی بات کچھ اور ہی تھی۔ جب میری پلٹن ایک ٹینک سکواڈرن کے ساتھ بھلورا کی طرف بڑھی تو ہم سمجھ گئے کہ دشمن پیچھے ہٹنے کے لیے نہیں آیا۔ اب ہم اسے یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ پیچھے ہٹنے کے لیے ہم بھی نہیں آئے لیکن بھائی جی! وہ ٹینکوں کی جنگ تھی۔ انفنٹریاں یوں پس رہی تھیں جیسے لڑتے ہوئے بھینسوں یا سانڈوں کے درمیان دو تین بچے آ گئے ہوں۔ پہلی ہی ٹکر میں ہم نے دشمن کو بھلورا سے پیچھے تو ہٹا دیا لیکن بہت سی جانوں کی قربانی دے کر۔ پلٹن میں کئی جوان اور عہدیدار شہید ہو گئے جن کی جگہیں پُر کرنے کے لیے مجھے ایک پلاٹون دے دی گئی جس میں یہ سپاہی تھا جس کا میں واقعہ سنا رہا ہوں۔ اس کا پلاٹون کمانڈر شدید زخمی ہو گیا اور ہسپتال میں شہید ہو گیا تھا.....

"اسی رات مجھے حکم ملا کہ دس آدمیوں کی ایک ٹینک شکار پارٹی TANK HUNTING PARTY بھیجنی ہے۔ مجھے اس پارٹی کے ساتھ جانا تھا۔

رات کے وقت ٹینک اندھے ہو جاتے ہیں۔ شام ہوتے ہی ٹینکوں کو دُور پیچھے لے جاتے ہیں تاکہ ٹینک شکار پارٹیوں سے محفوظ رہیں۔ اگر انہیں آگے ہی رکھنا ہو تو انفنٹری ان کی حفاظت کرتی ہے چنانچہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے چند ایک آدمی ٹینک شکن ہتھیار مثلاً راکٹ لانچر لے کر دشمن کے مورچوں کے علاقے میں گھس جائیں اور ٹینکوں کو تباہ کر آئیں۔ اس مہم پہ جانے والے زندہ واپس آنے کے لیے نہیں جایا کرتے۔ ذرا تصور کیجیے دشمن کے مورچوں کے علاقے میں چلے جانا، جہاں دشمن ذرا سی آہٹ پر چوکنا ہو جاتا ہے، روشنی راؤنڈ فائر کر کے علاقے میں روشنی کر لیتا ہے

اور مشین گنوں کی بوچھاڑیں فائر کرنے لگتا ہے، بارودی سرنگیں بھی بچھی ہوئی ہوتی ہیں اور گھیرے میں آجانے کا خطرہ ہر لمحہ رہتا ہے، یہ تو دل گردے کا کام ہے۔ اگر پاک فوج کے جوان اس کام سے گھبرا جاتے تو ملک کا اللہ ہی حافظ تھا.....

"میں اُس رات دس جوانوں کا انتخاب کرنے لگا تو دانستہ اس جوان کو چھوڑ دیا کیونکہ مجھے اس پر بھروسہ نہیں تھا لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ "استاد جی! میں بھی جاؤں گا۔" میں نے اُسے سمجھایا کہ یہ پرانے سپاہیوں کا کام ہے، رات کے وقت ٹھکانے پہ لانچر کا گولہ مارنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ تو جناب منت سماجت کرنے لگا اور میرے گھٹنوں کو چھو کر کہا۔ "استاد جی! ساری عمر احسان مند رہوں گا۔ مجھے ساتھ لے چلو".....ہم میں سے کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ اس کی ساری عمر بس یہی چند گھنٹے ہے۔ میں نے اُسے ساتھ لے لیا۔ چلنے لگے تو بعض جوانوں نے خدا سے گناہوں کی معافی مانگی اور فتح کی دُعا کی۔ جھک کر زمین کو چھوا اور انگلیاں چوم لیں۔ کسی نے کہا۔ شیر دِ چلو۔ اللہ بیلی......

"اور ہم چل پڑے۔ رات چاندنی تھی۔ جب دشمن کی پوزیشنوں کے قریب

پہنچے تو میں نے اپنے جوانوں کو آخری بار ہدایات دیں۔ اور کہا کہ بکھر جاؤ۔ آڑ کا خیال رکھو، فائر کے لیے اور پیچھے نکلنے کے لیے میرے حکم کا انتظار نہ کرنا۔ قید ہونے کا خطرہ ہو تو ہتھیار برباد کر دینا۔ قید ہو جاؤ تو دشمن کو نام اور نمبر کے سوا کچھ نہ بتانا....

"آگے کماد کے کھیت تھے۔ خالی کھیتوں کی اونچی نیچی مینڈھیں بھی تھیں۔ جوان ایک دوسرے کو سلام دُعا اور خدا حافظ کہہ کر بکھر گئے اور چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے خیال آیا کہ معلوم نہیں کہ ماؤں کے یہ سجیلے بیٹے میری نظروں سے تھوڑی دیر کے لیے اوجھل ہوئے ہیں یا ہمیشہ کے لیے۔ یہ خیال آیا اور ذہن سے نکل گیا۔ بھائی جی! میدانِ جنگ میں ایسی باتیں سوچنے والے لڑ نہیں سکتے.....

"دشمن کے ٹینکوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ دراصل دشمن نے خود ہی ہماری مدد کر دی تھی۔ اُسے شاید کوئی شک ہوا تھا کہ اُس نے یکے بعد دیگرے تین روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے۔ یہ دشمن کی نالائقی تھی۔ یہ پیرا شوٹوں والے راؤنڈ تھے جو کچھ دیر فضا میں معلق رہتے ہیں۔ ان کی روشنی میں مجھے دشمن کی پوزیشنیں اور اُن کے پیچھے درختوں کے نیچے تین ٹینک کھڑے نظر آ گئے۔ فوراً تین چار مشین گنیں فائر ہوئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ تیرا آسرا میرے مولا، اپنے نام کی لاج رکھنا۔ مجھے اپنے جوانوں کا فکر ہوا مگر ہم اس قدر دُور دُور تھے کہ ایک دوسرے کی خبر گیری بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دشمن کے فائر کئے ہوئے روشنی راؤنڈ نیچے آ گئے تھے۔ ان کی بجھتی روشنی اور پھیکی سی چاندنی میں مجھے کوئی ایک سو گز دور کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف رینگنے لگا۔ وہ یقیناً میرا ہی کوئی جوان تھا۔ میں تیزی سے رینگتا ہوا اُس تک پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنی فیلڈ پٹی کھول رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا کہ زخمی

ہو گئے ہو؟ اُس نے ہنس کر کہا۔ ہاں استاد جی! ذرا سا زخم ہو گیا ہے۔ وہ میرے گاؤں والا سپاہی تھا۔ اُس کے لہجے سے مجھے شک ہوا کہ وہ تکلیف میں ہے اور زخم ذرا سا نہیں جیسا کہ اُس نے کہا تھا۔ میں نے آگے ہو کر اُس کی ٹانگ دیکھی تو اُس کی پتلون کا رنگ گہرا لال ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ زخم کہاں ہے تو اس نے پہلے کی طرح ہنس کر کہا یہاں ہے۔ کوئی پروا نہیں استاد جی۔ ذرا سا زخم ہے۔ میں آگے جاؤں گا۔ ......

"میں نے اس کی پنڈلی پہ ہاتھ رکھا تو میری انگلیاں گوشت میں دھنس گئیں۔ میں لرز اُٹھا۔ قریب ہو کے دیکھا تو اس کی پنڈلی کے پٹھے تار تار تھے۔ مشین گن کا پورا برسٹ (بوچھاڑ) اس کی دائیں پنڈلی سے گذر گیا تھا۔ ہڈی دیکھی، سلامت تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں نے اُس کا زخم دیکھ لیا ہے تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور التجا کی کہ خدا کا واسطہ ہے تجھے اُستاد! مجھے پیچھے نہ بھیجنا۔ میں چل سکتا ہوں۔ میں نے اُس کی پٹی اُس کی پنڈلی پر کس دی۔ اُوپر اپنی پٹی باندھ دی اور اُسے کہا کہ وہ پیچھے چلا جائے لیکن وہ رو پڑا اور کہنے لگا کہ اُستاد جی! میری بے عزتی نہ کراؤ، مجھے آگے جانے دو۔ سب کہیں گے کہ بزدل گولی کھا کر واپس آگیا ہے...

"وہ اُٹھا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔ آگے کماد کا کھیت تھا۔ ہم اس کی مینڈھ پہ چلنے کھلے علاقے میں گئے تو لیٹ گئے۔ وہ اچھا بھلا میرے ساتھ رہا۔ اُس کے منہ سے میں نے 'سی' بھی نہ سنی۔ میں سرگوشیوں میں اُس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں دُور پرے دھماکہ ہوا اور دشمن کا ایک ٹینک جلنے لگا۔ میرے کسی جوان نے شکار مار لیا تھا۔ ان شعلوں نے ہمیں اور شکار دکھا دیا۔ مجھ سے ڈیڑھ سو گز دُور دو ٹینک کھڑے تھے۔ میں نے لانچر سیدھا کیا، شست لی اور فائر کر دیا۔ ایک اور ٹینک جلنے لگا۔ اس کے شعلوں نے جو منظر دکھایا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ ہم دشمن کی مشین گن پوسٹ سے بمشکل پچاس

گز دُور تھے۔ ہماری آڑ اچھی تھی۔ اس مشین گن کی بوچھاڑیں ہمارے اُوپر سے چیختی ہوئی گذر رہی تھیں۔ گنز اندھا دُھند کماد کے کھیت میں فائرنگ کر رہے تھے.....

"میرے زخمی ساتھی نے گرینیڈ نکالا تو میں نے اُسے روکا کیونکہ گرینیڈ پھینکنے کے لیے اُسے کھڑے ہونا تھا اور کھڑے ہو کر وہ دشمن کو نظر آ سکتا تھا۔ ٹینکوں کے شعلوں نے دن کا منظر بنایا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے میری نہ سُنی اور کھڑے ہو کر گرینیڈ پھینکا اور اسی حرکت میں زمین پر پیٹ کے بل گرا۔ میری توقع کے خلاف گرینیڈ وہیں گرا جہاں اسے گرنا چاہیے تھا۔ دشمن کی مشین گن ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی لیکن وہاں تو پوری رجمنٹ تھی جس نے گولیوں کی بارش برسا دی۔ اسی قیامت میں دو اور دھماکے سنائی دیئے اور دو اور ٹینک جلنے لگے اور ان کی روشنی میں مَیں نے دیکھا کہ تین چار ٹینک تیزی سے پیچھے جا رہے تھے۔ میں نے ایک اور راکٹ فائر کیا۔ مگر خطا گیا.....

"ہمارا مشن کامیاب تھا۔ اب واپسی کی مہم تھی۔ ہم رینگ کر نکلے۔ کماد کے کھیت کے اندر نہ گئے کیونکہ دشمن اس میں زیادہ فائرنگ کر رہا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد ہم رینگتے رکتے، رینگتے رکتے چھ سات سَو گز پیچھے آ گئے۔ دشمن نے اچانک مارٹر فائر شروع کر دیا۔ کون سی جگہ تھی جہاں مارٹر کا گولہ نہیں گر رہا تھا۔ دشمن کے پاس ایمونیشن کے ڈھیر تھے جو وہ اندھا دُھند پھونک رہا تھا۔ ہم اسی آگ میں راستہ بناتے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ میرا ساتھی مجھ سے دس بارہ قدم دُور ہو گیا تھا۔ ایک گولہ اس سے چھ سات گز پرے پھٹا اور میرا نوجوان غازی لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ میں دوڑ کر پہنچا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب وہ کبھی نہ اُٹھنے کے لیے گرا تھا۔ مارٹر گولے کے ٹکڑے نے اُس کا سینہ کھول دیا تھا۔ میں نے اس کا سر اپنے زانو

یہ رکھا تو اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "اُستاد جی! میں مروں گا تو نہیں؟" میں نے اُس کا ماتھا چُوم کر کہا۔ "نہیں گرائیں! تم زندہ رہو گے" اُس نے جھنجلا کر کہا۔ "نہیں! میں پوچھ رہا ہوں، میں شہید ہوں گا نا، مروں گا تو نہیں؟"......

"بھائی جی! میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔ مجھے اس کی ماں کا خیال آ گیا۔ سوچا کہ اُسے کیا جواب دوں گا۔ وہ کہے گی کہ تم اُسے بھرتی کرانے لے گئے تھے، لاؤ میرا بیٹا واپس کرو۔ اتنی دیر میں اُس نے پھر پوچھا۔ "بولو نا استاد جی! میں شہید ہوں نا!" میں نے اُسے کہہ ہی دیا۔ "ہاں بچے! تم شہید ہو۔" اور میں اُسے اٹھانے لگا تو اُس نے کہا۔ "نہ اُستاد جی! پیچھے نہ لے جاؤ، یہیں دفن کر دینا۔" اُس نے گرج کا نعرہ لگایا۔ "یا علیؑ" اور وہ شہید ہو گیا.....

"یہ نعرہ سُن کر میرے دو جوان اس طرف آ گئے۔ گولے برس رہے تھے۔ انہوں نے شہید کو دیکھا تو کہنے لگے کہ پیچھے لے چلتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ نہیں، اُس نے وصیت کی تھی کہ یہیں دفن کرنا۔ ایک جوان کے پاس رائفل تھی۔ اُس نے سنگین سے قبر کھودنی شروع کر دی۔ میں نے شہید کی رائفل اٹھالی اور سنگین سے زمین کا سینہ چیرنے لگا۔ ہم نے ڈیڑھ دو فٹ گڑھا کھود لیا۔ ہاتھوں سے مٹی ہٹاتے رہے اور شہید کو اس میں لٹا کر اوپر مٹی ڈال دی۔ مارٹر فائر رک گیا لیکن مشین گنیں چلتی رہیں اور گولیوں کے زناٹے ہمارے قریب سے گزرتے رہے۔ ہم نے پیٹ کے بل لیٹ کر شہید کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور رینگتے پیچھے آ گئے۔ اس شہید کا جنازہ نہ اُٹھا، جنازہ پڑھا نہ گیا.....

"پھر صاحب! جنگ ختم ہو گئی اور پھر فوجیں سرحدوں سے بارکوں میں آ گئیں۔ مجھے ایک ہی غم تھا کہ اس شہید کی ماں کو کیا جواب دوں گا۔

وہ تو اپنا بیٹا مجھ سے مانگے گی۔ میں نے اسے خط لکھ دیا تھا لیکن اُس کا جواب نہیں آیا تھا جس سے میں اور زیادہ ڈر گیا کہ وہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ میں جلدی چھٹی نہ جا سکا کیونکہ ہسپتال میں تھا۔ وہاں زیادہ عرصہ رہنا پڑا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "آپ زیادہ زخمی تھے؟"

"نہیں" اُس نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "زخم معمولی تھا۔ ڈاکٹر نہیں چھوڑ رہے تھے جبکہ مجھے اپنے زخموں کا کوئی غم نہ تھا۔ ہسپتال سے نکلتے ہی مجھے لمبی چھٹی مل گئی۔ میں ڈرتے ڈرتے گاؤں گیا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں شہید کی ماں کا سامنا کس طرح کروں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر زمین و آسمان ایک کر دے گی لیکن بھائی جی! میں جب اس عظیم ماں کے سامنے جا کھڑا ہوا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ماں ہے جس کا جوان بیٹا مر گیا ہے اور جس کی اُس نے میت بھی نہیں دیکھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور میرے سر کو چُومنے لگی۔ میری ہچکیاں نکل گئیں اور میں جی بھر کے رویا۔ بھائی صاحب! پاک فوج کا سپاہی رویا نہیں کرتا۔ وہ آنسو نہیں خون بہایا کرتا ہے۔ ہم نے جانے کتنے شہیدوں کو دفن کیا ہے لیکن آنکھ میں آنسو کبھی نہیں آیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کہہ رکھا تھا کہ مر جائیں تو چپ کر کے کہیں دفن کر دینا۔ منہ سے آہ نہ نکلے۔ مگر اُس روز میں بچوں کی طرح رویا......

"جب جی ذرا ہلکا ہوا تو میں نے شہید کی ماں کو دیکھا۔ مجھے بڑی شرم آئی۔ وہ عورت ذات اور ماں چپ چاپ تھی، نہ آنکھ میں آنسو نہ زبان پہ فریاد۔ وہ اندر گئی اور ایک کاغذ اٹھا لائی۔ میں نے پڑھا۔ یہ شہید کا خط تھا جو اُس نے ۴ ستمبر کو لکھا تھا کہ میں شہید ہو جاؤں تو دودھ کی دھاریں بخش دینا۔ تجھے اللہ پاک کی قسم ہے کہ رونا مت، نہیں تو میری نیکی برباد ہو جائے گی۔"

"خط پڑھ چکا تو ماں نے دکھیاری سی مسکراہٹ سے کہا کہ میں نہیں رووں گی۔ سینہ جل رہا ہے، لیکن آنکھ میں آنسو نہیں آنے دوں گی..... اُس نے اپنے بیٹے کے متعلق صرف اتنی سی بات پوچھی کہ وہ آگے شہید ہوا تھا یا کہیں پیچھے؟ میں نے اُسے بتایا کہ وہ اتنا آگے شہید ہوا تھا جہاں کوئی مرد کا بچہ ہی جا سکتا ہے۔ ماں کے سینے سے لمبی آہ نکلی اور اُس نے بڑے سکون سے کہا۔ 'اللہ تیرا شکر ہے'۔ پھر میں نے اُسے سارا واقعہ سنایا تو وہ 'اللہ تیرا شکر' کا ہی وِرد کرتی رہی۔ میں نے جب اُس کی قبر کا ذکر کیا تو اُس نے کہا مجھے اُس کی قبر پر لے چلو.....

"اُس وقت مجھے خیال آیا کہ مجھے تو یاد ہی نہیں کہ میں نے اُسے کہاں دفن کیا تھا؟ علاقہ یاد تھا۔ میں نقشے پر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن قبر کہاں کھودی تھی؟ اُس پر ٹینک پھرتے رہے تھے۔ میں ماں کو یہ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ تیرے بیٹے کی قبر ہی نہیں ہے۔ میں نے دماغ پر زور دیا، ایک بات دماغ میں آ گئی اور میں نے اُسے قبر دکھانے کی ہامی بھر لی.....

"دوسرے ہی دن اُسے ساتھ لیے سیالکوٹ پہنچا اور وہاں سے ایک گاؤں کا رُخ کیا جس کا میں نام نہیں بتاؤں گا۔ میں ایک بار پھر اُس میدان کو دیکھ رہا تھا، جہاں ہم نے ملک کی خاطر زندگی اور موت کا معرکہ لڑا تھا۔ میرے سینے میں ایک بار پھر نعرے گونجنے لگے اور ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ میں لڑتے وقت نہیں ڈرا تھا، لیکن خالی میدان کو دیکھ کر میرا جسم کانپنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میرے سامنے اب ایک بڑی ہی دشوار مہم تھی۔ یہ یقین تھا کہ قبر نہیں مل سکے گی۔ قبر تھی ہی کہاں؟.....

"دُور آگے ہم ایک گاؤں میں داخل ہوئے تو میں نے شہید کی ماں کو ایک جگہ بٹھا دیا اور خود اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں گاؤں کے بزرگ سے ملا اور اُسے اصل بات کہہ سنائی۔ بزرگ کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے

کہا کہ وہ اس مسئلے کو سلجھا دے گا۔ وہ میرے ساتھ آیا اور ہم دونوں شہید کی ماں کو اس کے گھر لے گئے۔ روٹی کا وقت تھا۔ گھر والوں نے اُسے روٹی پہ بٹھا لیا اور مجھے بزرگ باہر لے گیا۔ پون گھنٹے بعد ہم واپس گھر میں آئے تو میں نے شہید کی ماں سے کہا آؤ قبر مل گئی ہے۔ وہ اُٹھی اور گاؤں کے ساتھ ہی میں اُسے ایک خالی کھیت میں لے گیا۔ وہاں مٹی کی قبر بنی ہوئی تھی جس پر گاؤں کے دو آدمی پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے.....

"میں نے ماں سے کہا کہ دیکھو گاؤں والے شہیدوں کی قبروں کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ ماں قبر کے پاس گئی۔ گیلی مٹی پر ہاتھ پھیرنے لگی اور قبر کے سرہانے بیٹھ کر بے تحاشہ رونے لگی۔ اتنا روئی کہ میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ گاؤں کی کئی عورتیں بھی آ گئیں، سب رو رہی تھیں۔ ماں نے اپنا دوپٹہ اُتارا اور قبر پہ بچھا دیا۔ گاؤں کی دو عورتیں آگے بڑھیں اور اپنے اپنے دوپٹے شہید کی ماں کے سر پہ ڈال دیئے۔ وہ بزرگ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ خاطر مدارات کی اور ماں سے دونوں دوپٹے لے کر اُسے دو نئے دوپٹے، ایک قمیض کا اور ایک شلوار کا کپڑا پیش کیا۔ کپڑوں پر دس دس کے دو نوٹ رکھے تھے۔ بزرگ نے کہا کہ یہ بیٹی کا حق ہے.....

"جب ہم گاؤں سے نکل کر دُور آ گئے تو ماں نے گھوم کر قبر کو دیکھا اور عجیب سے طریقے سے ہنس پڑی۔ مجھے کہنے لگی۔ 'اب نہیں رووں گی'.... اور بھائی صاحب! وہ بالکل نہیں روتی۔ کبھی کبھی آہ بھر کر کہتی ہے، اللہ تیرا شکر ہے۔ بیٹا شہید ہوا ہے....."

میرے ہمسفر نے کہانی سنا کر بے چینی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور التجا کے لہجے میں کہنے لگا۔ "بھائی صاحب سچ بتائیے آپ کا علم کیا کہتا ہے؟ میں نے اُس ماں کو جو قبر دکھائی تھی وہ قبر نہیں تھی۔ وہ تو میرے کہنے پر اس بزرگ نے ایک کھیت کے کنارے مٹی کی قبر نما ڈھیری بنا دی تھی اور اوپر پانی کا چھڑکاؤ کر دیا

تھا کہ یہ شک نہ ہو کہ یہ ڈھیری ابھی بنائی گئی ہے۔ اس ڈھیری میں کوئی شہید
دفن نہیں ہے۔ بزرگ نے مجھے کہا تھا کہ اس کھیت میں یہ ڈھیری ہمیشہ قائم
رہے گی۔ بھائی جی! میں نے میدان جنگ میں کھڑے ہو کر جھوٹ بولا ہے،
میں نے ایک شہید کی ماں کو دھوکہ دیا ہے۔ وہ میدان ہمارے لیے اب بھی
پاک ہے۔ اس مٹی میں شہیدوں کا خون مل گیا ہے۔ میں نے اس پاک مٹی
پر کھڑے ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ میں گناہگار ہوں بھائی جی؟....."

"نہیں میرے عزیز! بالکل نہیں" میں نے اُسے دلائل دے کر قائل کر لیا کہ
یہ کوئی گناہ نہیں ہے اور ایک شہید کی ماں کی تسکین کی خاطر اُس نے جو کچھ کیا
ہے، وہ درست ہے۔ شہید کہاں دفن نہیں ہیں؟ جہاں کسی غازی کے خون
کا ایک قطرہ گرا وہ ایک شہید کی قبر ہو گئی۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے ہمسفر کی تسلی ہو گئی۔ کہنے لگا کہ آپ نے میرے
ضمیر سے بوجھ اتار دیا ہے۔ اُس کے تو آنسو بہہ نکلے تھے۔ لیکن پھر مسکرانے لگا۔
میں اُس سے جنگ کے اور واقعات سننے کا خواہش مند تھا۔ اُس نے کہا کہ
جسے آپ کارنامے کہتے ہیں وہ ہمارے فرائض تھے۔ کون کون سا واقعہ
سناؤں؟ اُس نے کہا۔ "اب تو ہم آپ کا کارنامہ دیکھنا چاہتے ہیں"

"ہمارا کارنامہ؟"

"جی، آپ کا۔" اُس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم کم علم اور کم عقل
لوگ تھے، دیہات کے رہنے والے کسان اور چرواہے۔ ہم پہ بازی آئی
تو ہم نے بازی جیت لی۔ جانیں بھی قربان کیں، آنکھیں بھی، ٹانگیں بھی اور
بازو بھی۔ جو زندہ رہے وہ دُکھ سے کہتے ہیں کہ ہم شہید نہ ہوئے۔ اب بازی
آپ کے سر ہے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ نے سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں۔
آپ عالم فاضل ہیں۔ آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ پاک افواج نے جس ایثار
سے اپنا فرض ادا کیا اسی ایثار سے آپ ان کہانیوں کو ڈھونڈ کر تاریخ میں

ڈال دیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھے شاباش دیں۔ ہم نے جو کچھ کیا وہ
ملک اور قوم کے نام پر کیا، اخباروں اور رسالوں کے لیے نہیں کیا۔ تمغوں اور
انعاموں کے لیے نہیں کیا، لیکن ہمارے بعد آنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے
کہ ہم سے پہلے جو گزر گئے ہیں، وہ بہادر، غیرت مند اور جانباز تھے۔ پاک
فوج کے نئے سپاہی کو معلوم ہو کہ اسے جو ہتھیار دیا گیا ہے وہ ایک شہید کا
ہے اور یہ بھی کہ وہ کس طرح بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہوا تھا۔ یہ کام آپ
کا ہے۔ اب وقت یہ دیکھے گا کہ اس ملک کے کم عقل اور ان پڑھ دیہاتی اچھے تھے
یا عالم فاضل قلمکار......؟

"جنگ میں سب سے زیادہ خوفناک ڈیوٹی او پی O.P کی ہوتی ہے"
اس نے واقعہ سنایا۔ "وہ دشمن کے منہ کے سامنے بیٹھ کر اپنے توپخانے
اور مارٹروں سے دشمن کی دکھتی رگوں پر فائر کراتا ہے۔ دشمن سب سے پہلے
'او پی' کو ڈھونڈتا ہے اور اُسے تباہ کرتا ہے۔ اگر گولے تارگیٹ پر نہیں گر
رہے تو سمجھ لیجیے کہ 'او پی' بزدل ہے، کہیں چھپ کے بیٹھا ہے اور اندھادھند
فائر کرا رہا ہے۔ ہمارا ایک حوالدار ہے، جو اب گھر چلا گیا ہے، کیونکہ اُس کی بائیں
ٹانگ شہید ہو گئی تھی۔ وہ ایک روز اپنی مارٹر پلاٹون کا 'او پی' تھا۔ دشمن کا
بہت زور تھا۔ حوالدار بہت آگے نکل گیا اور جب اُس نے دشمن کی رگیں دیکھ
کر فائرنگ کرائی تو دشمن کا زور رُکنے لگا لیکن حملہ پسپا نہیں ہو رہا تھا۔ ہمارے
حوالدار نے ایسے ایسے گولے فائر کرائے کہ حملہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اتنے میں اس
حوالدار کے قریب توپ یا مارٹر کا گولہ پھٹا جس سے اس کی بائیں ٹانگ کٹ
گئی لیکن جسم سے الگ نہ ہوئی۔ اس حوالدار نے پروا نہ کی اور اسی جگہ سے دشمن
کو دیکھ دیکھ کر فائر کرواتا رہا۔ گولے ٹھکانے پہ جا رہے تھے۔ دشمن پیچھے ہٹنے
لگا تو حوالدار کو اپنی پوزیشن بدلنی پڑی۔ وہ آگے رینگنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ
کٹی ہوئی ٹانگ اُسے پریشان کر رہی تھی۔ اُس نے زخم کا معائنہ کیا۔ ہڈی

بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ پٹھے کٹ گئے تھے اور ٹانگ ایک طرف سے صرف کھال کے سہارے جسم سے لگی ہوئی تھی۔ حوالدار نے چاقو نکالا اور ٹانگ کو جسم سے الگ کر دیا۔ پھر اپنی بش شرٹ اتاری اور زخم پر رکھ کر اوپر پٹیاں کس دیں.....

"تھوڑی دیر بعد دشمن پسپا ہو گیا لیکن 'او پی' نہ واپس آیا نہ اُس کے ساتھ وائرلیس کا ملاپ رہا۔ جا کے دیکھا تو وہ خون بہہ جانے سے بے ہوش پڑا تھا۔ اُسے اٹھا کر پیچھے لے آئے۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اگر آپ اُسے ملیں تو اُسے ہر وقت ہنستا مسکراتا دیکھیں گے۔"

"وہ کس پلٹن کا تھا، کون تھا؟" مَیں نے پوچھا اور مَیں نے ہنس کر کہا۔ "وہ آپ ہی تو نہیں تھے؟"

"جی نہیں"۔ اُس نے بھی ہنس کر کہا۔ "میری تو دونو ٹانگیں سلامت ہیں۔ وہ کوئی اور تھا۔ آپ اُس کے نام نمبر اور پلٹن کو چھوڑیئے۔ میں نے یہ واقعہ اس لیے سنایا ہے کہ آپ لکھ لیں تاکہ فوجی پڑھیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ کامیاب 'او پی' دشمن کی کمر کس طرح توڑ سکتا ہے۔"

اتنے میں ریل کار کی رفتار کم ہونے لگی۔ گوجر خان کا ریلوے سٹیشن آ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ صبح کی ریل کار یہاں تو رکتی ہی نہیں۔ یہ گوجر خان کیسے اترے گا؟ پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس نے لاہور ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ اُسے گوجر خان اترنا ہے۔ کہنے لگا۔ "آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ جنگ میں فوج اور ریلوے کی بڑی قریبی رشتہ داری ہوتی ہے۔ یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو ہم فوجی نہتے رہ جاتے ہیں۔ فوج اور ریلوے کو ایک دوسرے سے بہت پیار ہے۔ وہ مجھے گوجر خان اتار دے گا۔"

ریل کار رک گئی۔ میرا ہمسفر اُٹھا۔ میں بھی اس کے ساتھ اُٹھا۔ وہ ریل کار سے اترنے لگا تو دیکھا ڈرائیور اپنی سیٹ پر سے اتر کر ریل کار کے دروازے

میں کھڑا تھا۔ ڈرائیور نے ہاتھ بڑھایا اور میرے ہمسفر کا ہاتھ تھام لیا۔ جب وہ اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ دقت محسوس کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اُسے سہارا دے کر اتارا۔ میں کود کے نیچے اترا اور اُس کی بائیں ٹانگ پر ہاتھ رکھا۔ اُس کی بائیں ٹانگ مصنوعی تھی۔

ڈرائیور اس سے ہاتھ ملا کر اپنی سیٹ پر چلا گیا اور ریل کار چل پڑی۔ میں نے اپنے ہمسفر سے پوچھا۔ "وہ حوالدار آپ ہی تھے نا؟"

"نہیں!" اُس نے کہا۔ "وہ کوئی اور تھا۔ آپ جائیے گاڑی چل پڑی ہے۔"

میں ریل کار کے پائیدان پر کھڑا ہو گیا اور وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ہاتھ لہرانے لگا۔ ریل کار تیزی سے آگے نکل گئی اور میں اپنے جانباز ہمسفر کا ہلتا ہوا ہاتھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں۔ وہ میری پلکوں کے دھندلکے میں کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ جب خیال آتا ہے کہ مجھے اس کا نام پتہ معلوم نہیں تو میں جھنجلا کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کرتا ہوں کہ وہ کوئی اور تھا۔

انٹرویو: میجر نصرت جہاں بیگ تمغۂ قائداعظم

جب زخمی ہسپتال میں آئے

وہ بے ہوشی میں نعرے لگاتے تھے۔
اپریشن ٹیبل سے اٹھ اٹھ کر محاذ
پر جانے کو دوڑتے تھے۔ وارڈ
نعروں سے لرزتے رہتے تھے۔

"ہسپتال میں اپریشن کی میز پر پاک فوج کے زخمی غازیوں کے نعرے اور ان کا بے ہوشی میں اُٹھ اُٹھ کے محاذوں پر جا پہنچنے کے لیے تڑپنا اور چلاّنا، میں کبھی نہیں بھول سکوں گی ....." میجر نصرت جہاں بیگ نے کہا۔ "ان کے نعرے اور ان کے ولولہ انگیز واویلے ابھی تک میرے ذہن میں گونج رہے ہیں۔ یہ گونج میرے خیالوں، میرے تصوّروں اور میری زندگی کا جزو بن گئی ہے ....."

میجر نصرت کے انٹرویو کے لیے میں ملتان گیا اور شام کو ان کے دروازے پر جا دستک دی۔ میں ان سے مفصّل ملاقات کا وقت مقرر کرنے گیا تھا لیکن میرا مدعا سُن کر انہوں نے کہا کہ اس مقصد کے لیے تو وہ ہر لمحہ باتیں کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ بات شروع ہو گئی۔ ان کے انداز اور لب و لہجے میں رقّت اور جذباتیت کا تاثر نمایاں تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس پُروقار عورت کے سینے میں ایک غبار رُکا ہوا ہے جو اندر ہی اندر دھوئیں کی صورت میں اُٹھ اُٹھ کر ان کی آنکھوں کو لگ رہا ہے — باتیں سناتے ان کی آنکھیں لال سُرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ کہنے لگیں — "میں باتیں سناتے نہیں تھکوں گی۔ آپ سنتے تھک جائیں گے مگر جو جانباز اپریشن ٹیبل پر لیٹے ہوئے اس وقت شہید ہو گئے جب ہم ان کے زخم سینے اور خون بند کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے، میں ان کی آخری باتیں نہ سنا سکوں گی۔ دل بھر آتا ہے اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ میری ماں، بہن یا بیوی بچوں کو بلا دو یا انہیں اطلاع دے دو۔ وہ سب محاذ کی باتیں کرتے، محاذ پہ لڑتے اپنے ساتھیوں کی باتیں کرتے، پاکستان کی سلامتی کی باتیں کرتے، اپریشن ٹیبل پر شہید ہو گئے ....."

شہیدوں کو آخری سفر پہ رخصت کرتے اور غازیوں کے زخم سیتے، نصرت کے دل پر جو زخم آئے ہیں ان کے نشان گہرے اور انمٹ ہیں۔ در اصل نصرت جہاں کی دو شخصیتیں ہیں — وہ پاکستانی عورت بھی ہیں اور دردمند نرس بھی — ان کی نرسنگ عہدے اور تنخواہ تک محدود نہیں، بلکہ یہ تعلق ان کے جذبات کی گہرائیوں تک پہنچا ہوا ہے۔ ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے جب اُن کے والد مرحوم گُردے کی خرابی کی بنا پر راولپنڈی ہولی فیملی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ اُس وقت نصرت جہاں سکول میں پڑھتی تھیں اور والد صاحب کو دیکھنے ہر روز ہسپتال جایا کرتی تھیں۔ ان کے والد صاحب کا اپریشن ہوا لیکن وہ تھوڑے دنوں بعد وفات پا گئے۔

میجر نصرت جہاں کہتی ہیں کہ میں گھر میں سب سے بڑی لڑکی تھی۔ میں ہسپتال میں رہ کر والد صاحب کی تیمارداری کرنا چاہتی تھی لیکن والد صاحب نرسوں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ نصرت بیٹی! ان نرسوں کی موجودگی میں مجھے کسی اور بیٹی کی ضرورت نہیں۔ اور یہ تو میں بھی دیکھا کرتی تھی کہ ہسپتال کی نرسیں کس خلوص اور پیار سے میرے مرحوم والد صاحب کی تیمارداری کیا کرتی تھیں۔ ان کے انداز میں بیٹیوں کا خلوص تھا۔ خود والد صاحب مرحوم اکثر بے ساختہ کہا کرتے تھے کہ کیا دن کیا رات یہ نرسیں بیٹیوں کی طرح میری خدمت کرتی ہیں۔

نصرت کہتی ہیں کہ گاہے یوں لگتا تھا جیسے یہ نرسیں موت اور میرے والد صاحب کے درمیان کھڑی ہیں۔ صرف میرے والد صاحب ہی نہیں یہ نرسیں ہر مریض کے ساتھ بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ میں ایک بے بس بیٹی تھی۔ مجھے ملک کی سینکڑوں ہزاروں بے بس بیٹیوں کا خیال آیا۔ پھر یہ خواہش اُمڈی کہ میں بھی نرس بن کر مریض باپوں اور ان کی بے بس بیٹیوں کا سہارا بنوں

اور جب میرے والد صاحب ہسپتال میں ہی فوت ہو گئے تو میری خواہش
عزم بن گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بھی نرس بن کر خدا کے علیل بندوں کی
تیمار داری کروں گی۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی میجر نصرت جہاں بیگ نرسنگ کی تربیت کے لیے
ہولی فیملی ہسپتال میں شامل ہو گئیں۔ ان کے سامنے چونکہ ایک عزم اور بنی نوع
انسان کا درد تھا اور ان کے جذبات اور روح بھی ان کے عزم سے ہم آہنگ تھے
اس لیے نصرت جہاں بہت جلدی نرسنگ کے مقدس فن کے عروج پہ جا پہنچیں۔
انہوں نے زیادہ تر اپریشن تھیٹر میں کام کیا۔ ۱۹۵۷ میں انہیں لیفٹیننٹ کے عہدے
پہ پاک فوج میں لے لیا گیا۔ ۱۹۶۲ میں انہیں کیپٹن بنا دیا گیا اور اب نصرت میجر
ہیں۔ ستمبر کی جنگ کے دوران اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں انہیں تمغۂ قائد اعظم عطا
کیا گیا ہے۔ میجر نصرت جہاں پہلی خاتون ہیں جنہوں نے یہ اعزاز حاصل کیا
ہے۔

"لیکن ....." نصرت کہتی ہیں۔ "نرس کا عظیم ترین اعزاز وہ دعائیں ہوتی ہیں
جو مریضوں کے دلوں سے نکلتی ہیں۔ نرس اسی ایک اعزاز کی دل و جان سے
قدر کرتی ہے۔"

جب بھارت نے لاہور پر حملہ کیا اُس وقت نصرت لاہور کے فوجی ہسپتال
میں تھیں۔ محاذ کا پہلا زخمی جو آیا وہ ایک رینجر تھا۔ زخم گہرے نہیں تھے۔ میجر
نصرت کہتی ہیں۔ "اس رینجر نے جب یہ بتایا کہ سرحد سے بی آر بی نہر تک، بھارت کی
بے پناہ فوج، ٹینکوں اور توپوں نے قیامت بپا کر رکھی ہے تو مجھ پر کئی طرح کے
خوف طاری ہونے لگے۔ ایک یہ کہ کیا پاک فوج اس قدر طوفانی یلغار کو روک لے
گی؟ اور دوسرے یہ کہ محاذ کے زخمی آنا شروع ہوئے تو ہم اتنے کیس کس طرح
سنبھالیں گے اور اس قدر خون کہاں سے آئے گا؟ ایک مشکل یہ بھی نظر آ رہی
تھی کہ ذرا سے زخم یا اپریشن سے مریض چیخ چیخ کر دن رات وارڈ سر پہ اٹھائے

رکھتے ہیں، لیکن محاذ کے زخمیوں کی تو ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہوں گی، اعضا کٹے ہوئے
ہوں گے اور جانے کیسے کیسے بھیانک زخم ہوں گے، وہ تو ہمارا جینا محال کر
دیں گے۔"

"لیکن ....." نصرت نے کہا۔ "جب محاذ کے زخمی سپاہی آئے تو انہوں نے
ہمارے لیے ایک ایسی مشکل پیدا کر دی جو کم از کم میرے لیے انوکھی تھی۔ ہم
میں سے کسی کو بھی پاک فوج کے جذبۂ ایمان پہ شک نہ تھا لیکن ہم میں سے کسی
ایک کو گمان تک نہ تھا کہ اپریشن تھیٹر میں اور وارڈوں میں یوں بھی ہو گا۔ جو
زخمی ہوش میں تھے وہ ہسپتال سے بھاگ کر محاذ پر پہنچنا چاہتے تھے۔ انہیں
روکے رکھنا ہمارے لیے محال ہو گیا اور جو بے ہوش تھے ان کا لاشعور جاگ رہا
تھا۔ وہ غشی میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگاتے تھے، اپنے کمانڈروں کو
پکار پکار کر ایمونیشن مانگ رہے تھے۔ ہمارے لیے ان کے زخموں کو ٹانکے لگانا
اور خون روکنا ناممکن ہو رہا تھا ....." میجر نصرت پر رقت طاری ہو گئی اور وہ
چپ ہو گئیں۔ ذرا سی خاموشی کے بعد کہنے لگیں۔ "پہلے ہی روز زخمی سپاہیوں
کی یہ کیفیت دیکھ کر میرا خوف جاتا رہا اور مجھے یقین ہو گیا کہ بھارت خواہ کتنے
ہی لشکر سے حملہ آور ہوا ہے بی آر بی سے آگے نہ آ سکے گا۔ البتہ یہ مسئلہ درپیش
تھا کہ اتنا خون کہاں سے آئے گا؟ ان زخمیوں کو زندہ رکھنے کے لیے تو خون کے
تالاب کی ضرورت تھی لیکن یہ مسئلہ پہلے دن ہی حل ہو گیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہسپتال
کے برآمدوں میں خون دینے والے مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔
انہیں کس نے کہا تھا کہ خون دے آؤ؟ مجھے آج تک معلوم نہیں۔ ایک ڈاکٹر
نے خون لینا شروع کر دیا۔ دن گزر گیا۔ لیکن خون دینے والوں کے ہجوم میں ایک
فرد کی بھی کمی نہ ہوئی۔ پھر ریڈ کراس سے گیلنوں کے حساب سے خون آنا شروع
ہو گیا۔ اس پر ہم نے خون دینے والوں کو ریڈ کراس کے مرکز میں بھیجنا شروع کر
دیا۔ کچھ بعید نہیں کہ یہی ہجوم یہاں خون دے کر وہاں بھی دے آیا ہو ....." میجر

نصرت نے جذبات سے بھرپور آواز میں کہا۔ "بھائی جان! آپ پاکستانی ہیں لیکن آپ کو ابھی تک صحیح طور پر اندازہ نہیں کہ پاکستانی قوم کس قدر بلند کردار قوم ہے! پانچ ستمبر تک تو مجھے بھی اندازہ نہ تھا!"

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اخباروں رسالوں کو انٹرویو دینے والی شخصیتیں اپنی ذات کو نمایاں رکھتی ہیں لیکن نصرت نے اپنی ذات کے متعلق بات تک نہ کی، نہ اس کارنامے کا ذکر کیا جس کے صلے میں انہیں تمغۂ قائداعظم ملا ہے۔ وُہ دوسروں کے کارناموں اور ولولہ انگیزیوں کی باتیں سناتی رہیں۔ وہ تو میں نے پوچھ لیا کہ آپ جنگ کا سارا ہی عرصہ مصروف رہی ہوں گی لیکن آپ نے مسلسل، بغیر آرام کئے کتنی دیر کام کیا ہے۔ اس پر وُہ بولیں کہ وُہ موقع ایسا تھا کہ وقت اور آرام کا احساس مِٹ گیا تھا۔ ویسے اب یاد آتا ہے کہ میں نے جنگ کے پہلے چار دن اور چار راتیں مسلسل آپریشن تھیٹر میں گذارے ہیں۔ سی ایم ایچ کے کمانڈنٹ کرنل ممتاز، اور سارا عملہ مسلسل اپریشن روم میں رہے۔ لمحہ بھر کے لیے کسی کو اونگھ بھی نہ آئی۔ ہم زخمیوں کے زخم سیتے رہے، انہیں خون دیتے رہے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔

پاک فوج کے ہر زخمی اور شہید ہونے والے کا ردِ عمل، تاثرات اور احساسات ایک جیسے تھے۔ ایک زخمی کو لایا گیا۔ وُہ سپاہی تھا۔ توپ کا گولہ یا گرینیڈ اس کے قریب آپھٹا تھا۔ اُس کے جسم کی بوٹیاں باہر آرہی تھیں۔ جسم کا کوئی حصہ سلامت نہ تھا۔ تمام زخم گہرے تھے۔ اُسے اپریشن ٹیبل پر ڈالا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کا بچنا ممکن نہیں۔ پھر بھی ہم اس کے قیمہ کئے ہوئے جسم میں خون ڈالنے لگے اور خون زخموں کی راہ بہنے لگا۔ کوئی بھی زخم ایسا نہ تھا جسے ہم دو ٹانکے لگا سکتے۔ وہ ہوش میں آگیا اور اچک کر اپریشن ٹیبل سے اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر کو چل پڑا۔ میں نے لپک کر اُسے روک لیا اور ٹیبل پر لیٹنے کو کہا۔ اُس نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور بولا۔ "تم مسلمان ہو؟ مسلمان ہو تو کلمہ

پڑھو۔" میں نے کلمہ شریف پڑھا اور اُسے تھام کر اپریشن ٹیبل کی طرف لے جانے لگی تو اُس نے عتاب آلود لہجے میں کہا۔ "تم مسلمان ہو اور مجھے یہاں لیٹ جانے کو کہہ رہی ہو؟ جانتی ہو محاذ پر قیامت مچی ہوئی ہے؟ میں ٹینکوں اور گاڑیوں کو پیٹرول دینے کی ڈیوٹی پر تھا۔ معلوم نہیں میری جگہ کوئی پیٹرول دینے والا ہے یا نہیں۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ ٹینکوں کو پیٹرول کون دے گا؟ ٹینک رک گئے تو دشمن کو کون روک سکے گا؟ دشمن کو کسی نے نہ روکا تو جانتی ہو کیا ہو جائے گا؟ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ مجھے اپنی ڈیوٹی پر جانے دو..."

"اور وہ مُجاہد بے ہوش ہو گیا۔ ہم نے اسے بچانے کی سر توڑ کوشش کی لیکن خدا نے اُسے اس دنیا کی ڈیوٹی دینے سے سبکدوش کر دیا!"

"بھائی جان!" نصرت نے کہا۔ "آنسو روکے رُکتے نہ تھے۔ تنہائی میں جا کر رونے کو جی چاہتا تھا۔ کہتے ہیں نا کہ شہیدوں پہ رونا گناہ ہے۔ لیکن ان گٹھے ہوئے جوانوں کا خیال دل کو تڑپا دیتا تھا جو ماؤں کے لاڈلے تھے، بہنوں کے ویر تھے، بچّوں کے باپ اور بیویوں کے سرتاج، گھروں سے دُور خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے اللہ اور پاکستان کا نام لیتے ہوئے دُنیا سے رخصت ہو گئے......

"بیشتر جوان ہسپتال میں تازہ خون دینے سے ہوش میں آتے تھے تو پہلی بات یہ پوچھتے تھے "گولی پیٹھ پر تو نہیں لگی؟ اور یہ حقیقت ہے..." میجر نصرت جہاں کہتی ہیں "کہ تقریباً تمام زخمیوں کے زخم سینے اور پیٹ کے تھے۔ ایک نوجوان سپاہی کو میں نے کہا کہ بھائی اگر گولی پیچھے لگ گئی تو کیا ہوا یہ تو جنگ ہے میدان میں سپاہی آگے پیچھے تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ وُہ بڑی معصومیت سے بولا۔ 'بات یہ ہے جی کہ میں نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ ماں گولی سینے پہ کھاؤں گا۔' اور ایک غازی ایسا آیا جس کی ٹانگ پر ترچھی گولی لگی تھی لیکن دوسری طرف سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ہم نے گولی نکالنے کے لیے اُس کی ٹانگ

کا اپریشن کیا تو گولی کا سراغ نہ ملا۔ اس دوران یہ جوان بڑے مزے سے باتیں کرتا رہا۔ کہنے لگا کہ ایک خوشی ضرور ہے کہ ۱۹۴۸ء کا جو غبار سینے میں رُکا ہُوا تھا آج وُہ نکل گیا ہے لیکن دُکھ یہ ہے کہ ایک تو میں بہت جلدی زخمی ہو گیا اور دوسرا یہ کہ گولی لگنی ہی تھی تو سینے میں لگتی ٹانگ میں نہ لگتی۔ میری ماں فخر سے یہ بھی نہیں کہہ سکے گی کہ میرے بیٹے نے سینے میں گولی کھائی ہے۔ میجر نصرت بتاتی ہیں کہ ڈاکٹر اس کی ٹانگ کا اپریشن کر کے گولی تلاش کرتا رہا۔ لیکن گولی نہ ملی اور یہ زخمی مجاہد بار بار افسوس کرتا رہا کہ اُسے گولی سینے میں نہیں لگی تھوڑی ہی دیر بعد اُس کی سانسیں اُکھڑ گئیں اور وہ باتیں کرتا کرتا شہید ہو گیا۔ ہم حیران کہ ٹانگ کے زخم سے موت کیسے واقع ہو گئی؟ ہم نے اُس کی لاش میں گولی کا سراغ لگانا شروع کیا تو دیکھا کہ گولی ترچھی آئی تھی جو اُس کی ٹانگ سے ہوتی ہوئی پیٹ سے گذری اور اُس کے سینے میں جا رُکی وہ بے چارہ یہ افسوس لے کے شہید ہو گیا کہ گولی اُسے سینے میں نہیں لگی لیکن اُسے بھی اور ہمیں بھی معلوم نہ تھا کہ گولی اُس کے سینے میں پہنچی ہوئی تھی جس نے اُس کی جان لے لی۔"

میجر نصرت جہاں بیگ کہتی ہیں کہ ہمارے پاس اکثر ایسے زخمی لائے جاتے تھے جن کے بچنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ وہاں تو میڈیکل سائنس اور آج کے دَور کی سرجری کے کمالات بھی بے بس نظر آتے تھے لیکن یہ مجاہد نہ صرف یہ کہ زندہ رہے بلکہ نعرے لگا کر زندہ رہے۔

"یہ آپ کے خلوص اور پیار کا کمال ہے"۔ میں نے کہا۔

"جی نہیں!" نصرت بولیں "یہ ان غازیوں کا اپنا کمال ہے۔ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے بھارت کا ہی نہیں، موت کا بھی منہ پھیر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں جینے کی خواہش نہیں عزم تھا۔ یہ قوتِ ارادی کی غیر معمولی مثالیں ہیں جو ہم نے اپریشن تھیٹر میں پہلی بار دیکھی

ہیں۔ ورنہ حادثات کے اکثر زخمی زخموں سے نہیں زخموں کی دہشت سے مر جاتے ہیں، ان کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے کٹے ہوئے غازیوں کے دل فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ مثلاً ایک سپاہی لایا گیا جس کی دونو ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ خون سارا ہی بہہ گیا تھا لیکن وُہ ہوش میں تھا اُسے ہم نے بچا لیا۔ مگر بے چارہ عمر بھر کے لیے اپاہج ہو چکا تھا۔ وُہ کہہ رہا تھا "ڈاکٹر صاحب زخم جلدی ٹھیک کر دیں میں واپس جاؤں گا"۔ میں نے اُسے کہا کہ بھائی تمہاری تو دونو ٹانگیں کٹ گئی ہیں تو وُہ یوں بولا جیسے اُسے ہلکی سی خراش آئی ہو۔ کہنے لگا "فکر نہیں۔ میں گن فائر کر سکتا ہوں۔ میں ٹینک میں بیٹھ کر گن چلاؤں گا۔ آپ میرے زخم جلدی ٹھیک کر دیں"۔ میں نے اُسے جب بھی دیکھا ہشاش بشاش دیکھا۔ وُہ ہر لمحہ توقع لگائے بیٹھا رہا کہ زخم ٹھیک ہو جائیں اور وُہ کٹی ہوئی ٹانگوں سے ہی ٹینک میں محاذ پر لڑے گا"۔

"چہرہ تو ہر زخمی غازی کا ہشاش بشاش ہی رہتا تھا"۔ نصرت نے کہا۔ "لیکن اکثر سپاہی شکایت کرتے تھے کہ بھارتی ٹینکوں اور توپوں سے لڑے ہیں اور ہم بھی ٹینکوں توپوں اور مشین گنوں سے لڑے ہیں۔ لیکن یہ کوئی جنگ نہیں، ہم تو ان ہندوؤں کے ساتھ دست بدست لڑائی لڑنا چاہتے تھے، بیونٹ سے بیونٹ ٹکراتا، مرد سے مرد ٹکراتا اور ایک دوسرے کے خون کے چھینٹے ایک دوسرے پر پڑتے تو ہم کہتے کہ کافروں سے لڑائی لڑی ہے......" میجر نصرت جہاں نے بتایا کہ دست بدست لڑائی کے زخمی بھی آئے تھے۔ جسموں پر سنگینوں کے گہرے اور خطرناک زخم کھا کر بھی وُہ سب سے زیادہ خوش تھے کیونکہ انہوں نے بہت کافر مارے تھے اور اپریشن ٹیبل پر بھی نعرے لگا لگا کر کہتے تھے کہ سینے کا غبار نکل گیا ہے۔ کافر سے بدلہ لے لیا ہے۔ اور ایسے زخمیوں کی تو کمی ہی نہیں تھی جو اپریشن اور مرہم پٹی کے دوران چلّاتے تھے۔ "جلدی، ڈاکٹر صاحب جلدی کرو، مجھے واپس جانا ہے......" انسان کی اصلی شخصیت

REAL SELF اُسی وقت اُبھرتی ہے جب اُس کا شعور
نشے یا غشی کی وجہ سے سو جاتا ہے۔ اُس وقت تحت الشعور سے انسان کی
صحیح شخصیت اور کردار کا اصلی روپ اُبھر آتا ہے۔ نصرت نے کہا"..... اور میں نے
اپنے جانباز فوجیوں کا اصلی روپ دیکھا ہے۔ یہ بے ہوش سپاہی، زخموں سے
چور، نقاہت سے نڈھال، جانے اتنی طاقت کہاں سے لے آتے تھے کہ ان کے
نعروں سے وارڈ ہل جاتا تھا۔ دن رات وارڈوں میں بے ہوش اور نیم بے ہوش
زخمیوں کے نعرے گونجتے رہتے تھے، ان کا لاشعور ابھی تک میدانِ جنگ میں
لڑ رہا ہوتا تھا۔ وہ چلاتے تھے۔ نعرۂ تکبیر..... پاکستان زندہ باد..... بولو نعرۂ
حیدری..... یا علیؑ..... ٹینک چل رہا ہے..... میجر صاحب! میرے میجر صاحب
کہاں ہیں..... ایمونیشن..... ایمونیشن..... پاکستانیو بے غیرت نہ ہو جانا.....
پاکستانیو، کٹ مرو..... لال قلعے پر جھنڈا چڑھا کے دم لو..... جوانو، شاستری
کے گھٹنے تک پہنچ کے بس کرو..... نعرۂ تکبیر..... پاکستانی جوانو، ایک انچ پیچھے نہ
ہٹنا..... سن سینتالیس کے بدلے لے لو مسلمانو..... اللہ ہی اللہ....." اور وارڈ
ان نعروں سے لرزتے رہتے تھے۔ بعض سپاہی بے ہوشی میں بستروں میں
اپنی رائفلیں ڈھونڈتے تھے۔ وہ پوچھتے تھے۔ میری رائفل کہاں ہے، میری
گن کہاں ہے؟"

"اور میں اُس سپاہی کو کیسے بھول سکوں گی....." نصرت نے جذبات
سے لرزتی آواز میں کہا۔ "میجر حبیب شہید (جو ۱۱ ستمبر کو کسی سیکٹر میں زخمی
ہوئے تھے) کے ساتھ اس سپاہی کو زخمی حالت میں لایا گیا۔ میں ایک اور
زخمی کو دیکھ رہی تھی، یہ سپاہی میرا ایپرن کھینچ رہا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ
ہوئی تو التجا کرنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب! پہلے میرے میجر صاحب کو دیکھئے، انہیں
بہت زخم آئے ہیں حالانکہ اس کے اپنے زخم بھی معمولی نہیں تھے۔ میجر حبیب
اپریشن ٹیبل پر شہید ہو گئے تھے۔"

یہ تو وارڈوں اور اپریشن تھیٹر کے اندر ہنگامے تھے جن میں ہر زخمی مجاہد
برابر کا شریک تھا۔ میجر نصرت جہاں نے مجھے سنایا کہ ہسپتال کے برآمدوں میں
قوم نے ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ ان میں تحفے دینے والوں کا ہجوم بھی تھا۔ وہ زخمی
غازیوں کے لیے مختلف چیزوں، پھولوں اور پھلوں کا ہر روز ڈھیر لگا جایا کرتا
تھا۔ یہ منظر بھی ناقابلِ فراموش تھا۔ یہیں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس قوم میں ایثار
اور حب الوطنی کا جذبہ کس طرح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ بعض لوگوں کے
چہروں مہروں اور حال حلیے سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں اچھی قسم کی دال روٹی بھی
نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن وہ زخمیوں کے لیے پھل اور سگریٹوں کے کتنے کتنے
پیکٹ لے کے آیا کرتے تھے۔

صرف ایک بھکاری کی سُن لیجئے، اسی سے ساری قوم کے جذبات کا
اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ فقیر سا انسان سگریٹوں کے چار پیکٹ اور تیل کی ایک
بوتل اٹھائے کرنل ممتاز صاحب کے پاس آیا اور یہ چیزیں دے کر کہنے لگا۔
"میں بھکاری ہوں، اس سے زیادہ کچھ خرید نہ سکا۔ یہ زخمی مجاہدوں کو دے دیں۔"
اور یہ بوڑھا بھکاری زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں نے کرنل صاحب
کی آنکھیں بھی پرنم کر دیں۔ انہوں نے کہا۔ "ہمیں کون شکست دے سکتا ہے۔"

سب سے زیادہ قابلِ قدر جذبہ اور مظاہرہ لڑکیوں کا تھا جو اپریشن تھیٹر
اور زخمی سپاہیوں کے وارڈوں کے باہر ہجوم در ہجوم کھڑی رہتی تھیں۔ وہ زخمیوں
کی مرہم پٹی اور تیمارداری کرنے کو آتی تھیں۔ وہ رو رو کر التجا کرتی تھیں کہ "خدا
کے لیے ہمیں وارڈوں میں اتنا سا کام کرنے کی اجازت دے دو کہ زخمیوں کو
پانی پلاتی رہا کریں اور جن کے بازو اور ہاتھ بیکار ہو گئے ہیں انہیں کھانا کھلا دیا
کریں، ہم نرسوں کے ماتحت رہیں گی۔" صرف ہمیں ہی اندازہ تھا کہ ان زخمیوں
کی تیمارداری ان لڑکیوں کے بس کی بات نہیں مگر وہ مانتی نہیں تھیں۔ بخدا
وہ سب کی سب سسکیاں لے لے کے روتی تھیں۔ ذرا تصور فرمائیے کہ ان

میں وُہ لڑکیاں بھی تھیں جنہیں ہم ٹیڈی کہا کرتے تھے۔ جانے ہم نے انہیں
کیا کیا نام دے رکھے تھے۔ ان کے دوش بدوش وُہ پردہ دار لڑکیاں بھی تھیں
جو برقعوں میں لپٹی ہوئی کبھی کبھار باہر نکلا کرتی ہیں۔ ان میں کالج کی لڑکیاں
بھی تھیں اور وہ بھی جنہیں سکول کی تعلیم بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

"یہاں میں نرسوں اور نرسنگ کے پیشے کے متعلق دو چار ضروری باتیں
کہنا چاہتی ہوں" میجر نصرت جہاں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ سول کے ہسپتالوں
کی نرسیں کام کرتے آیا کرتی تھیں۔ یہ ان کے اپنے ہسپتالوں کے علاوہ اضافی
ڈیوٹی تھی۔ کاش، ان نرسوں کو آج پھر آوارہ نگاہوں سے دیکھنے والے مرد
جنگی زخمیوں کی مرہم پٹی اور تیمارداری کرتے دیکھتے وُہ جان جاتے کہ نرس کا
وجود کس قدر مقدس اور نرس کے فرائض کس قدر صبر آزما ہیں۔ ان نرسوں نے
دن رات ایک کئے رکھا۔ ہم ان میں سے کسی کو دو تین گھنٹوں کی چھٹی دیا کرتے
تھے تو وہ دس منٹ بعد ہی واپس آجاتی تھی۔ ان کے کپڑے خون سے لتھڑے
رہتے تھے۔ وہ رات رات بھر زخمیوں کی تیمارداری میں جاگتی تھیں۔ ان میں
سے بعض نرسیں رات کسی اور ہسپتال میں ڈیوٹی ختم کر کے تن تنہا رات کی
تاریکی میں جب سڑکیں ہو حق ویران ہوتی تھیں اور کوئی سواری نہ ملتی تھی وہ
پاپیادہ چھاؤنی کے فوجی ہسپتال میں آیا کرتی تھیں۔ خطرے کے سائرن بجتے
تھے، ہوائی حملے ہوتے تھے لیکن یہ نرسیں زخمیوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ کوئی
بھی باہر خندق میں نہیں جاتی تھی۔ ایک دو مرتبہ انہیں ہوائی حملے سے بچاؤ کی
ہدایات دی گئیں تو تقریباً سب نے کہا — "ہم مریں گی تو ان زخمی بھائیوں کے
ساتھ مریں گی"۔ وہ انہیں اکیلا چھوڑتی ہی نہیں تھیں۔ سیالکوٹ میں تو چھاؤنی
پر اور ہسپتالوں میں بم اور گولے گرتے تھے۔ وہاں بھی نرسیں زخمیوں کے ساتھ
رہتی تھیں۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی جان بچانے کی کوشش نہ کی۔ عورت طبعاً
ڈرپوک ہوتی ہے لیکن ان نرسوں کے دل فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے۔ وہ

سب محاذوں پر جانے اور زخمیوں کی ابتدائی مرہم پٹی کرنے کی ضد کیا کرتی تھیں۔
یہ نرسیں فوجی ہسپتالوں کی نرسوں کی طرح ڈسپلن اور جنگی صورتِ حال سے آگاہ نہیں
تھیں لیکن وہ اس قیامت کے وقت ڈسپلن کی سختی سے پابند رہیں.....

"شہیدوں نے آخری وقت ماؤں کو یاد نہ کیا، بہنوں اور بیٹیوں کو نہ پکارا لیکن
نرسوں نے ان کے لیے ماؤں کی جگہ بھی پُر کیے رکھی —— بہنوں اور بیٹیوں
کی بھی۔"

میجر نصرت جہاں بیگ نے کہا —— "بہرحال جنگ میں سب نے ایک
ٹیم کی طرح کام کیا۔ خطرہ ہر لحظہ سر پہ منڈلاتا رہتا تھا اور زخمیوں کے آنے اور زخمیوں
کی دیکھ بھال کا سلسلہ تیزی سے چل رہا تھا۔ لیکن سٹاف کے کسی ایک مرد یا
عورت نے کبھی گھبراہٹ، خوف، اکتاہٹ یا سستی کا مظاہرہ نہ کیا۔ انفرادی
جذبے کے علاوہ یہ کرنل ممتاز حسین صاحب کی قیادت اور جذبے کا کرشمہ ہے۔
وہ دن رات خود کام کرتے تھے۔ کرنل صاحب اپریشن کے علاوہ نرسنگ تک کرنے
لگتے تھے۔ آپ مثالی قائد ثابت ہوئے ہیں۔"

چلتے چلتے نصرت جہاں کو یاد آگیا کہ اسی ہسپتال میں بھارت کے زخمی سپاہی
بھی آتے رہے۔ ان کے علیحدہ وارڈ سے کراہنے اور درد سے چلانے کی آوازیں
آتی رہتی تھیں اور ہمارے سپاہیوں کے وارڈوں میں نعرے گونجا کرتے تھے۔
یہیں سے دونوں فوجوں کے مورال (جذبہ) کا فرق واضح ہو جاتا تھا۔ ان قیدی
زخمیوں کے ساتھ بخدا ہم نے وہی سلوک کیا جو ہم اپنے سپاہیوں سے کرتے
تھے، یہاں تک کہ جو تحفے ہمارے سپاہیوں کے لیے آتے تھے وہ ہم انہیں بھی دیا
کرتے تھے۔ ان کے ہاں حوصلہ نام کا تو کوئی لفظ ہی نہیں تھا۔ میں انہیں اکثر
کہا کرتی تھی کہ تم تو لڑنے آئے تھے، آؤ ذرا ہمارے زخمیوں کو دیکھو جن کی ٹانگیں اور
بازو نہیں ہیں لیکن وہ محاذ پر واپس جانے کے لیے بے تاب ہیں... لیکن ان
میں سے اکثر سپاہی اور ان کے افسر بھی کہا کرتے تھے —— "پاکستانی بڑی نڈر

قوم ہے۔ میدانِ جنگ میں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" علاج کے بعد ان کی صحت کا یہ عالم تھا کہ ان میں بہتوں نے کہا کہ گھر والے ہمیں پہچان نہ سکیں گے۔"

ایک ہندو پائلٹ کے متعلق نصرت کہتی ہیں کہ جلتے ہوئے طیارے سے نکلا تو اس طرف گرا اور پکڑ لیا گیا۔ خاصا زخمی تھا۔ ہسپتال میں ہمارے سلوک سے متاثر ہو کر ایک روز مجھے کہنے لگا" میں حیران ہوں کہ آپ لوگ دشمنوں کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتے ہیں تو آپ اپنے سپاہیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہوں گی۔" میں نے کہا "یکساں..... آپ بھی انسان ہیں۔ دشمن ہی سہی۔ لیکن آپ ہمارے زخمی مہمان ہیں۔" وہ کہنے لگا کہ میں اس احسان کا بدلہ کیسے چکاؤں گا؟ تو میں نے اسے کہا "آپ بدلہ اس طرح چکائیں کہ جب جنگ کے بعد آپ اپنے ملک میں جائیں گے تو اپنے افسروں اور حاکموں کو بتانا کہ قیدیوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرنا چاہیئے۔ آپ ہمارے قیدیوں کو اذیت دے دے کر مارتے ہیں اور انہیں بھوکا پیاسا رکھتے ہیں، اپنے بھارتی بھائیوں کو بتانا کہ آپ کے ساتھ پاکستانیوں نے کیا سلوک کیا ہے۔" اس کے آنسو نکل آئے۔ اسے بھی ہم نے بہت سے تحفے دیئے تھے۔

جب میں میجر نصرت سے اجازت لینے لگا تو کہنے لگیں "میں نے بات ختم نہیں کی اور نہ ہی یہ بات اتنی جلدی ختم ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہلکی ہلکی جھلکیاں ہیں جو آپ کو دکھا دی ہیں۔ میں ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ سکولوں اور کالجوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کو ابتدائی طبی امداد اور نرسنگ کی تربیت لازماً دینی چاہیئے۔ جنگ کے دوران جو لڑکیاں ہمارے ساتھ کام کرنے کا جذبہ لے کے آتی رہی تھیں ان کے پاس صرف جذبہ تھا۔ تربیت نہیں تھی۔ اگر وہ تربیت یافتہ ہوتیں تو زخمیوں کی دیکھ بھال اور سہل ہو جاتی۔ جنگ سے ہم نے جو سبق سیکھا ہے وہ یہی ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں نرسنگ کی تربیت لازمی قرار دی جائے۔"

اور جب میں رخصت ہوا تو اس پُروقار خاتون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جس میں فتح اور حب الوطنی کا تاثر غالب تھا۔ لیکن اس مسکراہٹ میں جانے کتنی ہی ماؤں اور کتنی ہی بہنوں کی آہیں اور فریادیں رچی ہوئی تھیں، اور یہ مسکراہٹ جیسے کہہ رہی تھی ــــ "بھائی جان! مجھے تو بہت کچھ کہنا ہے۔"

چونڈہ

ٹینکوں اور انسانوں کا ہولناک معرکہ

- میجر جنرل ابرار حسین کی زبانی
- پہلی مستند رپورٹ

بھارتی جرنیل بی ایم کول نے اپنی کتاب THE UNTOLD STORY "ان کہی کہانی" میں لکھا ہے ـــــ "۱۹۶۲ء کے بعد (چین سے شکست کھا کر) بھارتی فوج کی نفری اور قوت دگنی اور جنگی بجٹ تین سو کروڑ سے بڑھا کر نو سو کروڑ روپیہ سالانہ کر دیا گیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ایک ہی حملے سے پاکستان فتح کر لیا جائے"۔

بھارت کے ایک انگریزی ہفت روزہ جریدے "اکنامکس" نے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کے چند روز بعد اپنے جنگ پسند حکمرانوں اور شکست خوردہ جرنیلوں کے کھسیانے سے بیانات پڑھ کر لکھا تھا ـــــ "ہمارے لیے اب اپنے سیاسی اور فوجی لیڈروں کی یہ رَٹ ناقابلِ فہم ہے کہ وہ لاہور اور سیالکوٹ پر قبضہ نہیں کرنا چاہتے تھے"۔

اس صدی کے شیوا مرہٹہ جنرل چوہدری نے حملے کی ناکامی کا یہ جواز بھی پیش کیا ہے کہ اس کی فوجوں کے راستے میں بی آر بی نہر آگئی تھی۔ جنرل چوہدری کو اس کے اپنے ہم رکاب ایک ممتاز وقائع نگار اور جنگی مبصر نراد چوہدری کلکتہ کے انگریزی جریدے NOW میں ان الفاظ میں جواب دیتا ہے: ـــــ "جنرل چوہدری کا یہ عذر کہ اس کے حملے کو بی آر بی نے ناکام کیا، ناقابلِ قبول ہے۔ جنگوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع نہیں کہ حملہ آوروں کے راستے میں قدرتی رکاوٹیں آئی ہوں"۔

جنرل چوہدری کو صحیح جواب امریکہ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ہفت روزہ جریدے "ٹائم" کا وقائع نگار لوئس کرار ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں دے چکا ہے۔ چونڈہ کے آخری معرکے کا آنکھوں دیکھا حال لکھتے ہوئے لوئس کرار نے لکھا تھا:

"اُس قوم کو کون شکست دے سکتا ہے جو موت کے ساتھ آنکھ مچولی

کھیلنا جانتی ہو۔ میں نے پاک آرمی کے جوان سے جرنیل تک کو آگ اور موت کے ساتھ اس طرح کھیلتے دیکھا ہے جس طرح بچے گلیوں میں کانچ کی گولیوں سے کھیلتے ہیں"۔

دراصل یہ تھے وہ جوان اور جرنیل جو جنرل چوہدری کی یلغار کے راستے میں حائل ہو گئے تھے۔ ورنہ دورِ جدید کی جنگ میں بی آر بی جیسی نہریں، راوی جیسے دریا اور کھڈ نالے تو کوئی رکاوٹ ہی نہیں ہوتے۔ مسلمان جنگجوؤں نے گھوڑوں پر اور زورِ بازو سے سمندر اور سیلابی دریا پھلانگے ہیں۔ پاکستان پر حملے سے پانچ ہی روز پہلے پاک فوج نے دریائے توی اس حالت میں عبور کیا تھا کہ دریا سیلابی تھا۔ اس کی پانچ شاخیں تھیں۔ کوئی پُل نہ تھا۔ کوئی عارضی پل نہ بنایا گیا۔ سامنے دشمن نے توپوں اور ٹینکوں کی گولہ باری سے آگ کی دیوار کھڑی کر رکھی تھی اور ہمارے جوان گاڑیوں کو رسّوں سے گھسیٹتے دریا پار کر گئے تھے۔

بھارت کے سیاسی اور فوجی لیڈروں کا یہ کہنا کہ لاہور اور سیالکوٹ پر قبضہ ان کا مقصد نہ تھا اور اسی سانس میں یہ بھی کہنا کہ ہماری فوجوں کے راستے میں بی آر بی آگئی تھی، ان کی شکست کا واضح ثبوت ہے اور ان کے عزائم کا واضح ثبوت وہ اپریشن آرڈر ہیں جو بھارتی ہائی کمان نے اپنے ڈویژنوں، بریگیڈوں اور یونٹوں کو جاری کیے تھے۔ یہ اپریشن آرڈر پاک فوج کو بھارت کے قیدی افسروں، ٹینکوں اور گاڑیوں سے ملے تھے۔ ایسا ہی ایک اپریشن آرڈر جنرل ابرار حسین ہلالِ جراَت کے پاس ہے اور پاک فوج کے سرکاری ریکارڈ میں بھی موجود ہے، جس کا عنوان ہے "اپریشن نیپال"۔

"اپریشن نیپال" کا مقصد یہ تھا کہ بھارت کا نمبر ایک بکتر بند ڈویژن لاہور پر حملے سے ٹھیک اڑتالیس گھنٹے بعد سیالکوٹ پر یلغار کرے گا۔ سیالکوٹ شہر پر حملے کا دھوکا دیا جائے گا اور تیز رفتار ٹینک پاکستان کے دفاعی دستوں کو دھوکا دیتے

اور کچلتے، روندتے ہوئے جونڈے کے راستے آگے نکل کر شاہراہ پاکستان، (جی ٹی روڈ)
جو پاکستان کی شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے، کو گوجرانوالہ اور وزیرآباد کے درمیان
کٹ کر کے چناب تک کے علاقے میں پہنچیں گے۔ انڈین آرمی کے نمبر ۱۴، انفنٹری
نمبر ۲۶ انفنٹری اور نمبر ۶ موٹیلین ڈویژن اور موٹر انفنٹری بریگیڈ اس تمام
علاقے پر قابض ہو جائیں گے۔ بھارتی ہائی کمان نے "آپریشن نیپال" کی کامیابی
کا عرصہ بہتر (۷۲) گھنٹے مقرر کیا تھا۔

بھارتی حکمران اور فوجی لیڈر ٹینکوں کی ہیبت ناک تعداد اور انفنٹری اور
موٹیلین ڈویژنوں کی قوت کے بل بوتے پر اس سے بڑی بڑ مار سکتے تھے۔
انہیں بجا طور پر توقع تھی کہ پہلے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر وہ لاہور کے دفاع کو کچل
چکے ہوں گے اور ان کے حملہ آور ڈویژن (نمبر سات، نمبر پندرہ اور نمبر تینتیس موٹیلین)
نمبر ایک آرمرڈ ڈویژن کو گوجرانوالہ اور وزیرآباد کے درمیان جا ملیں گے اور اگر
کسی وجہ سے لاہور کا دفاع کچلا نہ جا سکا تو سیالکوٹ کے راستے چناب تک کے
علاقے پر قابض ہونے والے بھارتی ڈویژن عقب سے لاہور کے دفاعی دستوں
کو دبوچ لیں گے۔ اس طرح پاکستان دو حصوں میں کٹ جائے گا اور ہندو کا
وہ خواب پورا ہو جائے گا جو اس نے اٹھارہ سال پہلے دیکھا تھا یعنی پاکستان
بھارت میں مدغم ہو جائے گا۔

بھارت کے آرمرڈ ڈویژن اور پیادہ ڈویژنوں کی ٹینک رجمنٹوں کی تعداد
نو تھی۔ ہر رجمنٹ میں چونسٹھ ٹینک تھے۔ اس حساب سے ٹینکوں کی تعداد
۵۷۶ تھی۔ لیکن یہ کل تعداد نہیں تھی۔ ان کے پیچھے بے شمار ٹینک ریزرو میں
تھے جو تباہ ہونے والے ٹینکوں کی جگہ لینے کے لیے آرہے تھے۔ ریزرو ٹینک
بالکل نئے تھے جو پہلی بار میدان میں لائے گئے تھے۔ آخری دنوں میں دشمن کے
جو ٹینک پکڑے گئے وہ اس حد تک نئے تھے کہ ان کے بعض حصوں سے گریز
بھی ابھی صاف نہیں کی گئی تھی۔

اس ٹینک ڈویژن کو امدادی اور حفاظتی گولہ باری دینے کے لیے توپخانے
کی چونسٹھ (۶۴) بیٹریاں ساتھ تھیں۔ ہر ایک بیٹری میں چھ سے آٹھ توپیں تھیں۔
یعنی توپوں کی تعداد ساڑھے چار سو سے کم نہ تھی۔ آہن و آتش کے اس طوفان کو
آسمان سے مدد دینے اور آتشیں چھاتہ مہیا کرنے کے لیے بھارت کے سینکڑوں
جدید اور تیز رفتار بمبار طیارے تھے۔

اس بھیانک بکتر بند قوت کو جنرل اختر حسین ملک مرحوم کے بھائی بریگیڈیئر
(اب میجر جنرل) عبدالعلی ملک نے "اصحاب فیل" کا نام دیا تھا کیونکہ جنرل
چوہدری نے اپنے اس بکتر بند ڈویژن کو سرکاری طور پر "سیاہ ہاتھی" کا خطاب
عطا کر رکھا تھا۔

چھ سو سے زیادہ ٹینکوں کا پہلا استقبال جنرل عبدالعلی ملک کے پیادہ
بریگیڈ نے کیا تھا جس کے ساتھ چند ایک ٹینک تھے۔ فائر بندی کے فوراً بعد
جنرل علی سے میری پہلی ملاقات میدانِ جنگ میں ہوئی تھی۔ ان کا ہیڈکوارٹر
سارنگ پور کے قریب منڈی بھاگو کے باغیچے میں تھا۔ میں نے ان سے پوچھا
کہ انہوں نے پیادہ بریگیڈ سے ٹینک ڈویژن کا سامنا کس طرح کیا تھا؟ جنرل
صاحب کے جھلسے ہوئے چہرے پر رونق اور گرد و غبار، بارود اور شب بیداری
سے لال سرخ آنکھوں میں فاتحانہ چمک پیدا ہوئی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔
"پہلے روز تو ہماری ذہنی کیفیت مرزا غالب والی تھی ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ذرا تصور فرمائیے کہ چھ سو ٹینکوں کو روکنے کے لیے جنہیں ساڑھے چار سو
توپوں، پیادہ اور پہاڑی ڈویژنوں کی پچاس ہزار نفری کی مدد حاصل تھی،
بمشکل ڈیڑھ سو ٹینک اور نو ہزار کے قریب نفری تھی۔ توپوں کی تعداد چار گنا کم
تھی۔ اپنے ٹینکوں میں کئی ایک۔ پرانی قسم کے شرمن ٹینک تھے جو ٹریننگ کے

لیے تو استعمال ہو سکتے تھے، میدانِ جنگ کے قابل نہیں تھے۔ بکتر بند ڈویژن کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنا بکتر بند ڈویژن پورا نہیں تھا بلکہ یہ ایک بریگیڈ گروپ تھا۔

میدانِ جنگ کی دشواریاں یہ تھیں کہ اُس سال ساون میں بارشیں کم ہونے کی وجہ سے میدان میں کہیں بھی پانی اور دلدل نہیں تھی جس سے یہ میلوں وسیع میدان ٹینکوں کی آزادانہ حرکت کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اس کا فائدہ دشمن کو حاصل تھا کیونکہ اس کے ٹینکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جس سے اس نے محاذ کو اتنا زیادہ پھیلا دیا تھا جسے سنبھالنے کے لیے ہمارے ٹینکوں کی تعداد ناکافی تھی۔ دوسری دشواری یہ تھی کہ دشمن نے حملے میں پہل کر کے اگر SURPRISE کا فائدہ حاصل نہیں کیا تھا تو اس نے ٹینکوں اور نفری کی افراط سے میدان پر چھا کر INITIATIVE کا فائدہ ضرور حاصل کر لیا تھا۔

اب پاک فوج کے جیالوں کی ذمہ داری سہ گنا ہو گئی تھی ـــــ حملہ روکنا، دشمن کو میدانِ جنگ کے فوائد سے محروم کرنا اور اسے اس حد تک کمزور کرنا کہ اس پر وسیع پیمانے پر ایسا بھرپور جوابی حملہ کیا جا سکے جس سے اس کے عزائم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں ـــــ جنگ کا کوئی بھی ماہر اور مبصر دونوں طرفوں کی طاقت کے تناسب کو دیکھ کر پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ پاک فوج کے یہ مٹھی بھر ٹینک اور جوان اس بے پناہ قوت کے سامنے پورا ایک دن بھی جم نہیں سکیں گے۔ بھارتی ہائی کمان نے "آپریشن نیپال" کی کامیابی کا بہتر گھنٹے جو وقت مقرر کیا تھا، وہ مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔

حملے سے لے کر فائر بندی تک چونڈہ کے میدان میں جو کچھ ہوا وہ پاک فوج کے جانبازوں کی شجاعت، حب الوطنی، بے خوفی اور فنِ حرب و ضرب کے کمال کی ایسی داستان ہے جس کی مثال اقوامِ عالم کے جنگی مبصروں کی نگاہ میں، جنگوں کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ ایسی مثال جنگِ قادسیہ میں مسلمانوں نے پیش کی

تھی اور اس مثال کو مسلمانوں نے ہی چونڈہ میں دہرایا۔ اس بے مثال داستان کو ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے کتابوں کی ضخامت چاہیے۔ جب تک اُس ایک ایک سرفروش کا ذکر نہ کیا جائے جن کی لاشیں ٹینکوں تلے کچلی گئیں اور ان کا خون اور ان کی ہڈیاں وطن کی مٹی میں مل گئیں، یہ داستان مکمل نہیں ہوتی۔ یہ داستان اس وقت تک نامکمل رہتی ہے جب تک ان جانبازوں کا ذکر نہ کیا جائے جو اپنی ٹانگیں، بازو اور آنکھیں چونڈہ کے میدانِ کربلا میں قربان کر کے آج سیالکوٹ سے دُور، بہت دُور، گمنام دیہات میں معذور زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ وہ انسان ہیں جنہیں مردانِ آہن یا فولادی انسان MEN OF STEEL کا خطاب دیا گیا تھا۔

اور چونڈہ کے میدان میں بھارت کے آہنی فخر اور آتشیں غرور کو خاک و خون میں ڈبو دینے والا جرنیل آج چپ چاپ ہمارے درمیان سے گزر رہا ہے ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ میں جب اس مردِ آہن سے ملا تو میں نے اس کی شخصیت میں اس مردِ مومن کی جھلک دیکھی جو تشہیر کا خواہاں نہیں ہوتا، جسے انعام و اکرام کا لالچ نہیں ہوتا اور جس کی روح صرف اتنے سے انعام سے مطمئن ہو جاتی ہے کہ قوم نے اسے جو فرض سونپا تھا، وہ الحمدللہ خوش اسلوبی سے پورا ہو گیا۔

یہ ہیں میجر جنرل ابرار حسین جنہوں نے لکھنؤ کی سرزمین میں جنم لیا۔ خاندان کا تمام تر اثاثہ اور جائداد پاکستان کے نام پر قربان کر کے لکھنؤ سے ہجرت کر آئے اور ہجرت کے اٹھارہ سال بعد ہندو کے اس خواب کو کہ وہ پاکستان کو بھارت میں بہتر گھنٹوں میں مدغم کر لے گا، چونڈہ کے میدان میں ریزہ ریزہ کیا۔ انہوں نے انڈین آرمی سے فوجی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں وہ ملایا میں تھے جب جاپانیوں نے وہاں حملہ کیا۔ میں نے جنرل ابرار حسین سے پوچھا کہ انہیں وہاں جنگ کا بہت تجربہ حاصل ہوا ہو گا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا: "وہ تجربہ مجھے چونڈہ کی بکتر بند جنگ میں کوئی مدد نہیں دے سکا۔ ملایا میں چند مہینے جاپانیوں

سے لڑے۔ برطانوی فوجیں سنگاپور ہار بیٹھیں تو میں جنگی قیدی ہو گیا۔ میں اس وقت سنگاپور میں تھا۔ ایک بار قید سے بھاگنے کے لیے قیدیوں کی ایسی پارٹی میں شامل ہو گیا جس کے متعلق خیال تھا کہ برما لے جائی جا رہی ہے۔ ارادہ تھا کہ برما سے بھاگ کر اپنے موریچوں تک پہنچنا آسان ہو گا مگر اس پارٹی کو جاپانی نیوگنی کے جزیرے میں لے گئے جہاں سے بھاگنا کسی صورت ممکن نہ تھا۔ چاروں طرف وسیع سمندر تھا جس پر جاپانیوں کا قبضہ تھا۔ چنانچہ جنگ کا باقی عرصہ جاپانیوں کی قید میں سڑکیں بناتے گزرا۔"

چونڈہ میں ان کا مقابلہ جنرل راجندر سنگھ سے تھا جو بھارت کے بکتر بند ڈویژن کا کمانڈر تھا۔ اسے سرکاری طور پر بھارتی ہائی کمان نے خاصا لمبا چوڑا خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم میں راجندر سنگھ افریقہ کے شمالی صحرا میں جرمنوں یعنی جنرل رومیل کے خلاف ٹینکوں کی جنگ لڑا تھا۔ اس نے جنرل رومیل کی بکتر بند جنگ کی چالوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ تئیس برسوں کے بے تابانہ انتظار کے بعد اس نے اپنے تجربے اور جنرل رومیل سے سیکھی ہوئی جنگی چالوں کا کامیاب مظاہرہ چونڈہ کے میدان میں کیا۔ ہائی کمان نے اسے "مہا ویر چکر" دے کر جنرل رومیل کی ٹکر کا جرنیل ثابت کیا ہے۔

میں نے جنرل ابرار حسین سے پوچھا "کیا آپ نے بھی جنرل رومیل کی جنگی چالوں کا مطالعہ کیا تھا اور اسے ٹینکوں کی جنگ کا مثالی جرنیل سمجھتے تھے؟" ——

جنرل صاحب نے کہا: —— "ایک فوجی افسر اور ٹینک ڈویژن کے کمانڈر کی حیثیت سے میں نے بہت سے جرنیلوں کی چالوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن میں نے رومیل اور منٹگمری وغیرہ کو کبھی ایسا مثالی جرنیل نہیں سمجھا تھا کہ چونڈہ کی جنگ میں ان کی چالوں کی نقل کرتا۔ انہوں نے اپنے حالات کے مطابق جنگ لڑی تھی اور جن حالات کا مجھے سامنا تھا وہ بہت ہی مختلف تھے۔ یہ جنگی ساز و سامان اور جذبے کی جنگ تھی۔ دشمن اسلحہ بارود اور نفری کی افراط کے بل بوتے پر لڑنے آیا تھا۔ مجھے یہ افراط میسر نہیں تھی۔ مجھے اپنے اللہ پر اور اپنے افسروں

اور جوانوں کے جذبے پر بھروسہ تھا۔ یہ جذبہ ہماری ٹریننگ کا بنیادی عنصر تھا۔ ہمیں اسی اصول پر ٹریننگ دی گئی تھی کہ کم سے کم طاقت سے زیادہ سے زیادہ دشمن کا مقابلہ کرنا۔ میرے مثالی جرنیل رومیل اور منٹگمری نہیں، سعد بن ابی وقاص رضؓ تھے جنہوں نے قادسیہ میں انہی حالات میں ایسے ہی بکتر بند لشکر کو کئی گنا کم تعداد کے غیر بکتر بند مجاہدین سے شکستِ فاش دی تھی۔ وہاں زرتشت کے پجاری بکتر بند ہاتھی لائے تھے اور میرے سامنے بھی بکتر بند سیاہ ہاتھی آئے تھے۔"

میں نے جنرل صاحب سے پوچھا کہ جنرل راجندر سنگھ کی چالیں کس حد تک رومیل سے ملتی تھیں؟ جنرل صاحب نے کہا — "جنرل راجندر سنگھ ایک ہی مقام پر ٹینکوں کو جھونکتا چلا گیا جیسے کوئی دیوانہ دیوار سے ٹکریں مار مار کر سر پھوڑ رہا ہو۔ وہ مجھے اپنی فائر پاور سے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پہلے ہی تصادم میں پھلورا کے مقام پر اسے ایک دھوکا دیا تھا کہ پھلورا اور چونڈہ کے درمیان ایک دیوار ہے۔ جب تک اسے نہیں گراؤ گے، تمہارا آپریشن نیپال کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ وہ اس دھوکے میں آ کر ساری جنگی چالیں بھول گیا اور سر پھوڑتا رہا۔ میں آگے چل کر آپ کو بتاؤں گا کہ یہ دھوکا کیا تھا اور راجندر سنگھ نے اس دھوکے میں آ کر کس بے دردی سے اپنی پوری ٹینک رجمنٹیں میرے ایک ایک سکواڈرن سے تباہ کرا دیں۔"

جنرل صاحب نے کہا — "میں چونڈہ کی جنگ کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اپنے افسروں، ٹینک سواروں، پیادہ جوانوں اور توپچیوں کے جذبے کو تہِ دل سے خراجِ تحسین پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے دفاعی موریچوں میں نفری کی کمی کی وجہ سے جگہ جگہ شگاف ہونے کے باوجود دشمن کو کسی شگاف سے فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ دشمن جس شگاف کی طرف بڑھا، میرا کوئی نہ کوئی دستہ وہاں برق رفتاری سے پہنچ گیا۔ حالانکہ انڈین ایئر فورس کے طیاروں

اور دشمن کے توپ خانے کے زمینی اور ہوائی 'او پی' کی نظروں کے سامنے ایسی حرکت آسان نہیں تھی۔ اسے ہم فوجی زبان میں MOBILITY AND SURPRISE کہتے ہیں جو اسلامی فنِ حرب کے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے پاس بکتر بند اور پیادہ فوج کی کمی تھی۔ مجھے اسی مختصر سی فوج کو ایسی ترتیب سے اتنے ہی وسیع اور گہرے محاذ پر استعمال کرنا تھا جس پر دشمن طاقت کی افراط کی وجہ سے چھا گیا تھا۔ میرا یہ کام میرے افسروں اور جوانوں نے جان اور خون کے نذرانے دے کر پورا کیا۔"

آئیے، اب چونڈہ کے تاریخی میدان میں چلیں۔ چلنے سے پہلے میدانِ جنگ کا نقشہ غور سے دیکھ لیجئے۔ (دیکھئے صفحہ ۱۹۷) دیہات کے نام اور سمتیں ازبر کر لیجئے۔ آپ کو تمام معرکے سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ میں ابتدا میں واضح کر چکا ہوں کہ سیالکوٹ فرنٹ پر بکتر بند حملے سے بھارتیوں کا مقصد کیا تھا۔ یہ حملہ لاہور پر حملے سے پورے چوبیس گھنٹے بعد یعنی ۷ستمبر کی صبح ہونا چاہیئے تھا لیکن اڑتالیس گھنٹے بعد ہوا۔ پورے چوبیس گھنٹوں کی تاخیر کی اور وجوہات بھی ہوں گی مثلاً یہ کہ اتنے بڑے آرمرڈ ڈویژن کو حملے کے لیے اجتماع کے مقام پہ لانے کے لیے ہزاروں گاڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نقل و حرکت کوئی ایسی سہل نہیں ہوتی کیونکہ یہ رات کے اندھیرے میں چوری چھپے کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے بھارتیوں کو کوئی ایسی دشواری پیش آگئی ہو۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بھارتیوں کو فتح کا اس قدر یقین تھا کہ وہ نہریں اور دریا وغیرہ عبور کرنے کے لیے پلوں کا سامان اور انجینئرنگ کا دیگر سامان ساتھ لا رہے تھے جو تین چار سو گاڑیوں پر لدا ہوا تھا۔

حملے میں تاخیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) عبدالعلی ملک کا بریگیڈ بھارتی علاقے سامبا، رام گڑھ کے سامنے سرحد کے ساتھ موجود تھا۔ ۵/۶ ستمبر کی رات جنرل عبدالعلی کو یقین ہو گیا تھا کہ سامبا کے علاقے میں کوئی اجتماع ہو رہا ہے۔ ۷ستمبر کی صبح جنرل عبدالعلی نے پاک فضائیہ کے تین شاہبازوں کو بلایا اور انہیں وائرلیس پر ہدایت دی کہ سامبا کے علاقے پر پرواز کر کے کوئی چیز

ہلتی جلتی نظر آئے تو اس پہ فائرنگ کرو۔ دشمن کی جمعیت ایسی خوبی سے ڈھکی چھپی تھی کہ شاہبازوں کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ایک شاہباز کو ایک جیپ جاتی نظر آئی۔ شاہباز نے اس پر غوطہ لگایا لیکن فائرنگ نہ کی۔ جیپ بھاگتی چلی گئی اور شاہباز اسے دیکھتا رہا۔ جیپ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ شاہباز نے اس جھنڈ پر راکٹ فائر کر دیئے۔ فائر کا نتیجہ یہ تھا کہ زمین سے بے ہنگم دھماکے ہونے لگے اور شعلے اور سیاہ دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔ یہ نتیجہ دیکھ کر تینوں شاہبازوں نے اس علاقے میں بہت نیچے جا جا کر راکٹ اور گن فائرنگ کی —— بھارتی طیارہ شکن توپچیوں نے مقابلہ تو خوب کیا لیکن شاہبازوں کی جرأت مندی کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ جنرل عبدالعلی دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ بھارت کا آرمرڈ ڈویژن یہیں ہے اور حملہ اِدھر سے ہی ہوگا لیکن شاہبازوں نے دشمن کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ کم از کم اُس روز حملہ نہ کر سکے۔

جنرل عبدالعلی ملک کے پاس صرف ایک پیادہ بریگیڈ تھا جس میں کرنل نثار احمد خان ستارۂ جرأت کی زیرِ کمان ایک ٹینک رجمنٹ تھی۔ کرنل محمد جمشید ستارۂ جرأت کی زیرِ کمان ایک انفنٹری بٹالین (پنجاب رجمنٹ) اور ایک بٹالین فرنٹیئر فورس کی کرنل محمد اکبر کی زیرِ کمان تھی۔ اُن کی مدد کے لیے توپخانے کی ایک فیلڈ رجمنٹ تھی جس کے کمانڈنگ آفیسر کرنل میاں منصور محمد تھے۔ اس قدر مختصر طاقت چھ سو ٹینکوں کے مقابلے میں مورچہ بند تھی۔ اُس روز یعنی ۷ستمبر کو دشمن نے کوئی حرکت نہ کی۔ جنرل علی کے بریگیڈ نے دفاعی پوزیشنوں کو تیار کر لیا۔ مورچے کھودنے اور انہیں ٹینکوں کے حملے کے لیے تیار کرنے میں جوانوں کا جذبہ اور جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ اُن کا دشمن اٹھارہ برسوں کی تیاری کے بعد پہلی بار میدانِ جنگ میں آ رہا تھا۔ جوانوں کو ذرہ بھر تشویش نہیں تھی کہ اُن کے مقابلے کے لیے ٹینک آ رہے ہیں۔ انہیں یہی احساس آگ بگولہ کیے ہوئے تھا کہ پاکستان اور اسلام کا ازلی دشمن اور لاکھوں مسلمان بچوں کا قاتل اُن کے مقابلے کے لیے آ رہا ہے۔ اس بریگیڈ

کی ذمہ داری میں سات آٹھ میل کا وسیع علاقہ تھا۔

۶ ستمبر کی صبح جنوب میں دشمن نے جسّڑ کے مقام پر لاہور کے ساتھ ہی حملہ کر دیا تھا۔ یہ دراصل حملے کا دھوکا تھا۔ وہاں کے دفاعی دستوں نے کمال جانفشانی سے اس حملے کو ناکام کر دیا۔ دشمن نے ایسا ہی دھوکا کُندن پور (سیالکوٹ) پر حملے سے دیا۔ یہ حملہ بھی روک لیا گیا۔

۷/۸ ستمبر کی رات دس بجے معراجکے کے علاقے پر دشمن نے بے پناہ گولہ باری شروع کر دی جو بڑے حملے کا پیش خیمہ تھی۔ وہاں فرنٹیئر فورس کی صرف ایک کمپنی تھی جس کے پاس صرف دو آر آر (ٹینک شکن) گنیں تھیں اور ٹینک ایک بھی نہ تھا۔ اس کمپنی نے پہلے تو گولہ باری برداشت کی پھر اس کی پوزیشنوں پر بھارت کے نمبر ۶ ماؤنٹین ڈویژن کے پورے بریگیڈ نے حملہ کر دیا۔ اس بریگیڈ کے ساتھ ایک ٹینک رجمنٹ بھی تھی۔ اس ڈویژن کے ایک اور بریگیڈ نے چاروا، سبز پیر کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ بھی ٹینک رجمنٹ تھی۔ وہاں بھی فرنٹیئر فورس کی تھوڑی سی نفری تھی۔ اسی وقت اس ڈویژن کے ایک اور بریگیڈ نے سیداں والی رنگور کے علاقے پر حملہ کیا۔ یہ نمبر ۴۳ موٹر بریگیڈ تھا جو بھارت کے نامور آرمرڈ ڈویژن کا حصہ تھا۔

دشمن اس تمام علاقے کو ایک مضبوط اڈہ BASE بنانا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس اڈے کو آگے بڑھنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس علاقے کی کیفیت ایسی تھی کہ یہ ایک مضبوط اڈہ بنانے کے لیے موزوں تھا، لیکن صرف دو پلٹنوں نے رات بھر شدید جنگ لڑ کر تین بریگیڈوں کا حملہ پسپا کر دیا۔ اپنی دونوں پلٹنوں، خصوصاً فرنٹیئر فورس کو اس کامیابی کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنی پڑی۔ صبح تک اپنے مورچے خون سے بھر گئے تھے لیکن جوں جوں پاکستان کے ان مٹھی بھر سپوتوں کی تعداد گھٹتی جا رہی تھی، اُن کا حوصلہ اور جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

صبح کے نکھرتے اُجالے میں جوانوں نے دیکھا کہ حملے کی زد میں آئے ہوئے دیہاتی ہراساں اور خوفزدہ اپنے مورچوں کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ رات بھر کی جنگ کے تھکے ہوئے جوانوں نے جب عورتوں اور بچوں کو دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ یہ تو قوم کی آبرو تھی جسے دشمن نے روند ڈالا تھا۔ جوان آتش فشاں پہاڑوں سے ٹکرانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان دیہاتیوں کو بحفاظت پیچھے بھیج دیا گیا۔

اسی رات بھارت کے نمبر ۲۶ پیادہ ڈویژن کے دو بریگیڈوں نے سچیت گڑھ اور باجرہ گڑھی پر بھی حملہ کیا۔ وہاں چونکہ نفری تھوڑی تھی اس لیے باجرہ گڑھی کو چھوڑنا پڑا۔ اسی طرح رات کے وقت بھارت کے پانچ بریگیڈوں نے بیک وقت کئی ایک مقامات پر حملے کیے۔ اندھیرے کی وجہ سے ٹینک استعمال نہیں ہو سکتے تھے لیکن دشمن نے ٹینکوں کو بریگیڈوں کے ساتھ رکھا تھا تاکہ جو علاقہ لے لیا جائے اس پر قبضہ مستحکم ہو جائے۔

۸ ستمبر کی تاریخی صبح طلوع ہوئی۔ بھارت کا آرمرڈ ڈویژن جس پر بھارتیوں کو اتنا ناز تھا جیسے یہ ساری دنیا کو ہی روند ڈالے گا، پاکستان کی سرحد پھلانگ چکا تھا۔ اس کے مقابلے کے لیے اپنی صرف ایک ٹینک رجمنٹ نمبر ۲۵ کیولری تھی جس کے کمانڈر کرنل (اب بریگیڈیئر) نثار احمد خان تھے۔ اس کے 'اے' سکواڈرن کے کمانڈر میجر آفندی 'بی' کے میجر محمد احمد اور 'سی' کے کمانڈر میجر رضا خان تھے۔

بھارت کی وزارتِ دفاع نے رات کو ہی اپنے اخباروں کو اپنے بکتر بند حملے کی خبر دے دی تھی۔ ۸ ستمبر کی صبح بھارت کے مشہور اخبار "ٹائمز آف انڈیا" میں سیالکوٹ پر حملے کی طویل خبر شائع ہوئی جس کے آخر میں لکھا تھا "ہمارا یہ حملہ مغربی پاکستان کو فوجی لحاظ سے یقیناً دو حصوں میں تقسیم کر دے گا۔ بڑی سڑک اور ریلوے لائن کو کاٹ دیا جائے گا۔ اگر پاکستانیوں کو شک ہے

کہ ہم میں یہ کامیابی حاصل کرنے کی طاقت نہیں ہے تو وہ آج ان کے دل
سے نکل جائے گا۔"

صبح کے چار بج چکے تھے۔ "ٹائمز آف انڈیا" اور دوسرے اخبار پہلے صفحوں
پر فتح کی نئی خبر کے ساتھ بھارت کے بازاروں اور گلیوں میں آچکے تھے۔ جنرل عبدالعلی
ملک جن کے اعصاب رات کی جنگ سے کھچے تنے تھے اور ان کے پاس مورچوں
کی رپورٹیں آرہی تھیں، چائے کی پیالی حلق میں انڈیل ہی رہے تھے کہ انہیں
اطلاع ملی کہ دشمن کے بے شمار ٹینک سرحد کے اندر آ گئے ہیں۔ ان کا رُخ پھلورا
کی طرف ہے۔ جنرل علی نے اپنے ٹینک رجمنٹ کمانڈر کو وائرلیس پر صرف اتنا حکم
دیا۔ "دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔ حملے کا رُخ پھلورا کی طرف ہے۔ دشمن کو برباد
کر دو۔"

جنرل عبدالعلی کو علم نہیں تھا کہ جن ٹینکوں کے مقابلے میں وہ صرف ایک
رجمنٹ بھیج رہے ہیں وہ پورا آرمرڈ ڈویژن ہے اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں
تھا کہ بھارت کے اخباروں میں حملہ شروع ہونے سے پہلے ہی حملے کی کامیابی کی
خبر چھپ چکی ہے۔ انہیں ایک اور غلط خبر یہ بھی ملی کہ ان کے بریگیڈ کا جو توپخانہ
سرحدی چوکیوں کی حفاظت کے لیے گیا تھا اسے دشمن نے برباد کر دیا ہے۔ اس
خبر نے انہیں بہت پریشان کیا۔ ایسے وقت زیادہ سے زیادہ توپوں کی ضرورت
تھی۔ جو دشمن کی ساڑھے چار سو توپوں کا مقابلہ کر سکیں مگر جو مختصر سا توپخانہ تھا
وہ بھی ختم ہو گیا۔ ابھی کور آرٹلری نہیں پہنچی تھی۔ یہاں کم از کم کور آرٹلری کی
ضرورت تھی۔ جنرل عبدالعلی نے نہ تو دشمن کی طاقت کے متعلق کوئی رپورٹ
لی نہ ہی یہ یقین کیا کہ کیا واقعی اپنا توپخانہ ختم ہو گیا ہے؟ انہوں نے کرنل نثار احمد
خان کو مقابلے کا حکم دے کر پنجاب رجمنٹ کے کمانڈر کرنل (اب جنرل) محمد جمشید
کو حکم دیا کہ وہ اپنی ٹینک رجمنٹ کے پیچھے جائیں اور چونڈہ کو دفاع کا مرکز بنا لیں
اور اپنی کمپنیاں ٹینک سکواڈرنوں کے ساتھ بھیجیں۔ یہ ایک انتہائی دلیرانہ حکم تھا۔

اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔

اور اس مختصر سے حکم نے بھارت کے اخباروں میں چھپی ہوئی خبر پر سیاہی
پھیر دی۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح "ٹائمز آف انڈیا" میں چونڈہ کی ٹینکوں کی پہلی جنگ
کی تفصیلات شائع ہوئیں جو مبالغہ آمیز تھیں لیکن خبر کے آخر میں یہ اعتراف
بھی شائع ہوا کہ ۔۔۔ "وزارتِ دفاع نے اعتراف کیا ہے کہ سیالکوٹ فرنٹ
پر ٹینکوں کی جنگ میں ہمیں (بھارتیوں کو) ٹینکوں کا بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔"

۸ ستمبر کی صبح دشمن کے آرمرڈ ڈویژن کے ٹینک ننگال سے معراجکے تک
پھیل گئے تھے اور بڑھے چلے آ رہے تھے۔ جنرل عبدالعلی نے ٹینک رجمنٹ اور
پنجاب رجمنٹ کو مقابلے کے لیے بھیج دیا اور انہیں حکم دیا کہ خواہ کتنی ہی قربانی
کیوں نہ دینی پڑے، دشمن کو روکو اور برباد کرو۔ ۲۵ کیولری کے افسروں اور ٹینک
سواروں نے جس شجاعت، فرض کی لگن اور حب الوطنی کی لگن کا مظاہرہ کیا وہ
معجزے سے کم نہیں۔ صرف تین سکواڈرن بھارت کے پورے آرمرڈ ڈویژن
سے ٹکر لینے آگے چلے گئے تھے۔ انہوں نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کونسا توپ خانہ
انہیں حفاظتی اور امدادی فائر دے گا؟ انفنٹری کتنی اور کونسی ہے؟ FOO
کون ہے اور جو کوئی بھی ہے، کہاں ہے؟ (ہر رجمنٹ کے ساتھ توپخانے
کا ایک آبزرویشن آفیسر ہوتا ہے جو ضرورت کے مطابق رجمنٹ کو توپخانے کا
فائر دیتا ہے) انہیں صرف یہ احساس پریشان کیے ہوئے تھا کہ سیالکوٹ کو بچانا
ہے اور جنگی دستور بندیوں کا وقت نہیں۔

جنرل عبدالعلی نے پاک فضائیہ اور مزید انفنٹری کی مدد مانگی۔ انہیں نمبر ۱۴
بلوچ رجمنٹ دے دی گئی جس کی کمان کرنل (اب بریگیڈیئر) ظفر خان شنواری
کے ہاتھ تھی۔ پاک فضائیہ کے شاہباز بروقت پہنچ گئے جو دشمن پر قہر الٰہی بن کر
جھپٹے۔ جنرل عبدالعلی کو ابھی تک یہ خبر پریشان کر رہی تھی کہ ان کے توپخانے کو
دشمن نے تباہ کر دیا ہے۔ وہ چونڈہ چلے گئے۔ دیکھا کہ وہاں ان کا توپ خانہ
صحیح سلامت موجود تھا جس کے کمانڈر کرنل منصور محمد ان سے ملے اور بتایا کہ

توپیں واقعی تباہ ہو چلی تھیں لیکن توپچیوں نے ٹینکوں کی شدید گولہ باری اور مشین گنوں کی بارش جیسی بوچھاڑوں میں سے توپیں نکال لیں۔ جنرل عبدالعلی نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور توپخانے کو فوراً موزوں پوزیشنوں پر لگا دیا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ چونڈہ کی جنگ میں ذاتی شجاعت کے جو مظاہرے ہوتے ہیں، ان کی تفصیلات کے لیے کتابوں کی ضخامت درکار ہے۔ انہیں ایک مضمون میں سمیٹنا کسی پہلو ممکن نہیں۔ تاہم میں پہلے معرکے کی تفصیلات بیان کرنا اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ قوم پر واضح ہو جائے کہ ہمارے افسر اور جوان کس ناقابلِ یقین حد تک بے جگری سے لڑے۔ ان چند ایک جانبازوں کو تمام تر پاک فوج کی شجاعت کی علامت سمجھا جائے۔

حکم ملتے ہی ٹینک رجمنٹ کے کمانڈر کرنل نثار احمد خان نے میجر محمد احمد کے سکواڈرن کو پھلورا کے مقام پر دشمن سے ٹکر لینے کے لیے بھیج دیا۔ انہیں یہ فرض بھی سونپا گیا کہ میجر رضا اور میجر آفندی کے سکواڈرنوں کا، جو آگے چلے گئے ہیں، پہلوؤں کی بھی حفاظت کریں کیونکہ دشمن عقب میں آکر چونڈہ پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند ہی منٹ بعد میجر محمد احمد کو دشمن کے ٹینک نظر آگئے۔ ان مٹھی بھر پاکستانیوں نے دشمن کی پوری قوت کی پروا کیے بغیر سامنے سے حملہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں ٹینکوں کی بھاگ دوڑ اور پھٹتے گولوں سے زمین و آسمان گرد و غبار میں روپوش ہو گئے۔ ٹینکوں کی سکرینوں پر گرد و غبار کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ٹینکوں کے توپچی دشمن کے ٹینکوں کی بڑی توپوں کے فائر کی چمک دیکھ کر فائر کرتے تھے۔ چمک سے ٹینکوں کے فاصلے کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ دماغ کا کھیل اور جذبۂ ایثار کا مظاہرہ تھا۔

پاکستانی ٹینک سواروں کی حاضر دماغی اور بے خوفی سے دشمن بوکھلا گیا۔ ایک تو اس کا آپریشن نیپال، پہلے ہی چوبیس گھنٹے لیٹ ہو گیا تھا۔ جب وقت آیا تو پاکستان کے چند ایک ٹینکوں نے راستے میں آگ اور لوہے کی دیوار کھڑی

کر دی۔ اوپر سے پاک فضائیہ کے تین شاہبازوں نے وہ قیامت بپا کی کہ دشمن گرد و غبار کی آڑ میں پیچھے ہٹنے لگا ـــــ اور چونڈہ کا میدان پاکستان کے پہلے ہیرو پیدا کرنے لگا ـــــ گرد و غبار اس قدر گہرا ہو گیا کہ لانس دفعدار عطا محمد کا ٹینک سکواڈرن سے بچھڑ گیا۔ نظری ملاپ تو تھا ہی نہیں۔ اُس نے بھانپ لیا کہ وہ اپنے سکواڈرن سے جدا ہو کر دشمن کے ٹینکوں کے گھیرے میں آگیا ہے۔ معرکہ گھمسان کا تھا۔ عطا محمد نے اپنے توپچی کو فائر کرنے سے روک دیا تاکہ اُس کی گن کا شعلہ اس کے ٹینک کی نشاندہی نہ کر دے۔ تھوڑی دیر بعد گرد و غبار ذرا سا چھٹ گیا۔ عطا محمد کا توپچی غلام جیلانی تاک میں تھا۔ اُسے اپنے قریب ہی دشمن کے چار ٹینک نظر آئے۔ اُس نے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور دشمن کے سنبھلنے سے پہلے ہی یکے بعد دیگرے چاروں ٹینک تباہ کر دیئے۔

عطا محمد نے اپنے ٹینک کو گھیرے سے نکالا اور اپنے سکواڈرن کمانڈر سے ملاپ کیا۔ اُس وقت اُس کا سکواڈرن کمانڈر میجر محمد احمد شدید زخمی ہو چکا تھا۔ اُس کا ٹینک بھی بیکار ہو گیا تھا۔ میجر احمد اس ٹینک سے نکل کر دوسرے ٹینک میں چلا گیا۔ معاً یہ ٹینک بھی ہٹ ہو گیا۔ میجر احمد اس سے نکل کر تیسرے ٹینک میں جا گھسا۔ وہ سکواڈرن کمانڈر تھا اور معرکہ زندگی اور موت کا تھا۔ بدقسمتی سے یہ تیسرا ٹینک بھی ایک ٹینک شکن گولے کی زد میں آگیا اور میجر احمد بُری طرح جھلس گیا۔ لانس دفعدار وہاب گُل نے کمال شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سکواڈرن کمانڈر کو جلتے ٹینک سے نکال لیا اور اسے قیامت کی گولہ باری اور مشین گن فائرنگ میں سے اٹھا کر پیچھے لے آیا جہاں میجر احمد نے ہسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ وہ آخری دم تک اپنے ٹینک سواروں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اُس کی حالت ایسی تھی کہ زندہ رہنا محال نظر آتا تھا۔ اُسے زبردستی ہسپتال بھیجا گیا۔ اس کی جگہ کیپٹن فرخ خان نے سکواڈرن کی کمان سنبھال لی۔ ٹینکوں کی تعداد کم تھی۔ اس کے باوجود اس سکواڈرن نے بھاگتے دشمن کا تعاقب کیا۔

میجر آفندی کے سکواڈرن نے ڈگری اور ٹھٹھ کے علاقے میں دشمن پر حملہ کیا۔ اس سکواڈرن نے رجمنٹ کے پہلے جوان کی قربانی دی۔ یہ تھا ٹینک سوار محمد کریم جو اپنے زخمی سکواڈرن کمانڈر کو بے پناہ گولہ باری میں سے نکال لایا اور شہید ہو گیا۔ اس سکواڈرن نے دشمن کے ٹینکوں میں خوب تباہی مچائی۔ یہ ٹینک بھارت کی ایک نامور رجمنٹ، ۲ پونا ہارس کے تھے۔

یہ دونوں سکواڈرن دشمن کے قدم اکھاڑ چکے تھے مگر جس غیض و غضب سے دشمن نے توپخانے اور ٹینکوں کی گولا باری شروع کر دی اور جس طرح ٹینکوں کی ترتیب بدلی، اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ گڈ گور سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا۔ اب تیسرا سکواڈرن میجر رضا خان کی قیادت میں دونوں سکواڈرنوں کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ ان کی مدد کے لیے ۲ پنجاب رجمنٹ کے میجر محمد حسین ستارۂ جرأت اپنی کمپنی کے ساتھ چلے گئے۔ یاد رہے کہ ٹینکوں کی لڑائی میں پیادہ جوان کیڑوں مکوڑوں کی طرح کچلے جاتے ہیں۔ بکتر بند جنگ میں پیادہ جوانوں کو محفوظ مورچوں میں یا پیچھے رکھا جاتا ہے مگر یہاں معاملہ ملک و ملت کی آبرو کا تھا۔ گوشت پوست کے انسان لوہے کے آگ اگلتے ٹینکوں سے لڑ رہے تھے۔ ان کے پاس آر آر گنیں تھیں جو کھلی جیپوں میں نصب تھیں یا راکٹ لانچر تھے جو کندھے پر رکھ کر فائر کیے جاتے ہیں۔ غالباً اسی شجاعت سے اس غلط روایت نے جنم لیا تھا کہ ہمارے جوان ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے تھے اور انہوں نے سینوں سے بم باندھ رکھے تھے یہ روایت بالکل غلط ہے۔ البتہ جس بے خوفی سے راکٹ لانچر والوں نے ٹینکوں کے قریب جا جا کر راکٹ فائر کیے وہ ٹینکوں کے آگے لیٹ جانے کے مترادف تھا۔ یہ شجاعت سطحِ انسانی سے بالا تھی اور دشمن کے لیے ناقابلِ یقین

دشمن گڈ گور کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ٹینک رجمنٹ کے میجر رضا اور پنجاب رجمنٹ کے میجر محمد حسین نے زندگی کا ایک خوفناک فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے بریگیڈ کمانڈر جنرل عبدالعلی سے اجازت مانگی کہ وہ دشمن پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ

گڈ گور میں قدم نہ جما سکے۔ جنرل عبدالعلی نے ملک کی خاطر انہیں قربانی دینے کی اجازت دے دی۔ شام ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اس وقت ٹینکوں کو پیچھے ہٹا لیا جاتا ہے تاکہ شام کا اندھیرا گہرا ہونے تک اپنے ہیگر پوائنٹ پر محفوظ واپس آ جائیں لیکن اس وقت ٹینک حملے کے لیے جا رہے تھے۔ جنرل عبدالعلی نے انہیں توپخانے کا فائر دیا۔

دشمن کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ پاکستانی حملہ روک کر فوراً ہی جوابی حملہ کر دیں گے۔ اس پر اچانک توپخانے کا فائر گرنے لگا۔ اس وقت دشمن کے چھ ٹینک پیچھے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دشمن کی جمعیت میں کھلبلی مچ گئی۔ پیادہ جوان سڑک کے دونوں طرف پوزیشن میں ہو گئے اور اشارہ ملتے ہی "نعرۂ تکبیر" اور "یا علیؑ" کے نعرے لگاتے دشمن کی پوزیشنوں پر ٹوٹ پڑے۔ میجر رضا کے ٹینکوں نے اپنے پیادہ جوانوں کے سروں کے اوپر سے دشمن پر گولہ باری شروع کر دی۔ یہ دلیرانہ کارروائی دشمن کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ آٹھ ٹینک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آٹھ میں تین ٹینکوں کے انجن چل رہے تھے۔ اس کے باقی ٹینک گڈ گور میں تباہ ہو گئے تھے۔ اس جرأت مندانہ حملے نے گڈ گور کو دشمن کے سینچورین ٹینکوں کا مرگھٹ بنا دیا۔ پتہ چلا کہ یہ ٹینک جنرل چوہدری کی اپنی پیاری رجمنٹ سولہویں کیولری کے تھے۔ چوہدری کو اس رجمنٹ پر اس قدر ناز تھا کہ اس نے اسے "فخرِ ہند" کا خطاب سرکاری طور پر دلا رکھا تھا۔

جنرل عبدالعلی کے بریگیڈ کی یہ کارروائی چھوٹی سطح کی تھی لیکن اس کے نتائج عظیم اور دور رس ثابت ہوئے۔ اس جوابی کارروائی کا سہرا ٹینک سواروں اور پیادہ جوانوں کے سر ہے۔ انہوں نے پہلے ہی معرکے میں آئندہ لڑے جانے والے معرکوں کے لیے شجاعت اور فنی اہلیت کا معیار متعین کر دیا۔ انہوں نے طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک وہ تاریخ لکھ ڈالی جو تا قیامت فراموش نہ کی جا سکے گی۔ اگر یہ جانباز دشمن پر اس طرح دہشت بن کر نہ چھا جاتے تو دشمن کے پاس اتنی طاقت اور نفری تھی کہ وہ ہمارے دستوں کو الگ الگ کر کے انہیں

گھیرے میں لے کر ختم کر سکتا تھا۔ گھیرے میں آنے کا خطرہ تو ہر لمحہ تھا لیکن دشمن پر ایسی بجلیاں گریں کہ وہ پسپائی پر مجبور ہو گیا۔

پاکستان کے ان سرفروشوں نے گڈگور پر اکتفا نہ کی بلکہ احکام کو نظر انداز کر کے چوبارہ تک دشمن کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ بعض جوان مرکز کے دائرہ رابطہ سے بھی دُور نکل گئے جہاں سے انہیں واپس لانا مسئلہ بن گیا۔ گڈگور کو جو جنگی اہمیت حاصل تھی اس کے پیشِ نظر وہاں مضبوط دفاعی پوزیشنیں بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ کرنل جمشید نے جنرل عبدالعلی سے اجازت مانگی کہ وہ خود دفاعی مورچے بنوانا چاہتے ہیں۔ انہیں اجازت دے دی گئی۔ وہ اپنی ایک کمپنی لے کے وہاں چلے گئے اور انہیں دو کمپنیاں بلوچ رجمنٹ کی بھی دے دی گئیں۔ پہلے روز کے معرکے میں میجر رضا خان بھی زخمی ہو گئے تھے۔ انہیں بھی ہسپتال بھیج دیا گیا —— گڈگور کے اِرد گرد مورچے قائم کر لیے گئے۔

پہلے روز کے معرکے میں ہماری صرف ایک ٹینک رجمنٹ، ایک انفنٹری بٹالین اور ایک توپخانہ رجمنٹ نے دشمن سے تقریباً پانچ میل علاقہ واپس لے لیا۔ سب سے بڑی اور اہم کامیابی یہ تھی کہ "اپریشن نیپال" کی دھجیاں اُڑ گئیں اور بہتر گھنٹوں میں پاکستان کو دو حصوں میں کاٹ کر شکست دینے کا خواب گڈگور میں درگور ہو گیا۔ اسی روز یعنی ۸ ستمبر کی صبح لاہور پر حملہ کرنے والے ساتویں انفنٹری ڈویژن پر لاہور کے دفاعی دستوں نے جوابی حملہ کر کے اسے سرحدوں سے اس حالت میں نکال دیا تھا کہ ڈویژن کمانڈر جنرل نرنجن پرشاد کی کمانڈ جیپ اور اس کے ٹیکٹیکل ہیڈ کوارٹر کی تین اور جیپیں بھینی کے قریب رہ گئی تھیں اور جرنیل کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔ بھارت کے نمبر ایک آرمرڈ ڈویژن کو اسی ڈویژن کے ساتھ گوجرانوالہ اور وزیر آباد کے درمیان ملنا تھا مگر اب ان کی ملاقات اُسی دلیس میں ممکن تھی جس دلیس میں گنگا بہتی ہے۔

ٹینکوں کے پہلے معرکے میں بھارت کے آرمرڈ ڈویژن، انفنٹری اور بھارتی ڈویژنوں کا جو نقصان ہوا، اس کے صحیح اعداد و شمار پیش نہیں کیے جا سکتے۔ میدان میں جگہ جگہ اس کے ٹینک جل رہے تھے۔ بعض بیکار کھڑے تھے اور آٹھ صحیح سلامت پکڑے گئے تھے۔ لاشیں نہ گنی جا سکیں۔ سرحدی دیہات کے دیہاتی جو اگلے روز کسی طرح زندہ پیچھے آ گئے تھے، انہوں نے بتایا کہ توپوں اور پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے پیچھے اس قدر تباہی مچائی ہے کہ کھیت لاشوں سے اَٹے پڑے ہیں اور بے شمار ٹینک جل رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جلتے ٹینکوں سے کوئی زندہ نہیں نکل سکا اور اگر زندہ نکلا بھی تو وہ توپوں کے گولوں سے مارا گیا۔ اس کے برعکس اپنا نقصان یہ تھا: چار ٹینک تباہ ہوئے۔ سات جوان شہید اور تیئیس زخمی ہوئے۔ یہ فنی کمال کا کرشمہ تھا۔

شام کے وقت جب دشمن کے ٹینکوں کی تلاشی لی گئی تو اُن میں سے اپریشن آرڈر برآمد ہوئے جن سے بھارتیوں کے عزائم بے نقاب ہوئے۔ ان اپریشن آرڈروں سے جنرل عبدالعلی کو معلوم ہوا کہ وہ رات بھر ایک پہاڑی ڈویژن اور ایک انفنٹری ڈویژن سے اور دن بھر پورے آرمرڈ ڈویژن سے لڑتے رہے ہیں۔ دشمن کے حملے کی سکیم یہ تھی :-

(۱) ابونا ہارس کو نخنال، سبز کوٹ اور خانپور کے راستے ٹھڑوا اور ڈگری پر قبضہ کرنا تھا۔

(۲) سولھویں کیولری کو گورکھا رجمنٹ کے ساتھ رنگور اور چوبارہ کے راستے سڑک کے ساتھ ساتھ پھلورا پر قبضہ کرنا تھا۔

(۳) موٹر بریگیڈ اور نمبر ۲ لانسرز کو سبز پیر اور مست گڑھ کے راستے بھاگووال پر قبضہ کرنا تھا۔

جنرل عبدالعلی کی جرأت مندانہ قیادت، ان کے افسروں اور جوانوں کی بے خوفی نے اس سہ کالی حملے کا ستیاناس کر دیا مگر دشواری یہ تھی کہ دشمن کے پاس ٹینکوں کی اتنی افراط تھی کہ اُس نے تباہ شدہ ٹینکوں کی کمی فوراً پوری کر لی تھی۔ پہلے معرکے کے بعد اُس کے ہر حملے میں نئے ٹینک ہوتے تھے اور پیادہ

دستے تازہ دم ہوتے تھے۔ اپنے ہاں ایسی سہولت میسر نہیں تھی۔ توپخانے کی کمی خاص طور پر محسوس کی جا رہی تھی۔

۸/۹ کی رات اپنی کور آرٹلری پہنچ گئی جس کی کمان بریگیڈیئر امجد علی خان چوہدری ہلالِ جرأت کے ہاتھ تھی۔ یہی وہ توپخانہ تھا جس نے چھمب کی قلعہ بندیوں اور پختہ بنکروں کو نیست و نابود کر کے اپنے دستوں کو اکھنور کے گرد و نواح تک پہنچایا تھا۔ اسی رات اپنا آرمرڈ ڈویژن بھی فیلڈ میں آ گیا مگر یہ پورا ڈویژن نہیں بلکہ اس کی قوت اور نفری آرمرڈ بریگیڈ گروپ جتنی تھی۔ اس کی کمان جنرل ابرار حسین کے ہاتھ تھی جنہیں جنگِ قادسیہ کے بعد کفر کے ایک اور بڑے چیلنج کو قبول کرنا اور اسلام کی تاریخ کی لاج رکھنی تھی۔ جنرل عبدالعلی کا بریگیڈ ان کی کمان میں دے دیا گیا اور بعد میں جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کا بریگیڈ بھی انہیں مل گیا۔ یہ بات خاص طور پر پیشِ نظر رکھیے کہ جنرل (اُس وقت بریگیڈیئر) نیازی کا بریگیڈ محض نام کا بریگیڈ تھا۔ ابتدا میں اس میں صرف ایک پیادہ بٹالین، سات آٹھ پرانی قسم کے شرمن ٹینک اور چند ایک توپیں تھیں۔ یہ جنرل نیازی کی دلیری تھی کہ انہوں نے اسی قوت کو پورے بریگیڈ کی طرح استعمال کیا اور دشمن اسے بہت بڑی طاقت سمجھتا رہا۔

سیالکوٹ فرنٹ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا ـــــ سیالکوٹ سیکٹر، چونڈہ سیکٹر اور جسڑ سیکٹر ـــــ سیالکوٹ سیکٹر، سیالکوٹ اور گرد و نواح کا علاقہ، جموں، سیالکوٹ روڈ کا علاقہ اور باجرہ گڑھی تک تھا۔ یہ سیکٹر اور جسڑ سیکٹر جنرل ٹکا خان کو دیئے گئے۔ جسڑ میں جنرل ٹکا خان کا ایک بریگیڈ تھا جس کی کمان بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) مظفر الدین کر رہے تھے۔ سیالکوٹ سیکٹر میں چھمب اور جوڑیاں کا فاتح بریگیڈ آ گیا جس کی کمان بریگیڈیئر عظمت حیات کر رہے تھے۔ سب سے بڑی ذمہ داری جنرل ابرار حسین کے کندھوں پر تھی کیونکہ اصل جنگ چونڈہ سیکٹر میں ہو رہی تھی جہاں دشمن کا آرمرڈ ڈویژن، نمبر ۱۴ انفنٹری اور ۶ ماؤنٹین حملہ کر رہے تھے۔ سیالکوٹ بلکہ پاکستان کی سلامتی کا دارومدار اسی جنگ کی ہار جیت پر تھا۔

دشمن کے پاس کمک کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے برباد شدہ ٹینکوں اور ہلاک شدہ نفری کو فوراً پورا کر لیا اور تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے لیکن ہمارے جانبازوں نے اسے ایک انچ آگے نہ بڑھنے دیا۔ جنرل عبدالعلی عزم کیے ہوئے تھے کہ چونڈہ کا دفاع مزید فوج سے جب تک مضبوط نہ ہو جائے وہ دشمن کو آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ وہ انتہائی نازک صورتِ حال سے دوچار تھے۔ دشمن کی قوت زیادہ تھی اور اپنی قوت گھٹتی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے تین دن اور تین راتیں دشمن کو چوبارہ اور معراجکے کے شمال میں روکے رکھا۔

جنرل ابرار حسین ڈیڑھ سو ٹینک لے کے اُس میدان میں آئے جہاں دشمن چھ سو ٹینک لایا تھا۔ انہیں انہی ٹینکوں سے لڑنا تھا اور اس طرح استعمال کرنا تھا کہ دشمن کسی راستے سے سیالکوٹ تک نہ پہنچ سکے۔ جنرل صاحب کے خیال کے مطابق دشمن کے سامنے کئی راستے کھلے تھے۔ وہ علاقہ ایسا ہے جہاں ٹینکوں کے راستے میں کوئی قدرتی رکاوٹ نہیں۔

دشمن اپنی طاقت کے بل بوتے پر ہر داؤ آسانی سے کھیل سکتا تھا۔ اس کے برعکس جنرل ابرار حسین کو اللہ کے بعد اپنے دماغ کے بھروسے شطرنج کی چالیں چلنی تھیں۔ دشمن کہیں بھی حملہ کر کے اور کسی بھی طرف ٹینکوں کا رُخ کر کے جنرل ابرار حسین کے ٹینکوں کو چکر دے کر ختم کر سکتا تھا لیکن جنرل صاحب جنرل راجندر سنگھ کو اپنی پسند کے میدان میں لڑانا چاہتے تھے جہاں وہ سیالکوٹ کے راستے بھی مسدود رکھیں اور اس کی طاقت کو بھی کمزور کرتے رہیں۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ لڑائی پھلورا، ظفروال، چونڈہ اور بدیانہ کے میدان میں لڑیں گے۔ انہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ دشمن کی نظر اب چونڈہ پر ہے۔ انہوں نے دشمن کو یہ بھی یقین دلانے کے لیے کہ جو کچھ ہے چونڈہ میں ہی ہے، چونڈہ کے ارد گرد دفاعی پوزیشنوں کو ہیرے (ڈائمنڈ) کی شکل میں ترتیب دے دی جس کا خاکہ درج ذیل ہے:

سیالکوٹ	پھلورا	
بدیانہ	چونڈہ	ظفروال
	پسرور	

اس ترتیب کا اہم مقصد یہ تھا کہ دشمن چونکہ سیالکوٹ پہنچنا چاہتا ہے اس لیے دفاعی مورچے ایسے ہوں کہ دشمن جس سمت سے بھی سیالکوٹ کی طرف بڑھے، اس کے دونو پہلو یا کم از کم ایک پہلو ہمارے دفاعی مورچوں کی زد میں رہے۔ جنرل ابرار حسین نے بریگیڈیئر امجد چوہدری کے توپخانے کو پسرور پوزیشن میں رکھا۔ یہ ایسی پوزیشن تھی جہاں سے میڈیم اور بڑی توپیں دُور دُور تک اور ہر طرف گولہ باری کر سکتی تھیں۔ اس توپخانے (کور آرٹلری) کا کچھ حصہ سیالکوٹ سیکٹر میں رکھا گیا جہاں سے توپیں دُور دُور تک مار کر سکتی تھیں۔

آئندہ لڑے جانے والے معرکوں میں اپنے بکتر بند اور پیادہ دستوں کو حفاظتی اور امدادی گولا باری دینے کے لیے توپوں کو انہی دو مرکزی پوزیشنوں کے محور میں متحرک رکھا گیا۔ حد یہ کہ دو پونڈر جیسی بڑی توپیں جو اکثر ایک پوزیشن سے کم ہی ہلائی جاتی ہیں، متحرک رکھی گئیں۔ کئی بار ان توپوں نے دشمن کے ٹینکوں پر اس حالت میں براہِ راست فائر کیا جبکہ ان پر ٹینکوں کے براہِ راست گولے آ رہے تھے۔ یہ توپخانے کے کمانڈروں کا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ ان توپوں کو تباہ کرنے کے لیے انڈین ایئر فورس نے مسلسل لڑاکا بمبار طیارے بھیجے مگر انہیں کبھی کوئی بڑی توپ نظر نہ آئی حالانکہ یہ توپیں بسا اوقات کاموفلاژ کے بغیر میدان میں سرگرم رہتی تھیں۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ سناتا چلوں تو بے محل نہ ہو گا۔ ایک سکھ ہوا باز کو ہمارے طیارہ شکن توپچیوں نے گرا لیا تھا۔ یہ سکھ پیراشوٹ سے ہمارے ہی علاقے میں اُتر آیا۔ پکڑے جانے کے بعد اُس نے پہلی بات یہ کہی ––– "اب میں آپ کا قیدی ہوں۔ مجھے اتنا بتا دو کہ تمہاری بڑی توپیں کہاں ہیں" ––– اُسے صحیح پوزیشنیں تو نہ بتائی گئیں، اتنا ہی بتایا گیا کہ توپیں پسرور سے کس طرف ہیں اور اسے یہ بھی بتا دیا گیا کہ توپیں ڈھکی چھپی نہیں بلکہ کھلے میدان میں ہیں۔ ان توپوں پر حملہ کرنے والے

سات طیارے زمینی توپچیوں نے گرائے۔ ان تمام ہوائی حملوں میں توپخانے کو صرف اتنا نقصان پہنچا کہ ایک گاڑی خراب ہو گئی جسے ٹھیک کر لیا گیا۔

اپنے توپخانے نے ان دو پوزیشنوں سے سارے محاذ کو کور کیے رکھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دشمن کے ٹینک بے قابو ہو کر لمبے چوڑے محاذ سے آگے نکلنے لگے۔ ایسی صورت میں پسرور اور سیالکوٹ کے توپخانوں نے کراس فائر شروع کر دیا جس میں اُلجھ کر دشمن کے ٹینک خوب برباد ہوتے۔ ایسے ہی فائر سے بھارتیوں کی بربادی کر اپنی آنکھوں دیکھ کر ایک غیر ملکی جنگی وقائع نگار نے اپنی رپورٹ میں اس فائر کو THE CRUEL CROSS FIRE OF PAKISTAN ARTILLERY (پاکستانی توپخانے کا ظالمانہ کراس فائر) کہا تھا۔

جنرل ابرار حسین نے توپخانے کو بے تحاشا اور بے ساختہ خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے توپچی توپوں کا میکانکی حصہ بن گئے تھے جو توپوں کے کل پرزوں کی طرح جیسے بجلی یا مشین کے زور پر چل رہے ہوں۔ خصوصی خراجِ تحسین کے قابل ہوائی 'او پی' ہیں جو چھوٹے چھوٹے طیاروں L19 میں دشمن کے اُوپر اُڑ کر فائر آرڈر دیتے تھے۔ ایسے کئی طیارے جب اترتے تھے تو اُن کے پَر اور باڈی گولیوں سے چھلنی ہوتی تھی۔ یہی کیفیت زمینی 'او پی' افسروں کی تھی۔

جنرل ابرار حسین کو پاک فضائیہ کی شدید ضرورت تھی۔ دشمن اپنی ایئر فورس کا استعمال بے دریغ کر رہا تھا لیکن جنرل صاحب کو احساس تھا کہ پاک فضائیہ کی قوت اس قدر قلیل ہے کہ اگر اسے پاک فوج کی مدد کے لیے بلایا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آسمان دشمن کے طیاروں کے لیے خالی رہ جائے۔ لہٰذا جنرل صاحب نے اپنے کمانڈروں کو ہدایت دی کہ دشمن کے عقب میں جہاں تک توپوں کے گولے پہنچ سکتے ہیں وہاں تک پاک فضائیہ کو نہ بلایا جائے۔

۸ سے ۱۰ ستمبر تک جنرل عبد العلی کے بریگیڈ نے دشمن کو روکے رکھا۔ جنرل ابرار حسین اس بریگیڈ کو ذرا سستانے کے لیے پیچھے کرنا چاہتے تھے۔ بعض

افسر اور جوان زخمی حالت میں لڑ رہے تھے، وہ اپنی مرہم پٹی خود کر لیتے تھے اور ہسپتال میں جانا تو درکنار رجمنٹل ایڈ پوسٹ تک نہیں جاتے تھے جنرل
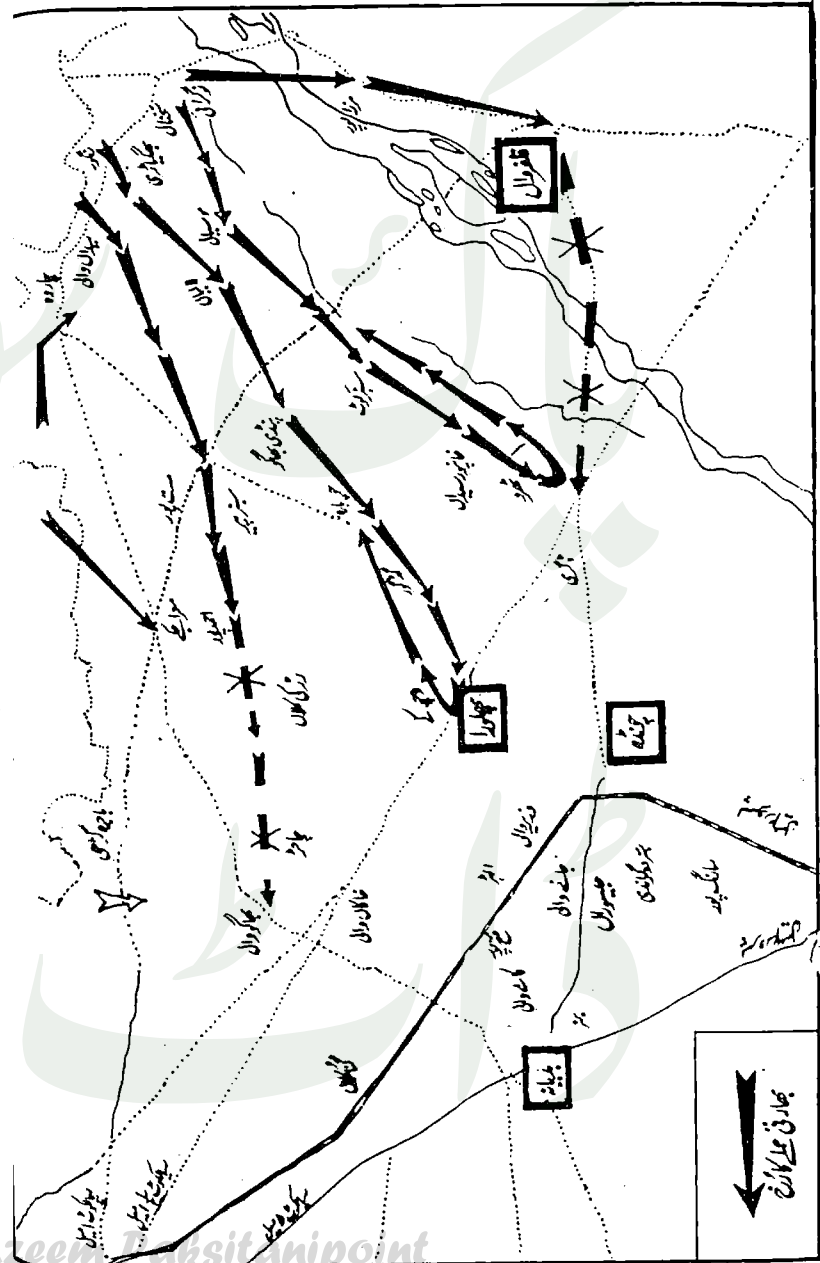
صاحب اب اپنی سکیم کے مطابق پوزیشنوں کو نئی تنظیم اور ترتیب دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ دشمن کی طرف سے توپخانے کی جو گولہ باری آ رہی تھی، اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ دشمن کا بڑا حملہ آ رہا ہے اور وہ ہمیں گولہ باری سے دبا کر یونٹوں کو نئی ترتیب دے رہا ہے۔ جنرل ابرار حسین نے ١٠/١١ ستمبر کی رات جنرل عبدالعلی ملک کو حکم دیا کہ وہ اپنا بریگیڈ پیچھے لے آئیں۔ ان کی جگہ انہوں نے ایک اور ٹینک رجمنٹ (١١ کیولری)، کرنل عزیز کی زیر کمان اور فرنٹیئر فورس کی ایک بٹالین کرنل مجید کی زیر کمان پھلورا کے علاقے میں بھیج دی۔ یہ ٹینک رجمنٹ چھمب جوڑیاں سیکٹر پر حملے میں شامل تھی اور چونڈہ کے لیے روانگی کے وقت تک لڑتی رہی تھی۔ اس کے ٹینک سوار تھکے ہوئے تھے۔ ان دو یونٹوں کو آگے بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ توپخانے کے کرنل عبدالرحمٰن شہید تھے۔

جنرل ابرار حسین نے کرنل عزیز اور کرنل مجید کو ہدایت دی کہ جب دشمن ان پر حملہ کرے تو وہ تھوڑی دیر جم کر مقابلہ کریں پھر دشمن کے دباؤ تلے پیچھے ہٹنا شروع کر دیں تاکہ دشمن ان کے تعاقب میں آگے چلا آئے۔ جنرل صاحب دشمن کو اپنی سکیم کے مطابق چونڈہ کے میدان میں لانا چاہتے تھے جہاں ان کی دفاعی پوزیشنیں ایسی تھیں جو دشمن کو پھندے میں پھانس سکتی تھیں۔ اسی مقصد کی خاطر انہوں نے پھلورا میں تھوڑی طاقت بھیجی تھی۔

یہ دو یونٹیں رات کی تاریکی میں پھلورا کے میدان میں پہنچ گئیں تو جنرل عبدالعلی اپنے بریگیڈ کو پیچھے لانے لگے۔ بریگیڈ ابھی پیچھے پہنچا بھی نہیں تھا کہ دشمن نے توپخانے کی بے پناہ گولا باری شروع کر دی۔ سحر کے تین بج رہے تھے۔ یہ گولہ باری پو پھٹنے تک جاری رہی۔ بھارتیوں کو توقع تھی کہ تین گھنٹوں کی گولہ باری سے پاکستانی مورچے ختم ہو چکے ہوں گے۔ انہوں نے دو ٹینک رجمنٹوں سے حملہ کر دیا۔ اس حملے کو روکنا ایک ٹینک رجمنٹ اور ایک

پیادہ بٹالین کے بس کی بات نہیں تھی۔ انہیں تو ویسے بھی سکیم کے تحت۔ دباؤ
تلے پیچھے ہٹنا تھا لیکن جنرل ابرار حسین کہتے ہیں کہ افسروں اور جوانوں کے جوش
اور جذبے کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وہ لڑے اور خوب لڑے اور انہوں نے جانوں
کے جو نذرانے دیئے وہ ہماری تاریخ کا ایک قابلِ فخر باب ہے۔ انہیں اپنے
جرنیل کی اس ہدایت کا اچھی طرح احساس تھا کہ انہیں دشمن کو یہیں روکنا ہے
اور اسے اپنے ساتھ پوری طرح اُلجھا کر اگلی ہدایت کے مطابق اس طرح پیچھے
ہٹنا ہے کہ دشمن بھی ساتھ ہی چلا آئے۔ یہ چال کوئی ایسی سہل نہیں ہوتی۔ اس
کے لیے بہت قربانی دینی پڑتی ہے۔

جنرل ابرار حسین ہر کٹھن مرحلے سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ ان کے لیے
دشمن کا یہ حملہ اور یہ صورتِ حال غیر متوقع نہیں تھی۔ انہوں نے جنرل عبدالعلی
کے بریگیڈ کو چونڈہ کی پوزیشنوں میں واپس جانے کا حکم دے دیا اور پھلورا کی
دونو یونٹوں کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹنا اور دشمن کو اپنے ساتھ لانا شروع کر دیں۔
مگر جنگ اس قدر گھمسان کی اور اس قدر خونریز تھی کہ پیچھے ہٹنا آسان نہیں تھا۔
سورج دور اوپر آ جانے تک بھی نظر نہ آیا۔ دونو طرف کے توپخانوں کی گولہ باری
سے زمین پھٹ رہی تھی۔ گرد و غبار میں ساتھی کو ساتھی نظر نہ آتا تھا اور
فضا میں گولے اور گولیاں چنگھاڑ اور چیخ رہی تھیں۔

کرنل عبدالرحمٰن شہید نے اپنے توپخانے کا خوب استعمال کیا۔ دوپہر کا وقت
تھا، اپنی دونو یونٹیں ابھی پھلورا کے مقام پر لڑ رہی تھیں۔ کرنل عبدالرحمٰن،
ٹینک رجمنٹ کے کمانڈر کرنل عزیز اور ان کے سیکنڈ اِن کمان میجر مظفر ملک پھلورا
کے چوراہے کے قریب اپنی کاروائی کا پلان تیار کر رہے تھے کہ توپ یا ٹینک کا
ایک گولہ ان کے قریب آن پھٹا جس سے کرنل عبدالرحمٰن شہید ہو گئے، کرنل
عزیز شدید زخمی ہوئے۔ ان کی ایک ٹانگ ہی کٹ گئی اور میجر مظفر ملک بھی شدید
زخمی ہو گئے۔ یہ نقصان ہوشربا تھا یعنی جس وقت معرکہ عروج پر تھا، تین سینئر
افسر میدان سے اُٹھ گئے۔ ٹینک رجمنٹ کے سکواڈرن کمانڈر اپنے کمانڈنگ

آفیسر کے بعد لڑتے رہے۔

جنرل عبدالعلی کا بریگیڈ پہنچ گیا۔ اُدھر سے پھلورا کے دستے لڑتے ہوئے
پیچھے ہٹنے لگے۔ دشمن ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا اور جنرل ابرار حسین
کا مقصد پورا ہونے لگا۔ اپنی پچیسویں کیولری (ٹینک رجمنٹ) ایک بار پھر
دشمن پر جھپٹ پڑی۔ اب میدانِ جنگ کی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ اپنے دستے
پیچھے ہٹ رہے تھے۔ دشمن انہیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور پچیسویں
کیولری کے ٹینک ہلّہ بول رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو واضح کرنے کے لیے
میں صرف ایک واقعہ بیان کروں گا۔ اپنی پچیسویں کیولری کے ایجوٹنٹ میجر
سکندر جنہوں نے میجر رضا خان کے زخمی ہونے کے بعد ان کے سکواڈرن کی کمان
لے لی تھی، کھلی جیپ میں انتہائی تیز رفتار سے آگے جا رہے تھے۔ انہیں
اسی تیزی سے آگے جانا چاہیے تھا۔ گرد و غبار میں انہیں چند ایک ٹینک اِدھر اُدھر
کھڑے نظر آئے جنہیں اپنے سمجھ کر وہ ان کے قریب چلے گئے۔ گرد و غبار میں
ٹینکوں کو پہچاننا مشکل تھا۔ قریب جا کر انہیں نظر آیا کہ یہ تو بھارتیوں کے سینچورئین
ٹینک ہیں۔ میجر سکندر ان کے نرغے میں تھے۔ انہوں نے جیپ کو موڑا اور ٹینکوں
کے اتنی قریب ہو کر پیچھے کو جیپ بھگائی کہ انہوں نے ٹینکوں کے نمبر بھی پڑھ
لیے تھے۔ وہ جیپ کو ایک کھڈ میں لے گئے۔ ٹینکوں نے ان پر گولہ باری شروع
کر دی لیکن خدا نے انہیں بچا لیا۔

جب دشمن اُس میدان میں آ گیا جہاں جنرل ابرار حسین اسے لانا چاہتے
تھے تو جنرل صاحب نے اس پر الہڑ وزیر والی کی طرف سے ایک اور ٹینک رجمنٹ
"گائیڈز کیولری" سے حملہ کرا دیا۔ اس رجمنٹ کے کمانڈر کرنل امیر گلستان جنجوعہ تھے۔
دشمن چونکہ آگے بڑھ رہا تھا اور اس پر یہ حملہ پہلو سے ہو رہا تھا اس لیے دشمن کے
ٹینکوں کے پہلو گائیڈز کیولری کے ٹینکوں کے لیے نہایت آسان نشانہ بنے۔
پسرور اور سیالکوٹ کے توپخانوں نے جو گولہ باری کی اس سے دشمن کے لیے
پیش قدمی بھی دشوار ہو گئی اور پسپائی بھی۔ پاک فضائیہ کو بلایا گیا۔ شاہبازوں نے

دشمن کے اگلے ٹینکوں کو اپنے توپخانے اور ٹینکوں کے لیے چھوڑ دیا اور عقب میں جا کر دشمن کی کمک اور سپلائی وغیرہ کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ سورج جو گرد اور گولوں کے دھوئیں کی گھٹاؤں میں طلوع ہوا تھا، انہی گھٹاؤں میں چھپتا چھپاتا غروب ہو گیا۔ پھلورا کا معرکہ ختم ہو گیا۔

جنرل ابرار حسین کہتے ہیں کہ میں دشمن کو جس پوزیشن میں لانا چاہتا تھا وہ اسی جگہ آ گیا لیکن مجھے بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی۔ شہیدوں اور زخمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کچھ ٹینک بھی قربان کرنے پڑے۔ اگر یہ قربانی نہ دی جاتی تو جنگ کی صورت بہت مختلف ہوتی۔ دشمن کسی اور سمت یا کئی اور سمتوں سے آگے بڑھ کر ہمیں بکھیر بکھیر کر لڑاتا اور ختم کر دیتا۔ اس سکیم سے یہ فائدہ ہوا کہ دشمن اس دھوکے میں آ گیا کہ جو کچھ ہے، اسی جگہ ہے۔ پھلورا دشمن کے ہاتھ آ گیا لیکن یہ ایک دانہ BAIT تھا۔ جنرل راجندر سنگھ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ آج پھلورا لے لیا ہے تو کل چونڈہ بھی لے لیں گے پھر آگے بڑھنا آسان ہو گا۔ دشمن کے قیدیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ سمجھتے تھے کہ پھلورا میں ہم نے بہت بڑی طاقت جمع کر رکھی ہے حالانکہ وہاں ہماری ادھوری سی ایک ٹینک رجمنٹ اور ایک پیادہ بٹالین تھی۔ جنرل راجندر سنگھ کو اسی خوش فہمی نے شکست دی کہ پھلورا میں وہ پاکستانیوں کی بہت بڑی طاقت برباد کر چکا ہے۔

جو نقصان راجندر سنگھ نے اٹھایا وہ ہمارے دستوں کے حوصلے بڑھانے کے لیے بہت کافی تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس معرکے میں جنرل چوہدری کی اپنی "فخرِ ہند" ٹینک رجمنٹ (سولھویں کیولری) مکمل طور پر تباہ ہو گئی ہے۔ اب اُس کا وجود صرف کاغذوں پر رہ گیا تھا۔ اُس کی انفنٹری کا نقصان اتنا تھا جسے کوئی بھی کور کمانڈر برداشت نہیں کر سکتا۔ مسلسل دو دن دشمن رِی گروپنگ یعنی اپنے دستوں کی کمی پوری کرنے اور انہیں ازسرِ نو منظم کرنے میں مصروف رہا۔ ان دو دنوں اور راتوں میں چونڈہ کے مورچے اور پہلو کے مورچے مضبوط کر لیے گئے۔ کیونکہ اب یقین ہو گیا تھا کہ دشمن جنرل ابرار حسین کی سکیم کے

تحت اسی جگہ حملے کرے گا۔ اس کے مطابق مورچوں میں ردّ و بدل کر لیا گیا۔ ظفروال اور بدیانہ کو بھی مستحکم کر لیا گیا۔ چونڈہ سے دُور آگے تک ٹینک شکن بارودی سرنگیں بچھا دی گئیں۔ دونو طرف کے توپخانے ایک دوسرے پر آگ اُگلتے رہے۔ دشمن چونکہ زخم چاٹ رہا تھا، اس ارادے سے کہ وہ چین سے نہ بیٹھ اور نہ سوچ سکے، رات کے وقت ٹینک شکار پارٹیاں اور لڑاکا گشتی دستے دشمن کے علاقے میں جا کر شبخون مارتے رہے۔

ٹینک شکار پارٹی اور لڑاکا گشتی دستے کا کام جانبازی کا ہوتا ہے۔ چند ایک جوان ٹینک شکن اسلحہ (راکٹ لانچر) اور دیگر ہتھیاروں سے مسلح ہو کر چوری چھپے اکیلے اکیلے دشمن کے مورچوں کے علاقے میں جاتے ہیں۔ وہ عام طور پر مشین گن پوسٹوں، ٹینکوں، گولہ بارود کے ذخیروں، گاڑیوں اور جھگیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ دشمن روشنی راؤنڈ فائر کر کے مشین گنوں سے ہر طرف بوچھاڑیں مارنی شروع کر دیتا ہے۔ اکثر اوقات جانبازوں کی یہ پارٹی پوری واپس نہیں آتی۔ کئی محاذوں پر ہمارے ان جانبازوں نے آٹھ آٹھ اور دس دس کی نفری سے شبخون مار کر دشمن کے بریگیڈ تک کو اکھاڑا ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہوتا ہے جو رات کے اندھیرے میں کیا جاتا ہے اور جس کا کوئی عینی شاہد نہیں ہوتا۔ اپنی گہری نیند سوئی ہوئی قوم کی آن پر قربان ہونے کے لیے ایک جوان رینگ رینگ کر موت کے منہ میں جا رہا ہوتا ہے۔ وہ موت کے پیٹ میں بھی اس امید پر چلا جاتا ہے کہ نکل آئے گا اور اگر نہ نکل سکا تو خدا کے حضور سرخرو ہو جائے گا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس مختصر سے مضمون میں ذاتی شجاعت کے کارنامے سمیٹے نہیں جا سکتے۔ یہ پوری کتاب کا موضوع ہے۔ میں علامت کے طور پر ۲ پنجاب رجمنٹ کے ایک نوجوان سیکنڈ لیفٹیننٹ فاروق آدم کا ضرور ذکر کر دوں گا۔ وہ چونڈہ کی جنگ کا تمام عرصہ دشمن کے لیے دہشت اور تباہی کا باعث بنا رہا۔ ۱۲ ستمبر کے بعد ہر رات دشمن کے علاقے میں گھس جاتا تھا اور تباہی مچا کر کیڑے مکوڑے کی طرح رینگتا واپس آ جاتا تھا۔ اُس کا مشن اکثر اوقات

گوریلا اپریشن بن جاتا تھا۔ وہ دشمن کے عقب تک بھی پہنچا اور اُسے کافی نقصان پہنچایا۔ ہر رات یقین ہوتا تھا کہ آج یہ لڑکا واپس نہیں آسکے گا لیکن وہ ستارۂ جرأت لینے کے لیے زندہ رہا اور آج بھی زندہ ہے۔ وہ پاکستان آرمی کے ایک ریٹائرڈ میجر جنرل آدم خان کا فرزندِ ارجمند ہے جنہوں نے گزشتہ جنگِ عظیم میں بہادری کے صلے میں دوسرا بڑا تمغہ ملٹری کراس حاصل کیا تھا۔

فاروق آدم کی پلٹن ۲ پنجاب رجمنٹ کے متعلق یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ نشانِ حیدر بٹالین ہے۔ پہلے نشانِ حیدر کیپٹن سرور شہید اسی بٹالین کے افسر تھے۔ اس بٹالین نے چونڈہ کے میدان میں بڑی جانفشانی سے نشانِ حیدر کی لاج رکھی۔

جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کا بریگیڈ بھی جنرل ابرار حسین کی تحویل میں آ گیا۔ ہمارے ہوائی 'او پی' اڑتے رہتے اور دشمن کی نقل و حرکت دیکھتے رہتے تھے۔ جہاں کہیں حرکت نظر آتی تھی وہ اطلاع دیتے تھے اور توپخانہ وہاں آگ اُگلنے لگتا تھا۔ نفری بہت کم تھی۔ تمام علاقے کو محفوظ کرنا مشکل تھا اس لیے دشمن پر نظر رکھنے کا خطرناک کام ہوائی 'او پی' کر رہے تھے۔ ۱۲ ستمبر شام تین بجے ایک ہوائی 'او پی' نے اطلاع دی کہ دشمن کی ایک ٹینک رجمنٹ اور ایک بٹالین ظفروال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جنرل ابرار حسین نے جنرل نیازی کو ظفروال کی طرف روانہ کر دیا۔ وہاں ۱۳ فرنٹیئر فورس کی ایک پلاٹون (تیس چالیس جوان) موجود تھی۔ اس سے پہلے جنرل نیازی جنرل ابرار حسین سے کہہ چکے تھے کہ دشمن نے ظفروال لے لیا ہے انہیں جوابی حملے کی اجازت دی جائے۔

جنرل ابرار حسین کی نگاہ میں ظفروال پر دشمن کا حملہ دھوکہ بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ چونڈہ کے مستحکم دفاع سے منہ موڑ کر دشمن ظفروال سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ بہر حال جنرل نیازی شام کے وقت ظفروال پہنچ گئے اور مورچے سنبھال لیے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ رات کا ایک بج رہا

تھا، دشمن نے گولہ باری شروع کر دی۔ نفری تھوڑی تھی۔ باقی تمام رات گولے برستے رہے۔ اور جوان پھٹتے گولوں کے دھماکے برداشت کرتے رہے۔ ایسے مسلسل دھماکے اور موت کا خوف جوانوں کے اعصاب کو بیکار کر دیا کرتا ہے۔ لیکن لوہے کے یہ جوان صبح چھ بجے جب دشمن نے ان پر انفنٹری کا شدید حملہ کیا تو وہ حملہ روکنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

جنرل نیازی کو جو چھ سات ٹینک دیے گئے تھے وہ عمر خوردہ شرمن تھے جن میں سے تین کے انجن رُک گئے اور وہ حرکت کرنے کے قابل نہ رہے، ان کی گنیں فائر کرتی رہیں۔ جنرل نیازی کو جنرل ابرار حسین نے ٹینکوں کا ایک اور سکواڈرن دے دیا۔ یہ سکواڈرن اس قدر تیزی سے پہنچا کہ دشمن بوکھلا گیا۔ یہ ہماری خصوصی MOBILITY AND SURPRISE چال کی نمایاں مثال تھی جو دشمن کے لیے ناگہانی آفت ثابت ہوئی۔ فرنٹیئر فورس رجمنٹ نے یہ حملہ ذاتی شجاعت کے بل بوتے پر نہ صرف روک لیا بلکہ دشمن کے پاؤں اکھاڑ کر جوابی حملہ کر دیا۔ دشمن نے چار گنا زیادہ طاقت سے حملہ کیا تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق یہ پورا بریگیڈ تھا جسے جنرل نیازی نے بُری طرح تتر بتر کیا۔ دشمن کا جانی نقصان بے تحاشا ہوا۔

یہاں بھی ذاتی شجاعت کے جو کارنامے ہوئے ان میں سے صرف ایک بیان کروں گا۔ معرکے کے بعد جب شہیدوں اور زخمیوں کے متعلق رپورٹیں فراہم ہونے لگیں تو معلوم ہوا کہ اپنا ایک حوالدار لاپتہ ہے۔ یہ حوالدار نیا نیا اس بٹالین میں آیا تھا۔ اس کے متعلق یہی کچھ سمجھا جا سکتا تھا کہ شہید یا قیدی ہو گیا ہے۔ یہ رپورٹ لکھی جا رہی تھی کہ دُور سے ہری وردی پہنے ہوئے ایک پارٹی آتی نظر آئی۔ سب کے ہاتھ سروں کے اُوپر تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ آخری دو آدمیوں نے سروں پر رائفلوں اور مشین گنوں کے گٹھے اٹھا رکھے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے اپنا گمشدہ حوالدار سٹین گن اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ وہ گھمسان کے معرکے میں پلاٹون سے الگ ہو گیا تھا اور تن تنہا یہ چودہ

بھارتی قیدی پکڑ لایا۔ ان میں ایک حوالدار تھا، دو نیئن نائیک اور لانس نائیک اور باقی سپاہی تھے۔ اپنے حوالدار نے اپنی سٹین گن دکھائی۔ اس میں صرف ایک گولی رہ گئی تھی۔

جب یہ معرکہ لڑا جا رہا تھا تو جنرل ابرار حسین کے حکم کے تحت بدیانہ اور چونڈہ کی طرف سے دشمن کے سامنے والی پوزیشنوں پر حملہ کر دیا گیا تاکہ وہ ظفروال کی طرف کوئی مدد نہ بھیج سکے۔ آٹھ بجے تک یعنی صرف دو گھنٹوں میں دشمن ظفروال کے علاقے میں بے شمار لاشیں اور تڑپتے ہوئے زخمی چھوڑ کر پسپا ہو گیا۔

ایک بجے دوپہر دشمن نے ظفروال پر ایک اور شدید حملہ کیا۔ یہ اس کے چودھویں انفنٹری ڈویژن کا ایک بریگیڈ تھا جس کے ساتھ ایک ٹینک رجمنٹ ۲ لانسرز تھی۔ اب اس نے اپنی نفری بڑھا دی تھی یعنی بریگیڈ میں ایک بٹالین کا اور ٹینک رجمنٹ میں ایک سکواڈرن کا اضافہ کر دیا تھا۔ اب کے دشمن جو ٹینک لایا وہ بالکل نئے سنچورین تھے جن کی تعداد اضافے کے ساتھ ستر اور اسی کے درمیان تھی۔ ان کے مقابلے کے لیے جنرل ابرار حسین نے صرف چودہ پیٹن اور چھ شرمن ٹینک بھیجے۔ یہ ایک اور اہم معرکہ تھا جس نے دشمن کو نہ صرف جانی نقصان پہنچایا بلکہ اس کا مورال بھی مجروح ہونے لگا۔

دشمن کے ٹینکوں نے الہڑ کی طرف چونڈہ کے دفاع کے پہلو پر ضرب لگانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ اپنے بکتر بند دستوں کے علاوہ توپخانے نے ان ٹینکوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ بہت سے ٹینک برباد کرا کے دشمن نے بدیانہ کا رُخ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پسرور اور سیالکوٹ کے توپخانوں نے کراس فائر کیا اور چونڈہ کی مغربی سمت کے میدان کو بھارتی ٹینکوں کا مرگھٹ بنا دیا۔ لاشوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ جنرل ابرار حسین کی یہ سکیم کامیاب تھی کہ دشمن جس طرف سے بھی آگے بڑھے اس کے پہلو اپنی کسی نہ کسی دفاعی پوزیشن کی زد میں رہیں۔ اس زد سے بچنے کے لیے دشمن نے اپنے پہلوؤں میں مزید نفری کا اضافہ کر دیا۔

ظفروال سے دشمن منہ موڑ گیا۔ ۱۴ ستمبر کے روز سے چونڈہ، بدیانہ کی ٹینکوں کی اصل جنگ شروع ہوئی۔ جنرل عبدالعلی کا بریگیڈ پوزیشن میں تھا۔ چونڈہ، الہڑ اور گنہ کلاں تک بارودی سرنگیں بچھا دی گئیں اور چونڈہ بدیانہ تک ٹینک بھی پوزیشنوں میں کر دیے گئے۔ اس موقع پر جنرل ابرار حسین نے طاقت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک خطرہ مول لے لیا۔ رات کے وقت ٹینکوں کو دور پیچھے رکھا جاتا ہے جسے لیگر کہتے ہیں۔ یہ اقدام اس لیے کیا جاتا ہے کہ رات کے وقت ٹینک اندھے ہوتے ہیں۔ دشمن کی ٹینک شکار پارٹیاں انہیں تباہ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ دن بھر گرد و غبار میں بھاگ بھاگ کر رات کے وقت ٹینکوں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے جو محفوظ مقام پر ہو سکتی ہے۔ جنرل ابرار حسین نے یہ فیصلہ کیا کہ رات کے وقت بھی ٹینکوں کو آگے رکھا جائے اور وہیں دیکھ بھال وغیرہ کی جائے۔ دشمن کے منہ کے سامنے ٹینک رکھنا خودکشی کے برابر ہوتا ہے لیکن اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہ تھا۔ جنرل صاحب کہتے ہیں کہ میں نے یہ فیصلہ جوانوں کے جذبے کو دیکھ کر کیا تھا۔ انہوں نے اس فیصلے کو بسروچشم قبول کیا بلکہ پسند کیا۔ وہ اب دن بھر لڑتے اور رات جاگ کر اپنے ٹینکوں کی حفاظت بھی کرتے اور ان کا معائنہ وغیرہ بھی کرتے رہتے۔

صبح ہی صبح بدیانہ اور چونڈہ سے اطلاعیں آنے لگیں کہ دشمن حملے کے لیے ٹینک جمع کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی دشمن کے توپخانے کا ایسا فائر آنے لگا جو کبھی دیکھا نہ سنا تھا۔ اوپر سے لڑاکا بمبار طیارے آ گئے جنہوں نے ہماری پوزیشنوں پر آگ برسانی شروع کر دی۔ یہ بہت بڑے حملے کا پیش خیمہ تھا۔ پاک ضائیہ کو بلایا گیا۔ شاہبازوں نے دشمن کا ایک طیارہ گرا لیا اور باقی طیاروں کو بھگا یا۔ دن کے تین بجے تک شدید گولہ باری جاری رہی۔ گولہ باری ختم ہوتے ہی الے والی، وزیروالی کی طرف سے چونڈہ سے لے کر بدیانہ تک کے علاقے پر بہت ندید اور طاقت ور حملہ آیا۔ یہ آرمرڈ ڈویژن کا حملہ تھا جس کے ساتھ موٹر بریگیڈ

بھی تھا اور چھٹا پہاڑی ڈویژن بھی۔ ٹینکوں کی تعداد تین سَو کے قریب تھی۔ ان
کی مدد کے لیے پیچھے اور ٹینک تیار تھے۔ تھوڑی دیر میں ٹینکوں کا ایک بھیانک
معرکہ شروع ہو گیا۔ انڈین ایئر فورس نے دل کھول کر اپنے بکتر بند ڈویژن کو
مدد دی۔ پاک فضائیہ نے ہر بار بروقت پہنچ کر اپنے دستوں کو آسمانی خطرے
سے محفوظ کر لیا۔ اس معرکے میں بھی اپنے توپخانے نے فنی کمال اور بہادری
کے بل بوتے پر ٹھکانے کی گولہ باری کی۔ شام چھ بجے تک جنگ چونڈہ بدیانہ کے علاقے
میں جاری رہی اور ٹینکوں کی لڑائی ہوتی رہی۔ شام کے وقت دشمن ٹینک پیچھے
لے جانے لگا۔ دشمن کے ٹینکوں سے جو آپریشن آرڈر برآمد ہوئے ان سے پتہ
چلا کہ دشمن شام تک چونڈہ پر قبضہ کر کے وہاں انفنٹری لگا دینا چاہتا تھا اور وہاں سے
اُسے آگے بڑھنا تھا۔

رات کے وقت ٹینک شکار پارٹیاں اور لڑاکا گشتی پارٹیاں بھیجی گئیں تاکہ دشمن
اگلے حملے کے لیے چین سے سوچ نہ سکے۔

۱۵ ستمبر کی صبح اور پھر آٹھ بجے دشمن نے دو حملے کیے۔ وہ اب چونڈہ اور
جیسوراں کے درمیان سے آگے نکلنا چاہتا تھا۔ یہاں بھی پاک فضائیہ کو بلایا گیا
جس نے دشمن کے ٹینکوں کا خوب شکار کیا۔ توپخانے نے بھی اپنی روایات کو
برقرار رکھا قابلِ تحسین وہ او پی تھے جو اس قیامت کی جنگ میں دشمن کے
سامنے ڈٹے رہے اور نہایت کارگر گولہ باری کراتے رہے۔ دشمن ٹینکوں کے
ساتھ انفنٹری بھی دل کھول کر لایا تھا اس لیے اپنی انفنٹری کی بارٹہ بلاٹونوں نے
جو سرگرمی دکھائی وہ قابلِ داد تھی۔ اس کے بعض او پی زخمی ہو کر بھی اپنی
پوزیشن سے نہ ہٹے اور فائر کنٹرول کرتے رہے۔ ٹینکوں کا یہ عالم تھا جیسے
گتھم گتھا ہو گئے ہوں۔

رکھ بابا بھورے شاہ کا گھنا جنگل دشمن کے کام آ رہا تھا۔ وہ اسی جنگل کی
آڑ میں آگے بڑھتا تھا۔ آخر اپنے توپ خانے نے اس جنگل پر گولہ باری کی
جس سے دشمن کے لیے یہ راستہ بھی بند ہو گیا۔ دشمن نے اب آگے بڑھنے

یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ تھوڑا تھوڑا آگے بڑھتا اور اپنچ اپنچ رینگ کر ذرا
ذرا سے علاقے پر قابض ہوتا جاتا تھا۔ یہ چال آرمرڈ ڈویژن کے لیے بزدلانہ
تصور کی جاتی ہے جس کے پاس چھ سات سَو ٹینک ہوں، وہ بکتر بند جنگ کی چالوں
سے اور پوری دلیری سے حملہ کیا کرتا ہے لیکن جنرل راجندر سنگھ کے پاس اب
اس کے سوا کوئی چال نہیں رہ گئی تھی کہ وہ مکر و فریب سے آگے بڑھے اور
اندھا دھند طاقت جھونکتا چلا جائے۔ اس کے آپریشن آرڈر کے مطابق اس کا
ارادہ یہ تھا کہ چونڈہ کو گھیرے میں لے کر عقب سے ہمارے دفاع کو ختم کیا جائے۔
یہ کام موٹر بریگیڈ کو دیا گیا تھا جسے کالے والی کے راستے سے چونڈہ پر قبضہ کرنا
تھا۔ آرمرڈ ڈویژن کے ایک ٹینک بریگیڈ کو چونڈہ بدیانہ اور چونڈہ پسرور کی
سڑکوں پر قبضہ کرنا تھا تاکہ ہماری سپلائی کاٹی جا سکے۔ ہڈسن ہارس (ٹینک
رجمنٹ) کو فتح پور پر اور ایک سکواڈرن کو مُتر پر قبضہ کرنا تھا۔ جنرل چوہدری
کی سولھویں کیولری نئے ٹینکوں سے بھرپور وجود میں آ گئی تھی، اسے بدیانہ پر
قابض ہونا تھا۔ اس طرح بھارتی لشکر کو چونڈہ کو مستحکم اڈہ بنانا تھا۔ لیکن کرنل
(اب بریگیڈیئر) وجاہت حسین کی کمان میں بدیانہ میں محفوظہ TASK FORCE
کے جو ٹینک تھے، انہوں نے پہلو سے تابڑ توڑ ضربیں لگا کر دشمن کی کوئی سکیم
کامیاب نہ ہونے دی۔

دشمن طاقت کے نشے میں اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ اسے اتنا بھی نظر نہ
آتا تھا کہ ہم کہاں اور وہ کہاں ہیں۔ دیکھا گیا کہ دشمن کی انفنٹری کی تقریباً
پچاس گاڑیاں بھلورا کی طرف سے چلی آ رہی تھیں۔ وہ کالے والی کے
قریب رُکیں اور ان میں سے بھارتی سُورمے اس طرح اطمینان سے اترنے
لگے جیسے پکنک پر آئے ہوں۔ ہمارے توپخانے کے ایک او پی نے ان
پر ایئر برسٹ (ہوا میں پھٹنے والے گولے) فائر کرائے۔ ان میں صرف
چار یا پانچ سپاہی بھاگ کر نکلتے ہوئے دیکھے گئے، باقی وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔

ان کی لاشیں فائر بندی تک وہیں پڑی گلتی سڑتی رہیں۔

پچھلے پہر بھارتیوں کی ایک انفنٹری بٹالین نے چونڈہ کے مورچوں پر دائیں پہلو سے حملہ کیا۔ وہاں ۲ پنجاب رجمنٹ تھی۔ ہمارے جوانوں نے فائر روک لیا اور مورچوں میں دبک گئے۔ بھارتی بٹالین بڑے اطمینان سے بڑھی چلی آئی۔ ان کے ساتھ ٹینک بھی تھے۔ جب وہ ہمارے مورچوں کے قریب آگئے تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ انہیں پیش قدمی تو بھول گئی اور پسپائی بھی محال ہو گئی۔

۱۵ ستمبر کے خونریز معرکے سے آگے کی بات سنانے سے پہلے میں ایک دو مثالی کارنامے بیان کر کے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ پیادہ جوانوں نے کس طرح ٹینکوں کا مقابلہ کیا۔ کارنامے صرف یہ دو ہی نہیں، سینکڑوں جوانوں نے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ کوہاٹ کا رہنے والا سپاہی سردار حسین شہید ایک پیادہ بٹالین میں تھا۔ اس کی کمپنی (سی کمپنی) کو سحر کے دھندلکے میں الہڑ ریلوے سٹیشن سے آگے جا کر پوزیشن لینے کا حکم ملا۔ دشمن کا ایک ٹینک قریب ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ اس نے مشین گن فائر کرنی شروع کر دی جس سے سی کمپنی کے سات جوان شہید اور نو زخمی ہو گئے۔ ایک سنچورین ٹینک ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر حرکت کرتا نظر آیا۔

ایسے نازک وقت سپاہی سردار حسین میدان میں کسی کے حکم کے بغیر کود پڑا۔ اس کے پاس آر آر گن تھی جو کھلی جیپ پر نصب تھی۔ وہ جیپ کو کھلے میدان میں ٹینک کے دو سو گز کے فاصلے پر لے آیا اور ایک گولے سے دشمن کے اس سنچورین ٹینک کو تباہ کر دیا۔ ابھی سحر کا دھندلکا چھٹا نہیں تھا اس لیے آر آر کے شعلے نے گن کی نشاندہی کر دی۔ سردار حسین پر کئی گولے بیک وقت فائر ہوئے جس سے اس کا ایک ساتھی شہید اور سردار حسین زخمی ہو گیا۔ زخموں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ گولے کدھر سے

آتے ہیں۔ اسے دھندلکے میں دشمن کے چار ٹینک نظر آئے۔ اس نے ایک اور گولہ فائر کیا جس سے دشمن کا ایک ٹینک تباہ ہو گیا مگر باقی تین ٹینکوں کے گولوں نے سردار حسین کی جیپ کو نشانہ بنا لیا اور سردار حسین کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔

اسی وقت کوہاٹ کا ہی رہنے والا سپاہی محمد حسین اپنے ساتھیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کھلے میدان میں آ گیا۔ اس کے پاس بھی آر آر گن تھی۔ اس نے تینوں ٹینکوں کو آمنے سامنے کی جھڑپ میں اس قدر پھرتی سے تباہ کر دیا کہ دشمن کا کوئی بھی گولہ اس کی جیپ پر نہ لگ سکا۔

یہ انسانوں اور ٹینکوں کا معرکہ تھا۔ چونڈہ کے میدان میں پاک فوج کے گوشت پوست کے انسان بالکل اسی طرح لوہے کے آگ اگلتے قلعوں سے ٹکرا گئے تھے۔

۱۶ ستمبر کا دن پاکستان کے لیے ایک خطرناک دن تھا۔ ملک و ملت کی آبرو انہی جانبازوں کے ہاتھ تھی جو چونڈہ کے میدان میں لڑ اور کٹ رہے تھے۔ دشمن تو نفری کی افراط کی وجہ سے اپنے سپاہیوں کو آرام دے لیتا تھا مگر ہمارے وہی جوان لڑ رہے تھے جو پہلے روز میدان میں اترے تھے۔ انہیں ایک لمحے کا آرام نہ ملا، لوٹ اتارنے کی مہلت نہ ملی۔ وہ زخمی اور شہید ہوتے چلے جا رہے تھے اور موت کے خلاف سینہ سپر تھے۔ ۱۶ ستمبر کی صبح دشمن نئے ٹینکوں اور تازہ دم پلٹنوں سے فیصلہ کن معرکہ لڑنے کے لیے آیا۔ صبح کے وقت اس کے توپخانے نے گولوں کا مینہ برسانا شروع کر دیا۔ ہمارے مورچوں پر لوہے کے لال انگارہ ٹکڑے اور پتھر اڑ رہے تھے۔ دھماکوں سے دل اور اعصاب لرز رہے تھے۔ دھرتی کا سینہ چاک ہو رہا تھا۔ بھارتی جیسے وہ سارا ہی گولہ بارود چونڈے کے دفاعی مورچوں پر پھونک ڈالنا چاہتے تھے جو انہوں نے چین کے حملے کا ڈھونگ رچا کر امریکہ اور برطانیہ سے جمع کیا

تھا۔ انسانی اعصاب اس قدر گولہ باری کے دھماکوں کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے لیکن ہمارے جوان جانتے تھے کہ دشمن کا فیصلہ کُن حملہ آرہا ہے۔ اگر دل وجگر قابو سے نکل گئے تو پاکستان کی آبرو ہندو کے ٹینکوں تلے روندی جائے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے افسر اور جوان روحانی قوت کے زور پر ڈٹے ہوتے تھے ورنہ ڈاکٹری نقطۂ نگاہ سے یہ انسان اب ایک آدھ منٹ کی شقت کے قابل نہیں تھے۔

گولہ باری کے سائے میں دشمن نے دو طرفی حملہ کیا۔ ایک حملہ الھڑ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اور دُوسرا اسی طرف سے جبیوراں اور بسوراں سے بوتر ڈوگرانڈی کی طرف۔ دشمن گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبیوراں کی سمت والا حملہ زیادہ طاقتور تھا۔ اپنی فرنٹیر فورس کی ایک پوزیشن کچلی گئی اور کئی ایک ٹینک تباہ ہو گئے۔ ایک حملہ چونڈہ اور بدیانہ کے علاقے پر آیا۔ ان حملوں کی شدت اور طاقت اتنی تھی کہ اسے روکنے کے لیے کم از کم اتنی ہی طاقت درکار تھی لیکن اپنے تھوڑے سے ٹینکوں نے اس ہلے کو روکا اور انتہائی خونریز معرکہ لڑا۔ خطرہ تو یہ تھا کہ ساری ہی دفاعی لائن کچلی جائے گی لیکن صرف جبیوراں اور بوتر ڈوگرانڈی ہاتھ سے نکلا۔ یہ قربانی دینی ہی تھی۔ چونڈہ بدیانہ روڈ بھی کٹ گئی۔ رابطہ لائن L OF C پسرور سے کر لی گئی۔ ریلوے لائن سے بھی دشمن آگے نکل آیا۔ ٹاسک فورس شام کے وقت اسے روکنے میں کامیاب ہو گئی۔

حملے کی کیفیت یہ تھی کہ دشمن کے ٹینک موجوں WAVES کی صورت میں آتے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسری موج آتی تھی۔ یہ آگ اور لوہے کا طوفان تھا۔ جنرل ابرار حسین نے دشمن کے کسی ہیڈکوارٹر کا ایک وائرلیس پیغام سنا جس میں ایک ٹینک رجمنٹ کے کمانڈر کو کہا جا رہا تھا۔ "چونڈہ پسرور روڈ کے پانچویں سنگ میل تک پہنچو۔ تمہیں مہاویر چکر وہاں پڑا ہوا ملے گا۔" اس بڑے تمغے کے لالچ میں دشمن کے ٹینک سڑک تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہے

تھے۔ اس کوشش میں ۷ ، اپونا ہارس کا کمانڈر کرنل تارا پور مارا گیا۔ وہ کھُلی جیپ میں تھا۔ جنرل ابرار حسین کہتے ہیں کہ وہ فی الواقع بہادر آدمی تھا۔ یہ ہمارے افسروں اور جوانوں کا کمال تھا کہ انہوں نے تارا پور کی کوئی چال کامیاب نہ ہونے دی۔ دشمن چونڈہ کو گھیرے میں لینا چاہتا تھا۔ اس نے بدیانہ پر اس لیے حملہ کیا تھا کہ اُدھر سے چونڈہ کو مدد نہ مل سکے۔ صورتِ حال اس قدر نازک ہو گئی کہ جنرل ابرار حسین کو یہ حکم دینا پڑا۔ " آخری جوان اور آخری گولی تک لڑو۔ چونڈہ ہاتھ سے نہ جائے۔" دشمن اب پہلوؤں سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گرد و غبار سے ٹینکوں کی سکرینوں پر سوائے ٹینکوں کی گنوں کی چمک کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ٹینک گڈمڈ ہو گئے تھے۔ نظری ملاپ ٹوٹ گئے۔ ٹروپ کمانڈر اپنی اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔ پیادہ جوان کچلے جا رہے تھے۔ گوشت پوست کے انسان دشمن کے ٹینکوں کے قریب جا جا کر راکٹ لانچر فائر کر رہے تھے۔ ساتھی کو ساتھی کی خبر نہیں تھی۔ دونوں فوجیں جم کر لڑ رہی تھیں اور پورے غیض و غضب سے لڑ رہی تھیں۔

انسان ٹینکوں سے کس طرح لڑے؟ یہ ایک بڑی لمبی داستان ہے۔ میں صرف ایک انسان کا کارنامہ سُنا دیتا ہوں۔ پاک فوج کا ہر ایک جوان اسی جذبے سے لڑ رہا تھا۔ ہماری ایک ٹینک رجمنٹ کے لانس دفعدار غضنفر علی کا ٹینک ہٹ ہو گیا۔ غضنفر اپنے کریو کے ساتھ ٹینک سے نکل آیا۔ لیکن اس کا توپچی سجاول خان زخمی ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ گولہ باری اتنی زیادہ تھی کہ زمین کا کوئی اینچ محفوظ نہ تھا۔ سجاول خان نے لانس دفعدار غضنفر علی کو پکارا۔ غضنفر کے لیے سجاول تک پہنچنا آسان نہ تھا پھر بھی وہ گولوں، گولیوں اور لوہے کے ٹکڑوں کی بارش میں رینگ رینگ کر سجاول تک پہنچا۔ اُس نے گرد و غبار میں دیکھا کہ دشمن کا ایک سینچورین ٹینک قریب ہی کھڑا تھا اور بالکل ساکن تھا۔ غضنفر نے سجاول کو اٹھا کر دشمن کے ٹینک میں ڈالا اور خود کنٹرول سنبھال لیے۔ بھارتی اچھے بھلے ٹینک کو چھوڑ کر بھاگ

گئے تھے۔ غضنفر ٹینک کو اپنے مورچوں میں لے آیا اور اپنے زخمی توپچی سجاول
کو بھی۔ جب ٹینک کو دیکھا گیا تو یہ بھارت کی مشہور ٹینک رجمنٹ، "پونا ہارس"
کے کمانڈنگ آفیسر کرنل تارا پور کا نکلا۔ (کرنل تارا پور کھلی جیپ میں مارا گیا تھا)
نائب رسالدار محمد خالق شہید کے متعلق ۲ پنجاب رجمنٹ کے سیکنڈ اِن
کمانڈ میجر (اب کرنل) انصاری نے مجھے میدانِ جنگ میں ملاقات کے دوران
بتایا تھا کہ جس غیض و غضب سے ہمارے ٹینک سوار لڑے اس کی ایک مثال
نائب رسالدار خالق شہید اور اس کے کریو کی ہے۔ کرنل انصاری عینی شاہد
ہیں۔ چونڈہ پر دشمن کا اتنا دباؤ تھا کہ قدم جمانا محال ہو گیا تھا۔ کرنل انصاری کی
بٹالین ٹینکوں سے لڑ رہی تھی۔ دشمن کے چھ ٹینک آگ اگلتے بڑھے آ رہے تھے۔
اچانک نائب رسالدار خالق نے اپنا ٹینک پوزیشن سے نکالا۔ وائرلیس سیٹ پر
اس کی آواز سنائی دی۔ اس نے ہندو کو ننگی گالی دی اور کہا ـــ "کافر یہاں سے
آگے نہیں آتے گا" ـــ اس نے قریبی رینج سے یکے بعد دیگرے ٹینک کی
بڑی گن کے چار گولے فائر کیے اور چند سیکنڈ میں دشمن کے چار ٹینک پھٹ
کر شعلے بن گئے لیکن نائب رسالدار خالق اور اس کے کریو کو ان چار ٹینکوں
کے بدلے زندگی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔

ایسی شجاعت کی مثالیں کم نہیں۔ جنرل ابرار حسین کہتے ہیں کہ بالائی کمان
کی کرسی پر بیٹھ کر جنگ کے نہایت کارگر پلان بنا لیے جاتے ہیں لیکن میدانِ
جنگ میں ان پلانوں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار افسروں اور جوانوں کی بہادری
یا بزدلی پر ہوتا ہے۔ میرے پلان کو ان جوانوں کے جذبۂ ایثار نے کامیابی
عطا کی۔

یہ خونریز معرکہ شام کا اندھیرا پھیل جانے تک جاری رہا۔ ٹینک اندھیرے
میں بھی لڑتے رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دشمن نے ٹینکوں کو اندھیرے میں بھی
لڑایا۔ دشمن کا عزم نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ بے تحاشہ قیمت دے کر پسرور کی طرف
بڑھنا چاہتا تھا۔ اس لیے طاقت اور پختہ عزم کے زور پر اس

BREAK THROUGH کو بہت حد تک ممکن بنا لیا تھا۔ یہ ایک
نازک گھڑی تھی۔ پسرور کی طرف والے اپنے توپخانے کی کیفیت یہ ہو گئی
تھی کہ توپوں اور دشمن کے ٹینکوں کے درمیان اپنا کوئی پیادہ یا بکتر بند دستہ
نہیں رہ گیا تھا۔ توپوں اور ٹینکوں کی براہِ راست جنگ توپوں کے لیے بے حد
خطرناک ہوتی ہے۔ ٹینک تو پلک جھپکتے پینترا بدل سکتا ہے لیکن توپ کو اتنی
سرعت سے متحرک نہیں کیا جا سکتا۔ توپوں اور ٹینکوں کے براہِ راست معرکے کو
توپخانے کی زبان میں OPEN SITE سے لڑنا کہتے ہیں جس سے توپخانے
والے ہمیشہ گریز کیا کرتے ہیں مگر یہاں یہی ایک صورت رہ گئی تھی۔ توپخانے
کے "اوپی" اور توپچی اس قدر تیز ثابت ہوئے کہ انہوں نے ٹینکوں پر ٹھکانے کی
گولہ باری شروع کر دی۔ ٹینکوں کے گولے سیدھے توپوں کی پوزیشنوں پر آ رہے
تھے۔ وائرلیس پر دشمن کا جو واویلا سنا گیا اس سے توپچیوں کے حوصلے بڑھ
گئے۔ دشمن بری طرح تباہ ہو رہا تھا اور بھاگ رہا تھا۔ توپخانے کے کمانڈر
بریگیڈیئر امجد چوہدری کہتے ہیں کہ یہاں تک پیغام سنا گیا کہ کوئی بھارتی افسر
کسی دوسرے افسر سے کہہ رہا تھا۔

"ان بزدلوں سے کہو کہ رام کے نام پر تھوڑی دیر اور ڈٹے رہیں،
اس طرح نہ بھاگیں"۔

ہمارے توپخانے نے دشمن کے توپخانے کو بھی برباد کرنا شروع کر دیا۔
ان کی کوئی بیٹری جہاں نئی پوزیشن لیتی تھی ہمارے ہوائی اور زمینی اوپی
اس پر گولہ باری کراتے تھے۔ اس طرح دشمن کے بکتر بند اور پیادہ دستے
توپخانے کے امدادی فائر سے محروم رہے۔

یہ کہتے چلے جانا بھی غلط ہے کہ دشمن بھاگ اٹھا، دشمن بھاگ اٹھا۔
جنرل ابرار حسین کا بیان ہے کہ کم از کم ہم لوگ جو دشمن کے خلاف لڑے
ہیں یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ دشمن بزدل تھا۔ وہ پختہ عزم لے کے آیا تھا اور

اس نے "آپریشن نیپال" کی کامیابی کی خاطر ہوشربا قیمت ادا کرنے سے گریز نہ کیا۔ اس کے حملہ آور دستے اگلی موج کی لاشوں پر پیشقدمی کرتے اور پورے جوش سے "جے ہند" کے نعرے لگاتے تھے۔ یہ تو ہمارے افسروں اور جوانوں کی حب الوطنی کی دیوانگی تھی اور ان کے دلوں میں لاکھوں مسلمان بچوں کے قاتل اور مسلمان بہو بیٹیوں کی عصمتوں کے لٹیرے کے خلاف اتنی نفرت تھی کہ وہ فراموش کر بیٹھے تھے کہ دشمن کی طاقت کتنی زیادہ اور ہماری طاقت کتنی کم ہے۔ اس جذبے کے علاوہ یہ پاک فوج کی فنی تربیت کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے کم سے کم قوت سے زیادہ سے زیادہ قوت کو کمزور کیا۔

جنرل ابرار حسین آگے جاجا کر پورے محاذ کا جائزہ لیتے اور ہدایات دیتے رہے۔ انہوں نے تمام افسروں کو حکم دے رکھا تھا کہ چونڈہ ہاتھ سے نہ جائے۔ ان کی سکیم کے مطابق دشمن بار بار انہیں اپنا پہلو دے دیتا تھا اور خوب پٹتا تھا۔

رات کے وقت ٹینکوں کا معرکہ سرد پڑ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دشمن نے کچھ زمین حاصل کر لی لیکن اسے بہت زیادہ قیمت دینی پڑی۔ اس نے جو زمین حاصل کر لی تھی، وہ اس کے لیے نقصان دہ تھی کیونکہ اس کے پہلو ہماری زد میں تھے۔ اس کی دو بہترین ٹینک رجمنٹیں ہڈسن ہارس اور ۱۷ پونا ہارس تقریباً تمام کی تمام ختم ہو گئیں۔ انفنٹری کا نقصان شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ ہر سو لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ چونڈہ کے محوری دفاع کو بچا تو لیا گیا لیکن بہت بڑی قربانی دے کر۔ ابھی خطرہ بدستور موجود تھا۔

رات کے وقت دشمن کے وائرلیس پیغامات سے، قیدیوں سے اور دیگر ذرائع سے جنرل ابرار حسین کو پتہ چل گیا کہ دشمن اس قدر نقصان اٹھا چکا ہے کہ وہ "ری گروپنگ" کر رہا ہے۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ تین تین رجمنٹوں کے بچے کھچے ٹینکوں اور جوانوں کو ملا کر اس کی ایک رجمنٹ پوری نہیں ہو رہی تھی۔ کمک اور سپلائی کو ہمارے شاہبازوں نے اس قدر تباہ کر دیا تھا کہ دشمن

کو اب پیچھے سے مدد کم ہی مل رہی تھی۔ جنگی قیدیوں نے بتایا کہ وہ بھوکے ہیں۔ انہیں راشن اور ایمونیشن نہیں پہنچ رہا۔ شاہبازوں نے اس کا پلوں وغیرہ کا سامان جو تین چار سو گاڑیوں پر آیا تھا، کلی طور پر تباہ کر دیا تھا۔

دشمن کی رات کی اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے جنرل ابرار حسین نے اپنے دستوں کو حکم دیا کہ دشمن کو سنبھلنے نہ دو۔ جو کچھ پاس پلے رہ گیا ہے، اسی سے جوابی حملہ کر دو۔ دشمن ۱۷ ستمبر کے روز بھی "ری گروپنگ" میں مصروف رہا اور اپنے اوپر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لیے کہیں کہیں حملے کرتا رہا۔ ان حملوں کی صورت پٹے ہوئے پہلوان کی بوکھلاہٹ کی سی تھی۔

۱۸ ستمبر کی صبح ہمارے ایک بکتر بند بریگیڈ نے بریگیڈیئر ریاض الکریم کی قیادت میں دشمن پر حملے شروع کر دیے۔ دوسری طرف جنرل عبدالعلی نے حملہ کیا۔ ان حملوں کے دوران دشمن کے نقصان کا پتہ چلا۔ لاشوں پر لاشیں پڑی تھیں۔ جگہ جگہ ٹینک اور گاڑیاں جل رہی تھیں۔ ہمارے حملہ آور دستے دشمن کی لاشوں پر پیشقدمی کر رہے تھے اور یہ لاشیں ان کے تھکے ماندے اعصاب میں نئی زندگی اور نیا حوصلہ پھونک رہی تھیں۔ دشمن نے مقابلہ کیا مگر وہ "ری گروپنگ" کے دشوار مرحلے میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے اس حملے کو طیاروں سے روکنے کی کوشش کی لیکن حملے کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ طیاروں سے رک نہ سکا۔ اپنے توپخانے کی گولہ باری اس قدر صحیح تھی کہ دشمن کو بھرپور مزاحمت کی مہلت اور فرصت نہ مل سکی۔ یہ حملے جذبے کے زور پر کیے گئے تھے۔ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے خطرناک حد تک نیچے آ آ کر دشمن کے ٹینکوں کو تباہ کیا۔ ان دونوں حملوں کے درمیان دشمن کو پیس ڈالا گیا اور اس سے جسوراں اور سدریکے کے اہم مقامات واپس لے لیے گئے۔

دشمن نے ہمارے جوابی حملے کو ناکام کرنے کے لیے چونڈہ کے مشرق سے ۲ پنجاب رجمنٹ پر انفنٹری سے حملہ کر دیا۔ اس انفنٹری کو ہمارے توپخانے نے تباہ کر دیا۔ دشمن نے اب اپنے لشکر کو چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں تقسیم

کر دیا تھا جو جگہ جگہ حملے کر رہی تھیں مگر دشمن کو یہ چال بہت مہنگی پڑی۔
شلاؔ نیلاؔ کے مقام پر دشمن کی دو انفنٹری کمپنیاں حملے کے لیے آئیں۔ ہمارے
کمپنی کمانڈر نے ایک بھی گولی فائر نہ کی بلکہ گھات میں بیٹھے رہے۔ دشمن بہت
قریب آ گیا تو اس پر تین اطراف سے آگ برسنے لگی۔ ان میں سے وہی
زندہ رہے جنہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

دوپہر کے وقت اطلاع ملی کہ دشمن سے جبیوراں لے لیا گیا ہے۔ شام
سات بجے کے قریب قبضے کو مستحکم کرنے کے لیے فرنٹیئر فورس کی دو کمپنیوں
کو بھیجا گیا۔ اُدھر سے دشمن کی انفنٹری، ٹینکوں کی سپورٹ کے ساتھ جبیوراں
واپس لینے کے لیے چلی آ رہی تھی۔ ہماری انفنٹری کے ان مٹھی بھر جوانوں نے
خوب قدم جمائے۔ دشمن اس قدر پختہ عزم لے کے آیا تھا کہ اس کی انفنٹری
ہمارے مورچوں تک آ گئی۔ ہمارے جوان دست بدست جنگ کے لیے مورچوں
سے نکل آئے۔ پاکستانی جوانوں کو پہلی بار ہندو اتنی قریب آ کر ملا تھا۔ وہ
اسی ملاقات کے منتظر تھے۔ یہاں مجھے بلوچ رجمنٹ کا ایک لانس نائک یاد
آتا ہے جس نے کہا تھا کہ ٹینکوں کی جنگ کوئی بہادری نہیں ہوتی، ہم تو
ہندو کے ساتھ دست بدست جنگ لڑنے کو بے تاب تھے۔ ہماری
سنگینیں تڑپ رہی تھیں۔ اپنے جوانوں کو یہ موقع مل گیا اور انہوں نے
خوب دل کا غبار نکالا۔ جانے والی میں بھی ایسا ہی مقابلہ ہوا۔ اس گتھم گتھا
جنگ میں دشمن کے ٹینک اپنی کٹتی ہوئی انفنٹری کی کوئی مدد نہ کر سکے۔
دشمن جبیوراں کے اردگرد مورچہ بند ہو گیا۔ اس صورتِ حال میں اپنے
توپخانے نے وہ مدد کی کہ دشمن جم نہ سکا۔

۱۸/۱۹ ستمبر کی رات دشمن نے آخری بازی لگائی۔ دن کے وقت وہ
اتنے ٹینک تباہ کرا چکا تھا کہ اب اس میں دن کے بکتر بند حملے کی ہمت
نہیں رہی تھی۔ پیچھے سے کمک کے راستے ہماری بڑی توپوں اور شاہبازوں

نے بند کر دیے تھے۔ اب دشمن نے حملوں کا یہ انداز اختیار کیا کہ رات کے
وقت انفنٹری کو آگے کر کے حملہ کیا اور ٹینکوں کو پیچھے رکھا تاکہ انفنٹری جو
علاقہ لے لے وہاں ٹینک جا کر کھلبلی مچا دیں اور علاقے پر قابض ہو جائیں۔
دشمن کا یہ شدید حملہ چونڈہ اور بدیانہ پر تھا۔ ایسا ہی دوسرا حملہ رات کے ایک بجے
جبیوراں پر آیا۔ اس حملے میں اپنے مورچوں کو پیچھے ہٹانا پڑا کیونکہ نفری بہت
تھوڑی اور دن بھر کی دست بدست جنگ کی تھکی ہوئی تھی، لیکن دوسری یونٹوں
نے آگے بڑھ کر اس شگاف کو بند کر دیا۔ دشمن چونڈہ ریلوے سٹیشن تک پہنچ گیا۔
رات کی تاریکی میں مختلف پوزیشنوں سے جو رپورٹیں آ رہی تھیں وہ
جنرل ابرار حسین کے لیے واضح نہیں تھیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ دشمن کہاں
اور ہم کہاں ہیں۔ ہمارے مورچے نئے چاند کی شکل میں تھے یعنی تقریباً نیم
دائرے کی شکل میں۔ دشمن اس نیم دائرے میں آ کر آگ اور خون کا کھیل کھیل
رہا تھا۔ جنگ کی صورتِ حال نازک اور خطرناک تھی۔ جنرل ابرار حسین نے جنرل
عبدالعلی سے کہا کہ جہاں کہیں بھی ہو چونڈہ سے مورچے نہ اکھڑیں۔ جنرل علی
نے انہیں یقین دلایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ آج رات دشمن کچھ حاصل کر کے ہی
رہے گا لیکن وہ چونڈہ نہیں ہو گا۔

جنرل ابرار حسین نے بریگیڈیئر امجد خان چوہدری سے کہا کہ اس نیم
دائرے میں شدید گولہ باری کرائیں۔ بریگیڈیئر چوہدری نے کہا کہ معرکے کی
صورت گڈمڈ ہے، اپنے دستے بھی زد میں آ جائیں گے۔ جنرل ابرار حسین
نے جواب دیا کہ ملک کو بچانے کی خاطر جوان قربان ہونے کے لیے تیار ہیں،
ہمیں یہ قربانی دینی ہی ہو گی۔ بریگیڈیئر چوہدری نے اللہ کا نام لے کر گولہ باری
کرا دی اور اللہ نے کرم کیا کہ اپنے جوان اپنے گولوں سے بچے رہے اور
دشمن تباہ ہونے لگا۔ اس تباہی کے باوجود دشمن اُس رات بہت بڑی قربانی
دینے پر آمادہ تھا۔ وہ یونٹ پہ یونٹ اس جہنم میں جھونکتا چلا گیا۔ رات کے وقت
پاک فضائیہ کے بمبار طیارے بلائے گئے۔ ان کے لیے بھی ٹارگیٹ واضح نہیں

تھے۔ بہرحال انہوں نے بھی خطرہ مول لے کر بمباری کی جس سے دشمن کے ٹینک تباہ ہو گئے۔

دشمن اس قدر نفری مروا چکا تھا کہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس حملے کو جاری رکھ سکے گا لیکن صبح کی روشنی پھیلتے ہی اُس نے حملے میں جان ڈال دی۔ نیم دائرے کا میدان ہندوؤں اور سکھوں کی لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ان لاشوں کی تعداد دو ہزار سے کم نہیں تھی۔ دشمن کی پچھلی صفوں میں جو تباہی مچی وہ دیکھی نہ جا سکی۔ قیدیوں نے بتایا کہ شاید ہی کوئی زندہ ہو۔ لیکن دشمن ابھی زندہ تھا۔ اُس نے فتح پور الہڑ کی طرف سے ٹینکوں کی یلغار کر دی تھی۔ اپنی دو ٹینک رجمنٹوں، ۱۹ لانسرز اور گائیڈز کیولری نے ان پر پہلو سے ایسا ہلہ بولا کہ دشمن کے ٹینک پسپا بھی نہ ہو سکے۔ انہوں نے اپنے پہلو ہمارے ٹینکوں کے سامنے کر دیے تھے۔ اس کے بہت سے ٹینک جو شاید دو رجمنٹیں تھیں، چونڈہ اور جسوراں کے درمیان ہمارے پھندے میں آ گئے۔ گھیرا مکمل تھا۔ انہیں گھیرے سے نکالنے کے لیے انڈین ایئر فورس نے تابڑ توڑ حملے کیے۔

جنرل راجندر سنگھ کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ہوائی حملوں سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یا تو کچھ کامیابی حاصل کی جائے جو اس کے لیے اب ناممکن تھی یا ان دونوں رجمنٹوں کو گھیرے سے نکالا جائے۔ یہ بھی اس کے لیے ناممکن تھا۔ پاک فضائیہ نے انڈین ایئر فورس کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ ہماری ۱۹ لانسرز نے جسوراں کے ارد گرد مورچہ بند دشمن پر یلغار کر دی۔ اُدھر سے جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کے بریگیڈ نے (جسے ظفروال سے بدیانہ بلا لیا گیا تھا) اپنی سمت سے دشمن کے اُن دستوں پر ہلہ بول دیا جو گھیرے میں آئے ہوئے ٹینکوں کو گھیرے سے نکالنے میں مدد دے سکتے تھے۔ دشمن نے ٹینکوں سے ان کا مقابلہ کیا۔ جنرل نیازی نے انہیں وہیں اُلجھائے رکھا۔ اُوپر سے اپنے توپخانے کی گولہ باری ہو رہی تھی۔ دشمن کی ان دونوں رجمنٹوں کو بھی چونڈہ ا

جسوراں کے درمیان ختم کر دیا گیا۔

دشمن نے الہڑ ریلوے سٹیشن کی طرف حملہ کیا۔ جنرل ابرار حسین نے پاک فضائیہ کو بلا لیا۔ اُدھر سے انڈین ایئر فورس بھی آ گئی۔ اب یہ میدان، میدانِ حشر بن گیا۔ زمین اور آسمان آگ اُگل رہے تھے۔ دشمن اپنی تباہی اور اپنے ہی خون سے پھسلتا آگے بڑھنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ آج وہ اپنا سب کچھ داؤ پہ لگائے چلا جا رہا تھا۔ اس نے پھر فتح پور اور الہڑ پر بھی حملہ کیا۔ وہ چونڈہ اور بدیانہ کے درمیان سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میدان میں بھی خونریز جنگ ہوئی جو شام تک جاری رہی۔ شام کے بعد الہڑ پر جوابی حملہ کر کے دشمن کو وہاں سے پسپا کر دیا گیا۔

رات بھر جنگ جاری رہی۔ سحر کے وقت دشمن کے ایک انفنٹری بریگیڈ نے "جے ہند" کا نعرہ لگایا اور چونڈہ کی سمت حملہ کیا۔ ہماری پچیسویں کیولری کے ٹینکوں نے اس بریگیڈ کو گھیرے میں لے کر چھوٹی بڑی گنوں کا فائر کھول دیا۔

نصف گھنٹے بعد دُور دُور تک میدان لاشوں سے بھر گیا۔ بھارتی سپاہی اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور بہت ایسے تھے جنہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قید میں آ گئے۔

۱۹ ستمبر کا دن پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم ترین دن ہے۔ اس روز بھارت کا فخر اور غرور چونڈہ کی مٹی میں مل گیا۔ اپنے آرمرڈ ڈویژن کو بھارت کے جنگ پسند حکمران اپنی آن اور اپنا فخر سمجھتے تھے اور اس قوت پر انہیں اس قدر بھروسہ تھا کہ جنرل چوہدری نے "آپریشن نیپال" کی کامیابی کا وقت صرف بہتر گھنٹے مقرر کیا تھا۔

برطانیہ کے مشہور جریدے "مرر" کا وقائع نگار بریان ہیچن فائر بندی کے وقت چونڈہ سیکٹر میں موجود تھا۔ وہ تین روز سے آخری معرکہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے الہڑ ریلوے سٹیشن کے قریب بھارتیوں کی تباہی کو اپنے جریدے میں ان

الفاظ میں بیان کیا ہے:

"فائر بندی ہوئے تین گھنٹے گزر گئے ہیں۔ میں ٹینکوں اور انسانوں کے قبرستان میں گھوم رہا ہوں۔ فضا میں گِدھ اُڑ رہے ہیں، ماحول اور فضا میں موت کا تعفن بسا ہوا ہے۔ میرے سامنے صرف تین میل کی وسعت میں بھارت کے پچیس جلے ہوئے سنچورین ٹینک پڑے ہیں۔ وہ مرے ہوئے بچھوؤں کی طرح دکھائی دے رہے ہیں جن کا زہر ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ ان ٹینکوں کو چلانے والے بھاگ نہیں سکے۔ وہ ان کے اندر جلے پڑے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان نے بھارت کو کس قدر فیصلہ کن شکست دی ہے۔ اس وقت تک پاک فوج کے جوان میرے سامنے تین سَو بھارتیوں کی لاشیں ایک گڑھے میں دفن کر چکے ہیں۔"

اس نامہ نگار کے آخری فقرے کو میں اسی کی زبان میں پیش کرتا ہوں وہ لکھتا ہے: HERE IS NO DOUBT THAT PAKISTAN IAMMERED HELL OUT OF INDIA'S RMOURED DIVISION

اُردو میں اس فقرے کا ترجمہ یہی کچھ ہو سکتا ہے "اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان نے بھارت کے آرمرڈ ڈویژن کا بھُرکس نکال دیا ہے۔"

۱۹ ستمبر کے بعد بھارتیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ دفاعی مورچے تیار کرنے لگے۔ ان پر دہشت طاری ہو چکی تھی۔ ان میں اب اتنی سی ہمت بھی نہیں تھی کہ آگے آ کر اپنی لاشوں کو ہی اُٹھا لے جاتے۔ ان ہزاروں لاشوں کو ہمارے جوانوں نے دبایا اور جلایا۔ ماحول کا یہ عالم تھا کہ درخت ٹنڈ منڈ کھڑے تھے۔ شاخیں اور پتے جل گئے تھے۔ گاؤں چھلنی ہو گئے تھے۔ زمین جھُلس گئی تھی۔ جدھر نظر جاتی تھی، بھارت کے ٹینک اور ٹرک جل رہے تھے۔ لاشوں پر گِدھوں اور کتوں نے ہلّہ بول دیا تھا۔ منظر ہیبت ناک تھا۔

چونڈہ کا گاؤں میدانِ جنگ کے درمیان اور دشمن کا سب سے بڑا نشانہ تھا

کی وجہ سے بہت تباہ ہوا۔ گاؤں کے کئی لوگ بر وقت نکل نہیں سکے تھے، وہ گاؤں میں ہی رہے۔ ان کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ وہ دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق ہمارے دستوں کو اطلاعیں دیتے رہتے تھے۔ بھارت کے جو جوان بھاگ کر گاؤں میں پناہ لیتے تھے، انہیں یا تو یہ دیہاتی پکڑ لاتے تھے یا وہیں مار ڈالتے تھے۔ یہاں تک بھی ہوا کہ بھارت کا کوئی ٹینک گاؤں میں جا چھپا تھا تو چونڈہ کے لوگ اس کے تمام آدمیوں کو ختم کر دیتے تھے۔

دیہاتیوں کے جذبے کو واضح کرنے کے لیے میں چونڈہ کی ایک بڑھیا کا ذکر کروں گا۔ ۲ پنجاب رجمنٹ کے میجر (اب کرنل) انصاری نے بتایا کہ ان کا مورچہ چونڈہ گاؤں کے ساتھ تھا۔ سیکنڈ اِن کمانڈ ہونے کی وجہ سے انہیں بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔ ایک روز قریب کے ایک مکان سے ایک بوڑھی عورت نکلی۔ اس کے ہاتھ میں دو روٹیاں تھیں جن پر اچار رکھا تھا۔ وہ کرنل انصاری کے پاس آئی اور کہا —— "بیٹا! تین روز سے دیکھ رہی ہوں کہ تم ہر طرف بھاگتے دوڑتے پھر رہے ہو، میں نے تمہیں کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ یہ لو، روٹی کھالو" —— کرنل انصاری نے بڑھیا کو بصد احترام تسلی دی کہ انہیں روٹی مل جاتی ہے۔ بڑھیا نے کہا —— "تم جانے کہاں کے رہنے والے ہو بیٹا، لیکن میرے دروازے پر پہرہ دے رہے ہو۔ میں جانتی ہوں تمہارے سب آدمی بھوکے ہیں۔ پر میں اتنی روٹیاں کہاں سے لاؤں۔ یہ دو روٹیاں کل کی تمہارے لیے رکھی ہوئی تھیں۔"

جنرل ابرار حسین نے کہا کہ دشمن کی کمر اس حد تک توڑی جا چکی تھی کہ اگر ہم جوابی حملہ کرتے تو اسے پٹھانکوٹ تک دھکیل لے جاتے لیکن فائر بندی نے اسے بچا لیا۔

آج چونڈہ کے میدان میں پیڑ پودے پھر ہرے ہو کر شانِ بے نیازی سے جھوم رہے ہیں۔ فصل لہلہا رہے ہیں۔ دیہات آباد ہو گئے ہیں۔ چہل پہل اور ہما ہمی کبھی کی عود کر آئی ہے۔ دیہات کی محفلوں میں پھر سے رونق آگئی ہے

لیکن اس رونق کو نئی آب و تاب دینے کے لیے پاک فوج کے جانے کتنے جیالوں نے اپنے گھر اجاڑ دیئے ہیں۔ اپنی بیویوں کے سہاگ ویران کر کے انھوں نے چونڈہ کے دیہات کے گھر آباد کیے ہیں۔ ان میں بہت سے جانباز ایسے تھے جن کی لاشیں نہیں مل سکیں، ٹینکوں تلے آ کر چونڈہ کی مٹی میں مل گئیں۔ ان کے خون سے جو ہریالی پھوٹتی ہے اس کا نکھار نرالا ہی ہوتا ہے۔ وہ دُور دراز دیہات کے رہنے والے گمنام سے دیہاتی تاریخِ پاکستان کے عظیم انسان بن گئے ہیں۔ ان کا آج کوئی نشان نہیں رہا، کوئی نقش نہیں رہا مگر وہ چونڈہ کی مٹی میں زندہ ہیں۔ وہ سیالکوٹ کے سرحدی دیہات کی بہو بیٹیوں کی مسکراہٹوں میں زندہ ہیں۔ وہ ہمارے سینوں میں زندہ ہیں اور تا ابد زندہ رہیں گے۔

بھارتی ہوا باز اور نہتّے مسافر

- اُدھر بھارت کی مسافر گاڑی تھی اور پاک فضائیہ کے شاہباز۔ اِدھر پاکستان کی مسافر گاڑی تھی اور بھارتی ہوا باز۔ بھارت کی گاڑی بچ گئی۔ پاکستان کی گاڑی خون سے بھر گئی۔
- ۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ کے روز نارووال جانے والی مسافر گاڑی پر بھارتی ہوا بازوں کے حملے کی مکمل تفصیلات!

۲۷ستمبر ۱۹۶۵ء کا "نیوز ویک" جو امریکہ کا بین الاقوامی شہرت یافتہ ہفت روزہ جریدہ ہے، دیکھیے تو اس میں جنگِ ستمبر کی ایک خبر نظر آئے گی۔ جو اس جریدے کے وقائع نگار، فرینک میلویلے نے محاذوں کو اپنی آنکھوں دیکھ کر لکھی تھی
اس طویل رپورٹ میں وہ لکھتا ہے:

"پاکستان کی کم تعداد افواج انڈین آرمی کے کئی حملے ناکام بنا چکی ہیں ـــ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ بھارتیوں نے پاکستانیوں سے آمنے سامنے کی جو ٹکر لی ہے۔ وہ ان کے لیے مہنگی ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ بھارتیوں نے اب شہریوں پر بمباری شروع کر دی ہے"

اور "انڈونیشین ہیرلڈ" ۱۱ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

"حملے کی ناکامی، شکست اور عظیم نقصان پر پردہ ڈالنے کے لیے ہندوستانی افواج انتہائی ظالمانہ اور غیر انسانی طریقے اختیار کر رہی ہیں ـــ"

پاکستان کے شہریوں پر بھارتی ہوابازوں کی بمباری اور بھارتی افواج کے ظالمانہ، غیر انسانی اور غیر جنگجویانہ طریقوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ بھارتی ہوابازوں نے حملے کی ابتدا ہی دھونکل سٹیشن پر کھڑی مسافر گاڑی پر بمباری اور مشین گن فائرنگ سے کی تھی۔ اگر بھارتی ہوا باز کسی ایسی مال گاڑی پر حملہ کرتے جس میں فوجی اور جنگی سامان نہ بھی ہوتا تو ان کی یہ حرکت قابلِ معافی تھی۔ کیونکہ مال گاڑی میں نہتے مسافر نہیں بلکہ سامان ہی ہوتا ہے اور سامان جنگی بھی ہو سکتا ہے۔ محاذوں کی سپلائی کو کاٹنے کے لیے مال گاڑیوں پر حملے

کیے جاتے ہیں۔ ایسے حملے اندھا دھند بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن مسافر گاڑیوں اور زخمیوں کی گاڑیوں پر جن کی چھتوں پر اور پہلوؤں پر ریڈ کراس کے بڑے بڑے نشان ہوتے ہیں، حملے نہیں کیے جاتے۔ یہ نہ صرف بین الاقوامی قانون ہے۔ بلکہ ہوابازانہ انسانیت کا احترام بھی کرتے ہیں۔ لیکن انسانیت کا احترام کرنے والے ہواباز جنگجو ہوتے ہیں۔

۱۵ستمبر ۱۹۶۵ء، دن کے ساڑھے بارہ بجے لاہور سے تقریباً پچیس میل دور نارووال کے راستے میں، شاہ سلطان ریلوے سٹیشن سے ایک میل ہٹ کر، دو بھارتی طیاروں نے ایک ایسی مسافر گاڑی (۱۸۵ ڈی، اپ) پر حملہ کیا۔ جس کی چھتوں پر بھی مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ چھتوں پر بیٹھے مسافروں کا ہجوم اس حقیقت کا ثبوت تھا کہ یہ گاڑی ملٹری سپیشل نہیں تھی۔ پھر بھی بھارتی ہوابازوں نے اس پر مشین گن فائرنگ کی۔ اخباروں میں شہیدوں کی تعداد بیس سے چالیس تک شائع کی گئی تھی۔ گاڑی کے ڈرائیور لئیق محمد خاں اور گارڈ، چوہدری عبدالغفور شہیدوں کی صحیح تعداد بتانے سے قاصر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شہید بے شمار تھے اور زخمیوں کا بھی کوئی اندازہ نہ تھا کچھ تو مشین گن فائرنگ سے شہید اور زخمی ہوئے اور بعض گھبرا کر چلتی گاڑی کی چھتوں سے گرے اور شدید زخمی ہو گئے۔

اس گاڑی کی تباہی کی تفصیلات فراہم کرنے کے لیے میں نے متعلقہ افراد کی تلاش میں کوئی ایک برس صرف کیا۔ آخر گاڑی کے چند ایک مسافروں کو ڈھونڈ نکالا اور بصد مشکل لئیق محمد خاں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ اس گاڑی کے ڈرائیور تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ساری واردات سنا دیں گے لیکن انہوں نے دکھ زدہ لہجے میں مجھ سے باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔ انہوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا ہواباز ہوا سے مسافر گاڑی اور مال گاڑی میں فرق معلوم نہیں کر سکتا؟ اور کیا ملٹری سپیشل اور مسافر گاڑی کو پہچاننے کے لیے ہواباز کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا؟

میں نے لئیق محمد خان کو بتایا کہ اگر ہوا باز صاحبِ کردار ہو تو وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر گاڑی کو قریب سے دیکھ سکتا ہے۔ مثلاً نارووال کے اس ظالمانہ حملے کے دو روز پہلے ۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پاک فضائیہ کے چار ہوا باز۔ سکواڈرن لیڈر علاؤالدین احمد شہید، فلائٹ لیفٹیننٹ امان اللہ، فلائٹ لیفٹیننٹ سلیم اور فلائٹ لیفٹیننٹ عارف منظور ــــ بھارتی علاقے میں دشمن کی ایک ایسی گاڑی کو تباہ کرنے گئے تھے، جس میں انٹیلی جنس کی اطلاع کے مطابق بھارتی مورچوں کے لیے گولہ بارود آ رہا تھا۔ اس فارمیشن کا لیڈر سکواڈرن لیڈر علاؤالدین احمد شہید تھا۔ انہیں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ ایک مال گاڑی آ رہی ہے لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ گاڑی کس وقت کس مقام پر ہو گی۔

علاؤالدین احمد ابھی ابھی اپنے ہوا بازوں کے ساتھ چونڈہ نارووال سیکٹر سے واپس آیا تھا۔ اس روز چونڈہ کے وسیع میدان میں ٹینکوں کی جنگ عروج پر تھی۔ یہ چاروں پاکستانی شاہباز پاک فوج کی مدد کرتے ہوئے درختوں کی بلندی تک جا جا کر دشمن کے ٹینکوں اور توپوں کو نشانہ بناتے رہے تھے۔ دشمن کی طیارہ شکن گنیں ان پر آگ برساتی رہی تھیں لیکن یہ چار شاہباز جان کی بازی لگا کر دشمن کے متعدد ٹینک، توپیں اور بکتر بند گاڑیاں تباہ کر آئے تھے۔ وہ اس وقت لوٹے تھے جب ان کا ایمونیشن ختم ہو چکا تھا اور تیل بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

اپنے اڈے پر اُتر کر بمشکل ناشتہ کیا تھا اور ابھی کمر بھی سیدھی نہ کر پائے تھے کہ انہیں گورداسپور کے علاقے پر مشاہداتی پرواز کے لیے بھیج دیا گیا اور بتایا گیا کہ ایک خاص مال گاڑی کو ڈھونڈ کر تباہ کرنا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چاروں ہوا باز علاؤالدین احمد شہید کی قیادت میں محاذوں کی فضا سے گزر کر دشمن کے آسمان کو چیر رہے تھے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ امان اللہ نے وائرلیس پر لیڈر سے کہا۔ "نیچے ایک ریل گاڑی جا رہی ہے۔ چلو اسی کو لے لیں" ــــ سکواڈرن

لیڈر علاؤالدین احمد نے گاڑی کو دیکھا اور طیارے کو غوطے میں ڈال دیا۔ اس کے تینوں ہوا باز بھی غوطے میں چلے گئے۔ وہ گاڑی کے پہلو بہ پہلو گاڑی کی بلندی تک اترے۔ انہیں لال رنگ کی اس بھارتی گاڑی کی کھڑکیوں سے مسافروں کے سہمے ہوئے چہرے نظر آئے۔

وائرلیس پر علاؤالدین احمد کی آواز گونجی ــــ "اسے جانے دو، یہ مسافر گاڑی ہے" ــــ چاروں سیبر طیارے بیک وقت تیروں کی طرح اُوپر اٹھے اور فضا کی رفعتوں میں بھارتی علاقے کے دُور اندر چلے گئے۔ یہ چاروں شاہباز اسی گاڑی پر راکٹ اور مشین گن فائر کر کے فارغ ہو سکتے تھے لیکن وہ پاک فضائیہ کے شاہباز تھے۔ کرگس و زاغ نہیں تھے۔ وہ اپنے مطلوبہ شکار کو ڈھونڈتے گورداسپور ریلوے سٹیشن تک جا پہنچے جہاں انہیں ایک لمبی مال گاڑی کھڑی نظر آئی۔

چاروں شاہباز اس پر اندھا دھند حملہ کر سکتے تھے۔ لیکن علاؤالدین شہید نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ذرا ٹھہرو، میں دیکھ لوں کہ یہ وہی گاڑی ہے یا کوئی اور ہے۔ اس نے طیارے کو غوطے میں ڈالا، گاڑی کو نشست (گن سائیٹ) میں لیا اور مشین گنیں فائر کر دیں۔ اس کی چھ مشین گنوں کی بکتر شکن اور آتشیں گولیاں گاڑی کی آہنی چھت میں داخل ہو کر پھٹیں تو گاڑی کے دو تین ڈبے ہولناک دھماکے سے پھٹے اور سیاہ کالی گھٹا اٹھی۔ علاؤالدین احمد شہید نے وائرلیس پر چلّا کر کہا "یہی ہے۔ اس میں ایمونیشن ہے، اسے جلدی ہی ختم کر دو"

چاروں شاہبازوں نے تھوڑی سی دیر میں راکٹوں اور مشین گنوں سے پوری کی پوری گاڑی کو اڑا دیا۔ گاڑی گولہ بارود سے بھری پڑی تھی جو یقیناً اگلے مورچوں کے لیے جا رہا تھا۔ شاہبازوں نے پاکستان کی تباہی کے سامان کو بھارت میں ہی تباہ و برباد کر دیا۔ گورداسپور کی فضا میں ریل گاڑی اور ریلوے لائن کے ٹکڑے، لائن کے سلیپر اور پتھر اور ڈبوں میں پھٹنے

ہوئے گولوں کے ٹکڑے اور ریلوے سٹیشن کی عمارتوں کی اینٹیں اڑ رہی تھیں اور شہر سیاہ کالی گھٹا میں روپوش ہو گیا تھا۔

اس قدر قیامت بپا کر کے بھی علاؤالدین کو چین نہ آیا۔ نیچے سیاہ گرد و غبار میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پھر بھی یہ جانباز شاہباز اپنے ہوا بازوں سے یہ کہہ کر کہ شاید کوئی ڈبہ محفوظ رہ گیا ہو، پھٹتے بارود کی گھٹا میں غوطہ لگا گیا۔ اس کے ساتھی بتاتے ہیں کہ اسے دو تین ڈبے نظر آ گئے تھے جو ابھی محفوظ تھے۔ اس نے راکٹوں کی آخری بوچھاڑ فائر کر دی۔ ڈبوں میں اس کے راکٹ پھٹے اور ان کے ساتھ ڈبوں میں بھرا ہوا گولہ بارود پھٹا۔ علاؤالدین اس قدر نیچے چلا گیا تھا کہ اس کا طیارہ اس دھماکے کی زد میں آ گیا۔ اس سے پہلے اس کے طیارے کو نیچے سے اٹھا ہوا لوہے کا ایک ٹکڑا لگ چکا تھا۔ لیکن اس نے طیارے کو سنبھال لیا تھا۔ اب کے وہ اپنی بپا کی ہوئی قیامت کی لپیٹ میں ایسا آیا کہ اس کے ساتھیوں کو اس کی آخری آواز سنائی دی ــــ "میری کاک پٹ دھوئیں سے بھر گئی ہے۔" دوسرے لمحے اس نے کہا۔ "اب ٹھیک ہے۔" اور وہ دشمن کی فضا میں لاپتہ ہو گیا۔ اسے بہت تلاش کیا گیا لیکن علاؤالدین احمد وطن پر قربان ہو چکا تھا۔ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا طیارہ دشمن کے علاقے میں کس مقام پر گرا تھا۔

یہ واقعہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کا ہے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح لاہور سٹیشن پر پسنجر ٹرین ۱۸۵ اپ نارووال کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ انجن نمبر GEU ۳۵۱۳ لگا ہوا تھا۔ انجن میں تین آدمی تھے۔ ڈرائیور رفیق محمد خان، فائرمین عبدالوحید اور ٹربل شوٹر (انجن کا مکینک) قاضی نسیم۔ گارڈ چوہدری عبدالغفور تھے۔ گاڑی میں مسافروں کا اس قدر رش تھا کہ ڈبوں کی چھتوں پر بھی مسافر سوار تھے۔ جنگ عروج پر تھی۔ اس روز محاذوں کی پوزیشن اور دونوں ملکوں کی جنگی کیفیت یہ تھی کہ برطانوی نشری ادارے بی بی سی کے نمائندے نے ایک ہی روز پہلے کراچی میں کہا تھا ــ "تمام سیکٹروں میں بھارت جو ٹینک

پاکستانیوں کے ہاتھوں تباہ کرا چکا ہے ان کی مجموعی تعداد ایک بکتر بند ڈویژن جتنی ہے۔"

اسی روز "نیویارک ٹائمز" نے اپنے جنگی وقائع نگار کے حوالے سے یہ خبر شائع کی تھی ــ "بھارت اپنے نقصانات منظرِ عام پر نہیں لا رہا لیکن یہ حقیقت چھپائی نہیں جا سکتی کہ بھارت اپنی فوج کی بے انداز نفری مروا چکا ہے اور اس نے جو ٹینک، طیارے، توپیں اور دیگر جنگی سامان تباہ کروایا یا پسپا ہوتے وقت پاکستانیوں کے حوالے کیا ہے، اس کے اعداد و شمار غیر معمولی ہیں۔"

رائٹر نے لکھا ــ "پاکستان کی چھوٹی سی فوج نے بھارت کا اس قدر خوفناک اور اچانک حملہ نہ صرف روک لیا ہے بلکہ کئی سیکٹروں میں اب جنگ بھارتی علاقوں میں ہو رہی ہے۔"

اور اس روز تک بھارتی ہائی کمان اپنی شکست اور جگ ہنسائی کا انتقام پاکستان کے نہتے اور بے گناہ شہریوں سے لے چکی تھی۔ بھارتی ہوا باز پشاور کے دو گاؤں، لنڈی ارباب اور گڑھی لوہاراں پر بمباری کر گئے تھے۔ جس سے تیس افراد اور تین مسجدیں شہید ہوئیں اور متعدد مویشی مارے گئے۔ اسی روز کوہاٹ میں لیاقت میموریل ہسپتال پر، سٹی ہیلتھ سنٹر اور ڈسٹرکٹ جیل کے ہسپتال پر بھی بھارتی طیاروں نے بمباری کی اور لاتعداد مریض شہید ہوئے۔ اور اسی روز شاستری نے اعلان کیا تھا کہ "ہم کسی بھی شرط پر جنگ بندی کے لیے تیار ہیں۔"

۱۵ ستمبر کی صبح نارووال جانے والی گاڑی میں جب مسافر چھتوں پر بھی چڑھے بیٹھے تھے تو انہیں ابھی معلوم نہ تھا کہ پاک فضائیہ کے شاہین آج پھر بھارت کے ہوائی اڈوں، ہلواڑہ اور آدم پور کا صفایا کر آئے ہیں اور انڈین ایئر فورس کے کئی اور طیارے تباہ کر ڈالے ہیں۔ ادھر سرگودھے کی فضا میں پاک فضائیہ کے ایک شاہباز نے ایک اور بھارتی بمبار کینبرا کو مار گرایا ہے اور

ان مسافروں کو یہ بھی علم نہ تھا کہ پاک فضائیہ کے شاہباز پاک فوج کا ہاتھ بٹانے
گئے تھے اور دشمن کے بائیس ٹینک، پانچ ہلکی اور بھاری توپیں، پٹرول کے
تین ذخیرے اور فوجیوں سے لدے ہوئے اکاون (۵۱) ٹرک جو مورچوں کی
طرف جا رہے تھے، فوجیوں سمیت بھسم کر آئے ہیں۔

اور ۱۸۵ اَپ ٹرین کے مسافروں کو گمان تک نہ تھا کہ وہ انڈین ایئر
کے ہوابازوں کے انتقام کا نشانہ بننے جا رہے ہیں۔ اب تو ہسپتال اور
مسافر گاڑیاں ہی ایسے تارگیٹ رہ گئے تھے جن پر حملہ کرتے بھارتی ہوابازوں
کو جوابی فائر کا خطرہ نہیں تھا۔

گاڑی گیارہ بجکر پانچ منٹ پر لاہور سے چلی۔ اس کی منزل نارووال تھی۔
شاہدرہ سے گاڑی برانچ لائن پر ہولی اور بارہ بج کر بیس منٹ پر کالا خطائی
(شاہدرہ سے تقریباً بیس میل دور) سٹیشن پر پہنچی۔ وہاں سے چلی تو آگے شاہ
سلطان کا سٹیشن تھا۔ گاڑی اس سٹیشن سے ایک میل اِدھر تھی کہ ڈرائیور لیئق محمد
خاں کو دو لڑاکا بمبار طیارے نیچی پرواز کرتے نظر آئے۔ لیئق محمد نے فائرمین عبدالوحید
اور ٹربل شوٹر قاضی نسیم سے کہا ــــ "لیٹ جاؤ، معلوم نہیں یہ جہاز اپنے ہیں
یا دشمن کے" ــــ اور وہ خود اپنی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ انجن پینتیس (۳۵)
میل کی رفتار سے جا رہا تھا۔

فائرمین اور ٹربل شوٹر ابھی لیٹنے بھی نہ پائے تھے کہ لیئق محمد خاں کو
انجن کے سامنے آگ کی لکیریں نظر آئیں۔ انجن کے شور کی وجہ سے وہ کوئی اور
بیرونی آواز یا کوئی دھماکہ نہ سن سکے۔ یہ لکیریں ایک بھارتی طیارے کی مشین گنوں
کا پہلا برسٹ تھا جو ہواباز نے انجن کے سامنے آکر فائر کیا تھا۔ برسٹ انجن
کے سامنے لگا اور سامنے کا حصہ پھاڑ کر لیئق محمد کے سر سے چند انچ اوپر سے گذرا
اور بینل PANEL میں لگا۔ انجن نے شدید جھٹکا کھایا اور اس قدر ڈولا جیسے
الٹ جائے گا۔

معاً بعد دوسرے طیارے کی بوچھاڑ سیدھی انجن پر آئی، گولیاں شیشوں

پر لگیں اور شیشوں کے ٹکڑے لیئق محمد کے چہرے پر اور آنکھوں میں پڑے۔
سامنے سے انجن چھلنی ہو گیا۔ لیئق محمد نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے اور
فوراً ہاتھ ہٹا کر ہینڈل وغیرہ کو دیکھنے لگا تاکہ انجن کو قابو میں رکھے۔ اسے قطعاً
محسوس نہ ہوا کہ اس کا چہرہ لہولہان ہو چکا ہے اور شیشے کا ایک ٹکڑا آنکھ میں
پھنس گیا ہے۔ وہ انجن کو قابو میں رکھنے میں اس قدر محو تھا کہ چہرے سے بہتے
خون کو پسینہ سمجھتا رہا۔ یہ سب کچھ ایک دو لمحوں میں ہو گیا۔ وہ گاڑی کو روکنا نہیں
چاہتا تھا لیکن اسے خیال آگیا کہ بھارتی طیارے گنیں فائر کرتے گاڑی کے اوپر
سے گذر گئے ہیں اور ڈبوں کی چھتوں پر بھی مسافر بیٹھے ہیں۔ اس نے انجن
کی کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھا تو اس پر ہول طاری ہو گیا ــــ کئی مسافر
زخمی ہو کر چھتوں سے گر پڑے تھے اور کئی ابھی تک گر رہے تھے۔ لیئق محمد نے
ایمرجنسی ویکیوم (ہنگامی وقت کا بریک) لگا دیا۔ گاڑی رک گئی۔

لیئق محمد خاں انجن سے اترنے لگے تو فائرمین عبدالوحید نے انہیں
بتایا کہ آپ کا چہرہ اور بازو زخمی ہیں۔ دیکھئے کتنا خون بہہ رہا ہے۔ لیکن لیئق محمد
نے اپنے زخموں کی طرف توجہ دیے بغیر عبدالوحید اور ٹربل شوٹر قاضی نسیم سے
کہا: "تم انجن کا معائنہ کرو، میں پیچھے زخمیوں کو دیکھنے جا رہا ہوں، مسافر
اوپر سے گر رہے ہیں۔"

لیئق محمد خاں کہتے ہیں کہ اگر عام حالات میں یا گھر میں مجھے سوئی بھی
چبھ جاتی تو شاید میں درد سے بلبلا اٹھتا لیکن وہ وقت کچھ ایسا تھا کہ زخموں
میں درد کا ہلکا سا بھی احساس نہ ہوا اور میں بہتے خون کو پسینہ ہی سمجھتا
رہا۔ طبیعت میں ہیجان ضرور تھا اور اس جذبے سے خون بری طرح کھول
رہا تھا کہ دشمن نے دو بدو لڑنے کی بجائے ہوائی جہازوں سے حملہ کیا ہے۔
کاش! دشمن کھلے میدان میں سامنے آکر لڑتا۔

لیئق محمد دوڑ کر پیچھے گئے۔ گاڑی کے دونوں طرف زمین پر زخمی تڑپ

رہے تھے۔ سب سے پہلے دو زخمی نظر آئے۔ ایک کا ہاتھ غائب اور دوسرے
کی ٹانگ بُری طرح کچلی ہوئی تھی۔ دور پیچھے تک ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ
بے شمار زخمی پڑے ہوئے تھے۔ لئیق محمد خاں، گارڈ چوہدری عبدالغفور سے
ملے اور انہیں کہا کہ آپ جھنڈی دکھائیں میں گاڑی کو پیچھے کرتا ہوں تا کہ
تمام زخمیوں اور شہیدوں کو گاڑی میں ڈال لیا جائے۔ مسافر ہراساں اور
پریشان تھے۔ ان میں سے کچھ قریبی کھڈ نالوں اور جھاڑیوں میں جا چھپے تھے۔
کیونکہ ہوائی حملے کا خطرہ بدستور سر پر منڈلا رہا تھا۔ گو دشمن کے طیارے جا چکے
تھے۔ زخمیوں کو دیکھ کر لئیق محمد اور چوہدری عبدالغفور پر دیوانگی سی طاری ہونے
لگی۔ وہ خوفزدہ نہیں تھے بلکہ اس خیال سے بے حال ہو رہے تھے کہ دشمن ہوا
سے وار کر کے بھاگ گیا تھا۔ یہ کوئی بہادری نہیں تھی، نہتے مردوں، عورتوں
اور بچوں کو لڑاکا بمبار طیاروں سے ارجانا بزدلوں کا شیوہ ہوتا ہے۔

ڈرائیور اور گارڈ نے مسافروں کی مدد سے زخمیوں کو گاڑی میں ڈالا پھر
لئیق محمد بھاگ کر انجن میں گئے اور پیچھے پڑے ہوئے زخمیوں کو اٹھانے کے لیے
گاڑی پیچھے کو چلا دی۔ فائر مین عبدالوحید کا جوش و خروش اور حاضر دماغی
خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے اور ٹربل شوٹر قاضی نسیم نے اس قدر
مجروح انجن کی دیکھ بھال نہایت جانفشانی سے کی اور اسے چلنے کے قابل
بنا دیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی اور زمین پر پڑے ہوئے زخمیوں
اور شہیدوں کو گاڑی میں ڈالا جانے لگا۔ زخمیوں کی حالت بہت بُری
تھی۔ وہ نہ صرف چلتی ریل گاڑی کی چھت سے گرے تھے بلکہ گولیاں کھا کر
گرے تھے اور یہ کوئی چھوٹی گولیاں نہیں تھیں۔ بلکہ ان کا سائز تیس (۳۰)
ملی میٹر تھا۔ یہ ایک انچ قطر کی ساڑھے تین انچ لمبی گولی ٹارگیٹ پر لگ کر
گرنیڈ کی طرح پھٹتی ہے۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس ایمونیشن کی بوچھاڑوں
سے مسافروں کا کیا حشر ہوا ہو گا؟ گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے کئی مسافر شہید
اور زخمی تھے۔ گولیاں چھتیں پھاڑ کر اندر بھی پھٹی تھیں۔

زخمیوں اور شہیدوں کو گاڑی میں ڈالا جا چکا اور گاڑی منزل کی طرف
روانہ ہونے لگی تو شور اٹھا۔ "جہاز آ گئے، جہاز آ گئے"۔ دیکھا کہ کاموں کے
کی طرف سے دو بھارتی طیارے بہت نیچی پرواز کرتے گاڑی کی طرف آ رہے
تھے۔ مسافر کھیتوں میں پناہ لینے کو بھاگے اور بعض گاڑی کے نیچے چھپ گئے۔
قیامت کا منظر تھا۔ معذوری یہ تھی کہ مسافر دشمن پر جوابی وار نہیں کر سکتے تھے۔
ورنہ کوئی بھی ہراساں اور پریشان نہ ہوتا۔ طیارے زناٹے سے گاڑی کے
اُوپر سے گذر گئے اور ایک بڑا سا میگزین پھینک گئے۔ مسافر اسے بم سمجھتے
ہوئے دھماکے کے منتظر تھے لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور طیارے چلے گئے۔

لئیق محمد خاں گاڑی چلانے لگے تو نارنگ سٹیشن کا سٹیشن ماسٹر بائیسکل
پر ہانپتا کانپتا آن پہنچا۔ یہ ریلوے کے سٹاف کی مستعدی اور فرض کی لگن
کا ثبوت تھا کہ سٹیشن ماسٹر اتنی دُور سے طیاروں کی مشین گنوں کے دھماکے
سُن کر بائیسکل پر موقعۂ واردات پر پہنچ گیا اور گاڑی کا حال احوال دیکھا۔ گاڑی
چلی اور مجروح انجن نے گاڑی کو نارنگ پہنچا دیا۔ لئیق محمد خاں کے چہرے اور
بازوؤں سے بدستور خون بہہ رہا تھا لیکن انہیں ابھی تک اپنے زخموں میں
درد محسوس نہیں ہوا تھا۔ ان کے اعصاب پر فرض غالب تھا۔

وہ گاڑی کو ہر قیمت پر نارووال اور زخمیوں کو مرہم پٹی کے لیے جلد از
جلد اگلے سٹیشن تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کا فائر مین عبدالوحید ان کا خوب
ساتھ دے رہا تھا۔ قاضی نسیم اور گارڈ عبدالغفور کا جذبہ قابلِ داد تھا کسی
بھی لمحے بھارتی طیاروں کے ایک اور حملے کا خطرہ تھا لیکن گاڑی چلانے
والے چاروں مجاہد گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر گاڑی چلائے چلے جا رہے تھے۔
ان کی مستعدی اور پھرتی کا یہ عالم تھا کہ گاڑی پر پہلا حملہ ساڑھے بارہ بجے ہوا
اور انہوں نے گاڑی کو ایک بج کر پندرہ منٹ پر نارنگ پہنچا دیا۔ ان پینتالیس
منٹوں میں انہوں نے گاڑی کو دور پیچھے لے جا کر زخمیوں اور شہیدوں کو

اٹھایا، گاڑی میں ڈالا، دوسرے حملے سے بچنے کے لیے مسافروں کو گاڑی
کے نیچے اور اِدھر اُدھر محفوظ جگہوں پہ کیا۔ پھر سب کو اکٹھا کر کے گاڑی میں
بٹھایا اور گاڑی چلا کر نارنگ پہنچ گئے۔ ان کے لیے سب سے بڑی دشواری
یہ تھی کہ مسافروں (خصوصاً عورتوں اور بچوں) نے نفسا نفسی اور بھگدڑ
کی سی کیفیت بنا ڈالی تھی جو ایسے حالات میں حیران کُن یا قابلِ اعتراض
نہیں تھی۔ لئیق محمد خان اور چوہدری عبدالغفور نے اس ہراساں ہجوم کا
حوصلہ بڑھایا اور ان پر قابو پائے رکھا۔ کمال یہ ہے کہ کئی مسافر گاڑی سے
دور بھاگ گئے تھے انہیں بلا بلا کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر گاڑی میں بٹھایا اور
کسی ایک آدمی کو بھی پیچھے نہ چھوڑا۔

گاڑی نارنگ سٹیشن پر پہنچی تو وہاں ایمان افروز منظر دیکھنے میں آیا۔ وہاں
اس گاڑی پر بھارتی طیاروں کے حملے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ سٹیشن کے اندر اور
باہر لوگوں کا جمِ غفیر منتظر کھڑا تھا۔ وہ بے شمار چارپائیاں اور بستر لائے تھے
دودھ، پانی، لسی، شربت اور ٹھنڈی بوتلوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ نارنگ کے
سول ہسپتال کا ڈاکٹر، تمام پرائیویٹ ڈاکٹر اور ڈسپنسر دوائیاں، پٹیاں اور
دیگر طبی سامان اٹھائے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ ان میں چند ایک نرسیں
اور نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ اس ہجوم کی بے تابیوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے
گاڑی کے مسافر ان کے ماں جائے ہوں۔ گاڑی رکتے ہی ہجوم گاڑی میں
پھیل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے شہیدوں کی لاشوں اور زخمیوں کو
گاڑی سے اتار کر چارپائیوں پر ڈال دیا۔ ڈاکٹر، ڈسپنسر اور نرسیں مرہم پٹی
میں مصروف ہو گئیں۔ لوگوں نے باقی مسافروں کی بھی خوب خاطر مدارت کی۔ لئیق محمد
خان کہتے ہیں کہ لوگوں کے اس جذبے کو دیکھ کر ہم فخر اور اعتماد سے کہہ سکتے تھے
کہ ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

شہر کے سرکاری حکام، ڈرائیور، گارڈ، فائرمین اور ٹربل شوٹر سے ملے

اور انجن کی حالت دیکھی۔ ایک ڈاکٹر نے لئیق محمد خان کے زخموں پر پٹی باندھنا
چاہی تو لئیق محمد خان نے یہ کہہ کر روک دیا کہ زخموں پر خون جم گیا ہے جس سے
خون کا بہاؤ بند ہو گیا ہے، بہتر ہے کہ انہیں نہ چھیڑا جائے۔ کہیں ایسا نہ
ہو کہ آپ زخموں پر کوئی دوائی لگا دیں جس سے درد شروع ہو جائے اور خون
پھر چل پڑے۔ مجھے مسافروں کو ہر قیمت پر منزل پر پہنچانا ہے۔ ایک اور صاحب
نے جو غالباً تحصیلدار یا ڈپٹی کمشنر یا اسی حیثیت کے کوئی شہری حاکم تھے لئیق محمد
سے کہا کہ اگر آپ اس حالت میں انجن نہ چلا سکیں تو ہم گاڑی کو یہیں رکوا سکتے
ہیں لیکن لئیق نے کہا کہ اگر یہ حکم ہے تو میں رک جاتا ہوں اور اگر آپ میرے
زخموں کو دیکھ کر مشورہ دے رہے ہیں کہ میں آگے نہ جاؤں تو میں یہ مشورہ قبول
نہیں کروں گا۔ گاڑی کو منزل پر پہنچانا میرا فرض ہے۔ میں اتنے سارے مسافروں
کو منزل سے دور بھٹکتا نہیں چھوڑوں گا۔

جب ڈاکٹر نے لئیق محمد کی آنکھ کا زخم دیکھا تو معلوم ہوا کہ شیشے کا ایک ٹکڑا
ان کے پپوٹے میں اترا ہوا ہے جس سے آنکھ بیکار ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود
اس جری ڈرائیور نے کوتاہی نہ کی اور انجن میں بیٹھ گیا۔ تمام زخمی اور شہید
اتارے جا چکے تھے۔ انجن کی حالت کو دیکھ کر کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ
یہ انجن منزل تک پہنچ جائے گا یا یہ زخمی ڈرائیور جس کی ایک آنکھ بند تھی، گاڑی
کو منزل تک پہنچا سکے گا۔ انجن اور ڈرائیور کی دگرگوں حالت کے علاوہ خطرناک
عنصر یہ تھا کہ اب گاڑی میدانِ جنگ میں جا رہی تھی۔ آگے کا علاقہ دشمن کی
توپوں کی زد میں تھا اور دشمن کے لڑاکا بمبار طیارے چیلوں اور گدھوں کی
طرح آتے تھے اور آگ برسا کر فضا میں روپوش ہو جاتے تھے۔

لئیق محمد خان کے ساتھ گارڈ چوہدری عبدالغفور کا جذبہ ایمان افروز تھا۔
وہ ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ فائرمین عبدالوحید اور ٹربل شوٹر قاضی نسیم نے
انجن کو پوری طرح قابو میں رکھا ہوا تھا۔ وہ انجن کے ایک ایک کل پُرزے اور
اس کی چال پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ گاڑی کے سٹاف کے ان چاروں مجاہدوں

نے دشمن کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے گاڑی چلائی اور نارووال پہنچا دی۔
نارووال میں بھی اس گاڑی پر حملے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اس وقت نارووال جنگ کی زد میں تھا۔۔۔ چونڈہ کی ٹینکوں کی تاریخی جنگ کی یہ صورت تھی کہ دشمن کے نمبر ایک بکتر بند ڈویژن کا دم خم ختم کیا جا چکا تھا۔ چونڈہ محور کا چالیس میل وسیع میدان خاک و خون کا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ دشمن تازہ کمک لا کر پاک فوج کی دفاعی لائن میں کہیں نہ کہیں شگاف ڈالنے اور آگے بڑھنے کے لیے سر پٹخ رہا تھا۔ زمین و آسمان بارود کی سیاہ گھٹا میں چھپ گئے تھے اور ماحول مسلسل دھماکہ بن گیا تھا۔ ٹینک جل رہے تھے، انسان کچلے جا رہے تھے اور فضا میں توپوں کے گولے پھٹتے چنگھاڑتے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر گذر رہے تھے۔۔۔ اور ۱۸۵، اپ پسنجر ٹرین نارووال جا رہی تھی۔

نارووال کے پلیٹ فارم پر اور سٹیشن کے باہر لوگوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ وہاں بھی دودھ، لسی، شربت، بوتلوں اور پھل فروٹ کے انبار نظر آ رہے تھے۔ لوگ گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ وہ زخمیوں اور شہیدوں کو اتارنے آئے تھے لیکن انہیں نارنگ اتار لیا گیا تھا۔ لوگوں نے مسافروں کو گھیر لیا اور انہیں دودھ اور شربت پلانے لگے۔ مسافروں کی دہشت ختم ہو گئی اور اپنے بھائیوں کی بے تابیوں کو دیکھ کر ان کے چہرے کھل اٹھے۔ چند ایک فوجی افسر انجن کو دیکھنے پہنچ گئے۔ انہوں نے لئیق محمد سے پوچھا کہ جب انجن پر برسٹ پڑا تو وہ کہاں تھے؟ لئیق محمد نے بتایا کہ اپنی سیٹ پر تھا تو کوئی فوجی افسر ماننے پر آمادہ نہ ہوا۔ انہوں نے انجن سے طیاروں کی گنوں کی گولیوں کے ٹکڑے اٹھا کر لئیق محمد کو دکھائے اور کہا کہ یہ معجزہ ہے کہ وہ بچ گئے ہیں۔ یہ واقعی معجزہ تھا جو لئیق محمد خان کی ایمان کی پختگی کا کرشمہ تھا۔

اس موقع پر مجھے یاد آتا ہے کہ پاک فوج کے کسی ایک افسروں نے مجھے کہا تھا کہ ابتدا میں ہمیں خدشہ تھا کہ محاذوں پر جس رفتار اور مقدار سے ایمونیشن فائر

ہو رہا تھا، ریلوے اتنی رفتار اور جانفشانی سے سپلائی نہیں پہنچا سکے گی۔ ایمونیشن کے علاوہ دیگر جنگی سامان اور راشن وغیرہ کی ضرورت بھی شدید تھی۔ دشمن کے طیارے گاڑیوں پر بے دریغ حملے کر رہے تھے جس سے گاڑیوں کی آمد و رفت میں رکاوٹ کا شدید خطرہ تھا لیکن ریلوے کے سٹاف نے بالکل اسی جانبازی سے سپلائی کو محاذوں تک پہنچایا جس جانبازی سے پاک فوج لڑ رہی تھی۔

آرٹلری کے ایک میجر نے لئیق محمد خاں کو زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس ڈرائیور کے خون آلود چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ نہتا شہری ہے۔ اس کا جذبہ پاک فوج کے سپاہی سے کسی پہلو کم نہ تھا۔ ایسا ہی جذبہ فائرمین، ٹریل شونٹر اور گارڈ کا تھا۔ اگر ریلوے کا رننگ سٹاف موت سے ڈر جاتا تو محاذوں کی صورت کچھ اور رہی ہوتی۔ ریلوے کا نظام تو افواج کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

لئیق محمد خان نارووال سے اسی حالت میں دوسری مسافر گاڑی ۲۴۶ ڈاؤن قلعہ سوبھا سنگھ تک لے گئے۔ وہاں سے ۲۴۵، اپ لے کے نارووال آئے اور نارووال سے ۱۹۰ ڈاؤن لے کے رات کے گیارہ بجے لاہور پہنچے۔

لاہور بھی گاڑی پر حملے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ جب گاڑی لاہور پہنچی تو ریلوے کے افسران بالا پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور، گارڈ، فائرمین اور ٹریل شونٹر کا پرجوش اور والہانہ استقبال کیا اور اس سٹاف کے کارنامے کو بیساختہ سراہا۔ جب لئیق محمد خان اس تاریخی اور فاتح انجن کو شیڈ میں لے گئے تو فورمین قریشی صاحب نے انجن کے کریو کا استقبال گرمجوشی سے کیا اور انہیں کہا کہ اب جا کر آرام کرو لیکن لئیق محمد خان نے پوچھا کہ کوئی اور گاڑی لے جانی ہو تو ابھی لے جا سکتا ہوں۔

ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ایم صلاح الدین صاحب نے لئیق محمد خان کو اس کارنامے پر ایک تحریری سند دی جو تاریخی دستاویز ہے۔ کارنامے کی تفصیل

کے علاوہ اس سند میں تحریر ہے ۔۔۔ "میں آپ میں سے ہر ایک پر فخر کرتا ہوں اور مجھے کلی اعتماد ہے کہ آپ ان حیران کن روایات کو قائم رکھیں گے۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی"۔

ایک تحریری سند ڈویژنل مکینیکل انجنیئر جی، ایم۔ اظہر صاحب نے دی جس میں انہوں نے لئیق محمد خاں کے نام لکھا "۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز ۴۸۵ اپ گاڑی پر بھارتی طیاروں کے حملے کے دوران اور بعد میں آپ نے فرض شناسی کا جو مظاہرہ کیا اس نے مجھ پر گہرا اثر کیا ہے۔ دشمن نے آپ کے لیے جو خطرناک صورتِ حال پیدا کر دی تھی آپ اس میں اپنی ڈیوٹی پر ثابت قدم رہے"۔

لئیق محمد خان کہتے ہیں کہ میں اپنے افسرانِ بالا کا ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف مجھے بلکہ ریلوے کے عملے کے ہر فرد کو اسی طرح بے لوث خراجِ تحسین پیش کیا تھا اور ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے حکام بالا ہر لمحہ ہمارے دوش بدوش موجود ہیں لیکن جسے میرا کارنامہ کہا گیا ہے یہ تو میرا فرض تھا، میں نے کوئی غیر معمولی معرکہ نہیں مارا۔ انہوں نے کہا ۔۔۔ "جنگ کے دوران میری والدہ مجھے کہا کرتی تھیں کہ بیٹا! تیرا مال، تیری جان اور تیرا سب کچھ اللہ کا ہے۔ جب بھی وطن کو تیری جان کی ضرورت آن پڑے تو بے خوف ہو کر جان دے دینا۔ ہمارا اللہ مالک ہے"۔۔۔ اور یہ ماں کی دعاؤں اور اسی کی حوصلہ افزائی کا کرشمہ ہے کہ جنگ کے دوران بڑے بڑے نازک لمحے آئے، دل نے کبھی خوف محسوس نہ کیا۔

ایک روز وہ اسی لائن پر ایک مسافر گاڑی لاہور لا رہے تھے۔ جسڑ سیکٹر میں دشمن کے توپ خانے نے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ گولے گاڑی سے تقریباً ایک فرلانگ دُور پھٹ رہے تھے۔ لئیق محمد خان نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے قریب دیہات کے ڈیڑھ دو ہزار مرد، عورتیں اور بچے کھڈ نالوں میں چھپے ہوئے تھے۔ لئیق محمد نے سوچا کہ اگر گولے ذرا آگے آنے لگے تو اس ہجوم میں کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ انہوں نے گاڑی روک

لی اور لوگوں کو بلا بلا کر گاڑی میں بٹھا لیا۔ پھر دیکھا کہ کوئی رہ تو نہیں گیا۔ اب گولے بارش کی طرح آنے لگے تھے لیکن اس محبِ وطن ڈرائیور اور گارڈ نے تمام لوگوں کو نہایت اطمینان سے گاڑی میں بٹھایا اور انہیں محفوظ جگہوں تک پہنچا دیا۔

لئیق محمد خان نے کہا کہ سننے والے حیران ہوتے ہیں کہ بھارتیوں نے نہتے مسافروں پر طیاروں سے حملہ کیا لیکن میرے لیے یہ کوئی حیران کن واقعہ نہیں۔ میں نے ۱۹۴۷ء میں بھارت سے ہجرت کے وقت بھارتیوں کی درندگی کے بہت مظاہرے دیکھے ہیں۔ بھارتی سورمے ہمیشہ نہتوں پر وار کیا کرتے ہیں۔

انہوں نے سنایا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں وہ سہارن پور تھے۔ ریلوے سٹاف کے مسلمان افراد بال بچوں سمیت ایک گاڑی میں پاکستان آ رہے تھے۔ ان کا سامان مال گاڑی کے ڈبوں میں لادا گیا تھا جو آج تک پاکستان نہیں پہنچا۔ مہاجرین کی مسافر گاڑی کو جالندھر روک لیا گیا۔ پیچھے سے دلّی کے مہاجرین کی ایک گاڑی آ رہی تھی۔ اسے جالندھر سے "رن تھرو" کیا گیا۔ لیکن یہ دلّی والی گاڑی پاکستان نہ پہنچ سکی۔ جالندھر سے کچھ دُور آگے اس گاڑی کو روک کر ہندوؤں اور سکھوں نے تمام مہاجرین کو شہید کر دیا تھا۔ گاڑی میں ایک بچہ بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔

لئیق محمد بتاتے ہیں کہ ان کی گاڑی جالندھر سے امرتسر پہنچی تو تمام راستے میں ریلوے لائن کے دونوں طرف مسلمانوں کی کٹی ہوئی لاشیں اور قرآن پاک کے پھٹے ہوئے اوراق بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں ننھے ننھے بچوں کی لاشیں بھی تھیں۔

"یہ ہے تو بہت ہی دردناک واقعہ کہ بھارتی طیارے اتنے سارے مسافروں کو شہید کر گئے"۔ لئیق نے کہا۔ لیکن کبھی کبھی خوشی سی محسوس ہوتی

ہے کہ انہوں نے ہمارے کسی فوجی ٹھکانے یا کسی بڑی توپ پر حملہ کرنے کی بجائے ہمیں نشانہ بنایا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری قوم پاک فوج کے ایک غازی کی جان کی خاطر ایک سو شہریوں کو قربان کر سکتی ہے۔"

اسے کوئی نہ روک سکا

- پاک فضائیہ کا بمباری کا پہلا مشن
- پاک فضائیہ کا پہلا شہید
- وہ چہرے پر تھکن اور شب بیداری کے اثرات کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک پریس کانفرنس میں پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف ایئر مارشل نور خان نے کہا تھا۔۔۔ "میری مشکل یہ نہیں کہ میں اپنے ہوابازوں کو میدانِ جنگ میں کیسے دھکیلوں بلکہ میری دشواری یہ ہے کہ انہیں بڑھ بڑھ کر حملے کرنے سے روکوں کیسے؟"

اور بھارت کے ہوائی اڈوں پر عقابوں کی طرح جھپٹنے والے اور دشمن پر بجلیوں کی طرح کوند کر اس کے ٹھکانوں کو خاکستر کرنے والے شاہبازوں میں ایک سکواڈرن لیڈر شبیر عالم صدیقی شہید تھا جو ایئر مارشل نور خان کے ان الفاظ کی تفسیر تھا کہ "انہیں بڑھ بڑھ کر حملے کرنے سے روکوں کیسے؟"

ونگ کمانڈر سعید انصاری نے بھی شبیر عالم صدیقی شہید کو بڑھ بڑھ کر حملے کرنے سے روکا تھا لیکن وہ ہر بار مسکرا کر کہتا تھا۔۔۔ "نہیں، میں تھکا تو نہیں ہوں"۔۔۔ اس جانباز شاہباز کے بمبار طیارے (بی ۵۷) کے گراؤنڈ کریو کا کہنا ہے کہ بھارتی حملے کی اطلاع ملتے ہی سکواڈرن لیڈر صدیقی شہید پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بمباری کے ایک حملے سے واپس آتا تھا تو اس کے منہ سے یہی ایک بات نکلتی تھی۔۔۔ "بم لگاؤ۔ جلدی"۔۔۔ اور وہ دوسرے حملے کے لیے چلا جاتا تھا۔ اس کے لیے دن اور رات کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔ بمبار طیارہ اس کے جسم کا حصہ اور اس کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا تھا۔ اسی جنون میں وہ بمباری کی آخری پرواز پر گیا اور لوٹ کے نہ آیا لیکن اس نے جس مقصد کے لیے زندگی کی آخری گھڑیاں وقف کر دی تھیں وہ مقصد پورا ہو گیا۔۔۔ جام نگر کا فضائی اڈہ جھلسے ہوئے بھیانک کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔

بمبئی کے قریب جام نگر بھارت کا ایک مضبوط اور اہم ہوائی اڈہ تھا جہاں کے لڑاکا بمبار طیارے کراچی اور صوبہ سندھ کے دُور دُور کے علاقے کو بمباری کی زد میں لے سکتے تھے۔ کراچی کی بندرگاہ اور ساحلی دفاع کو اس اڈے سے شدید خطرہ تھا۔ دوارکا کا ریڈار اس اڈے کے ہوائی بیڑے کی راہنمائی کرتا تھا جس سے جام نگر کے اڈے کو پاک فضائیہ کے بمباروں کے حملے کی اطلاع قبل از وقت مل جاتی تھی۔ دوارکا، جام نگر کا حصار تھا۔ اسے بھی توڑنا ضروری تھا اور جام نگر کو تباہ کرنا اس سے زیادہ لازمی۔

دوارکا کے ریڈار کی موجودگی میں پاک فضائیہ کے بمباروں کا جام نگر پر حملہ مخدوش اور پُر خطر تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہمارے بمبار وہاں جا کر واپس آسکیں گے یا نہیں کیونکہ دوارکا کے ریڈار کی وجہ سے سب کو یقین تھا کہ جام نگر کے ہوائی بیڑے اور طیارہ شکن گنوں نے ہمارے بمباروں کو ختم کرنے کا پورا اہتمام کر رکھا ہو گا اور ان کا دفاع منتظر ہو گا۔

اس یقینی خطرے کے باوجود ۷ ستمبر دن کے تیسرے پہر جام نگر کے ہوائی اڈے پر بمباری کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ جس کے لیے چھ بمبار (بی ۵۷) طیارے تیار ہو گئے۔ شاہبازوں اور نیوی گیٹروں کو تمام تر ضروری ہدایات دے دی گئیں۔ تختہ سیاہ پر نقشہ بنا کر اس پر جام نگر کی جگہ نشان لگا دیا گیا۔ بمبار طیارے اپنے اڈے پر دُور دُور بکھیر کر کھڑے کیے گئے تھے۔ شاہبازوں کو بتایا گیا کہ کس کا طیارہ کہاں کھڑا ہے اور انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ ان کے طیاروں کے ساتھ کس کس قسم کے بم لگائے گئے ہیں۔

ذرا ہی دیر میں جیپیں شاہبازوں اور نیوی گیٹروں کو ان کے طیاروں کی طرف انتہائی رفتار سے لے جا رہی تھیں اور تھوڑی دیر بعد چھ کے چھ بمبار طیارے مہیب گڑگڑاہٹ سے سٹارٹ ہوئے۔ طیاروں نے دھوئیں کی سیاہ گھٹائیں اگلیں جو فضا میں پھیلنے لگیں۔ ہوائی اڈے پر اور کوئی آواز نہیں سنائی

دے رہی تھی۔ کوئی انسان اُونچی آواز سے بول نہیں رہا تھا۔ سب پر ہیجانی سی کیفیت طاری تھی اور سب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ آنکھیں ٹھہری ہوئیں اور نظریں اُن چھ بمبار طیاروں کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں جو جام نگر پر بھاری بمباری HEAVY BOMBING کے پہلے حملے کے لیے "رن وے" کی طرف جا رہے تھے۔

میں نے پاک فضائیہ کے اس اڈے کے چند ایک گراؤنڈ کریو اور دو تین افسروں سے پوچھا کہ ان طیاروں کو جاتا دیکھ کر ان کے ہونٹ کیوں ہل رہے تھے؟

"میں آیۃ الکرسی پڑھ رہا تھا" ایک نے کہا۔

"میں یا حیُّ ویا قیوم پڑھ رہا تھا" دوسرے نے کہا۔

"میں سورہ یٰسین کا وِرد کر رہا تھا" تیسرے نے کہا۔

"یا خدائے ذوالجلال ......" تیسرے نے جواب دیا "میری زندگی ان چھ شاہبازوں میں تقسیم کر دے ...... میرے ہونٹوں سے یہی ایک دُعا پھسلی جا رہی تھی"

"جام نگر پر بمباری کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا" چوتھے نے کہا "ہم میں سے کسی کو یقین نہیں تھا کہ ہمارے شاہباز واپس آ جائیں گے۔ راستے میں دوارکا کا ریڈار تھا جو مغربی پاکستان میں دُور اندر تک دیکھ سکتا تھا۔ وہ اتنا طاقت ور ریڈار تھا کہ پاکستان کے ہوائی اڈے سے اڑتے ہی ہمارے طیارے اُسے نظر آ سکتے تھے ...... میں تو درود تاج پڑھے جا رہا تھا"

اس ہوائی اڈے پر کسی نے نعرہ نہ لگایا۔ کسی نے کوئی اُونچی بات نہ کی۔ خاموش دعائیں بمبار طیاروں کے دھوئیں کے ساتھ آسمان کی طرف جا رہی تھیں۔

جب طیارے "رن وے" کی طرف گئے تو ہوائی اڈے کے سٹیشن

کمانڈر نے ہاتھ ہلا کر انہیں خدا حافظ کہا۔ یہ ایک انوکھی سی بات تھی۔ روزمرہ کی پرواز پر جاتے کوئی کسی کو الوداع نہیں کہا کرتا لیکن اس روز بات کچھ اور تھی۔ سکواڈرن لیڈر شبّیر عالم صدیقی شہید نے وائرلیس پر ہنس کر کہا "بڑھے سٹیشن کمانڈر سے ہاتھ ہلا کر الوداع کہلانے کے لیے غالباً جنگ ضروری تھی"۔ صدیقی شہید خاصا خوش گفتار انسان تھا۔ اس کی باتوں میں مزاح کا رنگ غالب ہوتا تھا۔ وہ تاریخ کے ایک خطرناک ترین حملے پر جاتے بھی مذاق کے موڈ میں تھا۔ وائرلیس پر ایک دو لمحے اس کی ہنسی کی سِسں سِسں سنائی دیتی رہی پھر دو تین اور پائلٹ بھی وائرلیس میں ہنستے ہوئے سنائی دیتے۔ اس سے ہیجانی کیفیت اور اعصابی تناؤ میں خاصی کمی واقع ہو گئی۔

طیارے ایک دوسرے کے پیچھے "رن وے" پر آئے، تھراٹل کھلے، انجنوں نے دل دہلا دینے والا شور بلند کیا اور فارمیشن لیڈر کا طیارہ تیز دوڑتا، اور تیز، اور تیز، فضا میں بلند ہوا اور فضا کو چیرتا بمبئی کی سمت چھوٹا ہی چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے دوسرا اور اس کے پیچھے سکواڈرن لیڈر شبیر عالم صدیقی شہید کا بمبار غراتا، گرجتا، قہر و عتاب کے سیاہ آگ بگولے کی مانند فضا میں بلند ہو گیا اور اسی طرح چھ کے چھ طیارے فضا میں جا کے دُور ہوتے چلے گئے اور ذرا دیر بعد افق پر سیاہ دھبوں کی طرح نظر آنے لگے پھر یہ دھبے بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہوائی اڈے پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔ پیچھے رہنے والوں کے سینوں میں جو ہنگامے بپا تھے ان کی بھی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

بمبار طیارے خاصی کم بلندی پر اڑے جا رہے تھے تاکہ دشمن کے ریڈار کی نظروں سے بچے رہیں۔ کراچی کا ہنگامہ پرور شہر دُور پیچھے رہ گیا۔ نیچے سمندر اور چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے۔ شاہباز ان جزیروں پر کئی بار اڑتے رہے تھے لیکن ان پر ایسی کیفیت کبھی طاری نہیں ہوئی تھی جو اس روز طاری ہو رہی تھی۔ آج شاہبازوں کو یہ دلدلی جزیرے بہت ہی پیارے لگ رہے

تھے۔ آج وہ پہلی بار دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہے تھے کہ یہ جزیرے اور ان کے اردگرد پھیلا ہوا نیلا سمندر ان کے وطن کا حسن اور آبرو ہے جس کی خاطر وہ جان کی بازی لگا دیں گے۔ سمندر میں انہیں ماہی گیروں کی معصوم معصوم سی بادبانی کشتیاں بھی نظر آئیں جو چھ ستمبر کے روز بھی مچھلیاں پکڑنے نکل گئی تھیں۔ شاہبازوں کے لیے یہ ذرا ذرا سی کشتیاں آج عظیم اہمیت کی حامل ہو گئی تھیں۔ دور پرے پاک بحریہ کے جنگی جہاز ارض پاک کے دفاع کے لیے سمندر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی توپیں دشمن کے انتظار اور تلاش میں بے تاب ہیں۔ بڑی توپوں کے دہانے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان کے انداز میں قہر و غضب تھا۔

اور جس وقت یہ چھ شاہباز جام نگر پر بمباری کے لیے جا رہے تھے، سکواڈرن لیڈر حیدر کا سیبر سکواڈرن پٹھانکوٹ کے ہوائی اڈے کا صفایا کر رہا تھا۔ یہ پہلی ضربِ حیدری تھی جس نے بھارت کے مگ بیڑے کو زمین پر ہی بھسم کر دیا اور دشمن کے اس اڈے کو آئندہ کئی روز تک استعمال کے قابل نہ چھوڑا۔

ادھر چھ بمبار طیارے دشمن کے پر کاٹنے کے لیے جام نگر کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ وائرلیس خاموش تھے۔ کوئی شاہباز بات نہیں کر رہا تھا تاکہ دشمن کو بے خبری میں جا لیں۔ صرف نیوی گیٹروں کی آواز سنائی دی جو انتہائی ضروری تھی —"ہم دشمن کے علاقے میں داخل ہو رہے ہیں"—— طیارے زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ نیچے اب کوئی سمندر اور کوئی جزیرہ نہ تھا۔ طیارے آباد زمین پر اڑ رہے تھے۔ سڑکوں پر بسوں، بیل گاڑیوں، انسانوں اور مویشیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ بھارت کے ان فریب خوردہ عوام کو شاید علم ہی نہ تھا کہ ان کے ایک ہوائی اڈے پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے یا شاید انہیں حکمرانوں نے اس زعم میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ پاکستان کو ایک ہی وار میں تہ تیغ کر لیں

گے اور انہیں جوابی وار کرنے کے قابل ہی نہیں رہنے دیں گے۔ بہرحال سڑکوں پر بھارت کے لوگ اس تلخ حقیقت سے بے خبر بے دھڑک آ جا رہے تھے کہ ان کی فوج پاکستان کی سرحدوں پر کٹ رہی ہے اور ان کے حکمرانوں کا جنگی جنون انہیں بھوکا مارنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ کروڑوں، اربوں روپوں کا اسلحہ، طیارے، ٹینک، توپیں اور بھارت کی لاکھوں ماؤں کے ارمان، پاکستان پر حملہ کر کے پاکستانیوں کے ہاتھوں تباہ کرا رہا ہے۔

سورج ابھی ڈوبا نہیں تھا کہ شاہبازوں کو جام نگر کا ہوائی اڈہ نظر آنے لگا۔ شبیر عالم صدیقی شہید ہدایت کے مطابق طیارے کو حملے کی پوزیشن میں لے گیا۔ ہر ایک شاہباز کو ترتیب وار پوزیشن الاٹ کی گئی تھی۔ نیچے منظر اس قدر خوبصورت تھا کہ صدیقی شہید کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ وائرلیس پر خاموشی اختیار کیے رکھنی ہے۔ وہ وائرلیس پر بول پڑا —"بہت خوبصورت منظر ہے۔ ٹارگیٹ خوب نظر آ رہا ہے۔ ہم اسے تباہ کر لیں گے"۔

ٹارگیٹ کے قریب جا کر طیارے ایک دوسرے کے پیچھے تیروں کی طرح فضا میں بلند ہوئے۔ آگے فارمیشن لیڈر تھا۔ پیچھے ونگ کمانڈر سعید انصاری اور اس کے پیچھے شبیر عالم صدیقی شہید۔ لیڈر نے طیارے کو گھمایا اور اپنے ٹارگیٹ پر جانے لگا۔ نیچے سے طیارہ شکن گنوں نے آگ اگلنی شروع کر دی اور فضا میں ٹریسر ایمونیشن کی آتشیں لکیروں کا جال تن دیا۔ طیارہ شکن توپوں کے گولے فضا کے انچ انچ پر پھٹنے لگے۔ لیڈر نے نہایت اطمینان سے بم گرا دیے اور آگے نکل گیا۔ اس کے پیچھے ونگ کمانڈر انصاری نے اپنے ٹارگیٹ پر بم گرا دیے۔

شبیر عالم صدیقی شہید چونکہ پیچھے تھا اس لیے اسے ان دونوں کی بمباری نظر آ رہی تھی۔ اس نے حوصلہ افزا اور شگفتہ آواز میں کہا —"بم ٹھکانے پر جا رہے ہیں۔ نہایت صحیح بمباری ہے"—— اور وہ خود بم گرانے کے لیے اپنے ٹارگیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے بم بھی اپنے پہلے دو ساتھیوں کی طرح ٹھکانے

پر گرے۔ اس کے پیچھے تین اور بمبار تھے۔ طیارہ شکن مشین گنوں اور توپوں نے انہیں مار گرانے کی بہت کوشش کی لیکن شاہبازوں کی پرواز میں بال برابر لغزش نہ ہوئی۔ وہ پورے سکون، اطمینان اور حاضر دماغی سے ٹارگیٹ کو دیکھ کر بم گراتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد شاہبازوں کے طیارے بموں سے خالی ہو گئے۔ وہ دور اُوپر چلے گئے اور نیچے دیکھنے لگے۔ نیچے جہاں کا منظر ذرا دیر پہلے خوبصورت تھا اب سیاہ دھوئیں میں روپوش ہو چکا تھا۔ کوئی بھی نہ گن سکا کہ کتنی جگہوں سے دھواں اور شعلے اُٹھ رہے ہیں۔ دراصل جام نگر اس کیفیت میں زیادہ حسین لگتا تھا۔

دوارکا کے ریڈار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پاک فضائیہ کے شاہباز واپس ہوئے۔ انڈین ایئر فورس کے کسی اڈا کا سکواڈرن نے ان کا تعاقب نہ کیا۔ دشمن کا کوئی طیارہ فضا میں نظر نہ آیا۔ نظر کہاں سے آتا؟ جہاں سے انہیں اُڑنا تھا وہاں اب شعلے اور سیاہ گھٹائیں تھیں۔

پاک فضائیہ کے اڈے پر ابھی تک سکوت طاری تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ زمینی عملہ اور اڈے پر دوسرے لوگ کچھ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ کان آسمان کی آواز پہ لگائے ہوئے تھے اور ان کی نظریں اندھیرے پردوں کو چاک کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اتنے میں دُور سے کچھ ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی گنگناتا چلا آ رہا ہو۔ یہ مترنم سی آواز بلند ہوتی چلی گئی اور گونج بن گئی پھر ایک زناٹہ سنائی دیا۔ اس کے پیچھے دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا زناٹہ۔ اڈے پر ہڑبونگ مچ گئی۔ سینوں میں جو ہنگامے رُکے ہوئے تھے اُبل کر باہر آ گئے۔ فتح اور مسرت کا ایک غوغا تھا جس سے ہوائی اڈہ گونج اور گرج رہا تھا ــ "آ گئے۔ آ گئے ...... سارے آ گئے ــ پورے چھ ...... سارے بم گرا آئے"۔ شاہباز اور نیوی گیٹر کود کر طیارے سے اُترے اور کریو روم میں آ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگے ــ وہ جام نگر پر کاری ضرب

لگا آئے تھے۔

جام نگر ایک وسیع اور مضبوط اڈہ تھا جس پر مزید حملوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اسی روز فیصلہ کیا گیا کہ اب بمباروں کی فارمیشن بھیجنے کی بجائے اکیلا اکیلا بمبار جائے اور جام نگر پر بمباری کا تسلسل قائم رکھا جائے تاکہ یہ اڈہ بھارتیوں کے کام نہ آ سکے۔ اس فیصلے پر فوری طور پر یعنی اسی رات سے عمل درآمد کرنا تھا۔ جو چھ شاہباز اور نیوی گیٹر حملہ کر آئے تھے وہ اس طویل جنگی پرواز سے خاصے تھکے ہوئے تھے۔ اب تازہ دم شاہبازوں کو جانا تھا لیکن شبیر عالم صدیقی شہید پر جیسے تھکان کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ وہ اپنے بمبار طیارے کی طرف بھاگ اٹھا۔ طیارے میں دوبارہ بم لگ چکے تھے اور تیل پیٹرول بھی ڈالا جا چکا تھا۔ شبیر عالم شہید رات کی بمباری کے لیے ایک بار پھر جام نگر کی سمت اڑا جا رہا تھا۔ اب کے جام نگر کی فضا میں خطرات پہلے کی نسبت زیادہ تھے۔ پہلا حملہ دن کی روشنی میں کیا گیا تھا اور اب رات تھی۔ اس کے علاوہ اب دشمن کا چوکنا ہونا لازمی تھا۔

سکواڈرن لیڈر شبیر عالم صدیقی ان تمام دشواریوں اور خطرات کے باوجود کامیاب بمباری کر آیا۔ جب وہ واپس آ رہا تھا تو ایک اور بمبار جام نگر کی طرف جا رہا تھا۔ عالم صدیقی شہید کو اب یقیناً آرام کرنا چاہیے تھا لیکن اس پر سنجیدگی اور خاموشی طاری تھی۔ اس نے طیارے کے کریو سے کہا "بم لگا دو، تیل ڈالو، مجھے جلدی واپس جانا ہے" ــ اور وہ ایک بار پھر جام نگر کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا اور بم گرا کر آ گیا۔

صبح طلوع ہو رہی تھی۔ شبیر عالم صدیقی شہید اپریشن روم میں رات کی کارگزاری کی رپورٹ لکھ رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلائنگ سوٹ میں تھا۔ ونگ کمانڈر انصاری آ گئے۔ انہیں توقع تھی کہ صدیقی شہید رات کی پرواز کے بعد آرام کرنے چلا گیا ہوگا۔ لیکن اسے فلائنگ سوٹ میں دیکھا تو پوچھا "تم شاید پھر کہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں"، صدیقی شہید نے جواب دیا ——— "اپنے ٹارگیٹ پر جا رہا ہوں"۔

"تم بہت تھک گئے ہو گے صدیقی"! ونگ کمانڈر انصاری نے کہا "سکواڈرن میں ابھی ایسے پائلٹ ہیں جو ایک بار بھی اس مشن پر نہیں جا سکے۔ ذرا انہیں بھی موقع دو۔ اور تم ذرا آرام کر لو"۔

"میں تھکا تو نہیں"، شبیر عالم صدیقی نے مسکرا کر کہا "جو پائلٹ ابھی اس مشن پر نہیں گئے وہ نہ ہی جائیں تو اچھا ہے۔ میں اس ٹارگیٹ سے اور اس کے خطروں سے خوب آگاہ ہو گیا ہوں۔ مجھے ہی جانے دیں" ——— اور وہ جیپ میں بیٹھ کر اپنے طیاروں کی طرف چلا گیا۔ اس وقت اسے دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ وہ تھکن اور شب بیداری کے اثرات کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ نارمل نہیں۔

وہ چلا تو گیا لیکن دوسرے ہوا بازوں کا کہنا ہے کہ جب وہ جام نگر سے واپس آ رہے تھے اور شبیر عالم صدیقی شہید جام نگر کی طرف جا رہا تھا تو اس علاقے پر بادل جمع ہو رہے تھے جن کے متعلق یقین تھا کہ گھنے ہو کر جام نگر پر بھی پھیل جائیں گے۔ اور بمباری میں رکاوٹ بنیں گے بلکہ یہ خطرہ بھی تھا کہ ٹارگیٹ کو ہی چھپا لیں گے۔ اس قسم کے بادل بلند نہیں ہوا کرتے، اکثر زمین سے تھوڑی ہی بلندی پر رہتے ہیں۔

جام نگر مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ شاہبازوں نے باری باری جا کر دشمن کی طیارہ شکن گنوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جام نگر میں کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا چنانچہ بمباری روک دی گئی۔ تمام شاہباز اور نیوی گیٹر واپس آ کر ستانے چلے گئے تھے لیکن اڈے پر جہاں صدیقی کا طیارہ کھڑا ہوا کرتا تھا، وہ خانہ ابھی خالی تھا۔ اس کے طیارے کے گراؤنڈ کریو بے قراری سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسی بھی طیارے کی آواز سنائی دے، وہ اٹھ کر صدیقی شہید کے طیارے کے استقبال کو تیار ہو جاتے تھے۔ مگر صدیقی شہید کے طیارے کی آواز نہ سنائی دی

نہ اس کا طیارہ نظر آیا۔ ان میں سے کوئی بھی اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ سکواڈرن لیڈر شبیر عالم صدیقی شہید کبھی واپس نہ آئے گا۔

شاہبازوں کا خیال ہے کہ ٹارگیٹ پر بادل نیچے اور گہرے ہو گئے ہوں گے اور عالم صدیقی شہید جو ہر کام کو بالکل صحیح طریقے سے سرانجام دینے کا عادی اور خطرات سے منہ موڑنے کا عادی نہیں تھا، بادلوں کے نیچے چلا گیا ہو گا۔ اس قدر نیچے کہ اپنے ہی بموں کے پھٹنے سے اس کا طیارہ زد میں آ گیا ہو گا۔

سکواڈرن لیڈر شبیر عالم صدیقی فرض کی لگن اور حب الوطنی کے جنون میں شہید ہو گیا اور اپنے بمبار ونگ کے لیے جانبازی کا ایسا معیار قائم کر گیا جس کے تحت بمبار شاہبازوں نے بھارت کا کوئی ہوائی اڈہ سلامت نہ رہنے دیا۔

"ہندوستانیوں نے پاکستان کو ایک ہی تیز اور فیصلہ کُن حملے سے گھٹنوں بٹھا دینے کے مقصد کے تحت سیالکوٹ سے آگے نکلنے، لاہور پر قبضہ کرنے اور مغربی پاکستان کو دو حصوں میں کاٹنے کی کوشش کی۔ پاکستانی تعداد میں تین گنا کم تھے لیکن انہوں نے ہندوستانیوں کا حملہ روک کر بیکار کر دیا۔ وہ فائر بندی سے پہلے ہندوستانیوں پر حملہ کرنے والے تھے لیکن انہیں سیاسی وجوہ کی بنا پر روک دیا گیا۔"

ڈونلڈ سیمین
"ڈیلی ایکسپریس" لندن
۲۴ ستمبر ۱۹۶۵

بحری غازی، کھلے سمندروں میں

- انڈین نیوی کہاں تھی؟

ایک ہزار برس بعد ۷/۸ ستمبر ۶۵ء کی رات سومنات کی زمین ایک بار پھر دہل رہی تھی۔ اُس رات پاک بحریہ کے کموڈور ایس ایم انور (شیخ محمد انور) کے بحری بیڑے کے گولے سومنات سے چند میل دُور، دوارکا کی بنیادوں کے پتھر اُسی فضا میں بکھیر رہے تھے جہاں ایک ہزار برس پہلے محمود غزنوی کے نعرے گونجے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ محمود غزنوی نے خشکی کی راہ سے حملہ کیا تھا اور ایس ایم انور سمندر کی راہ بجلی بن کر لوٹا تھا۔ ایک ہزار برس پہلے ہندو راجوں مہاراجوں نے سومنات کے دفاع کے لیے سارا لاؤ لشکر جمع کر لیا تھا اور اسے قلعہ بندیوں سے محفوظ کر کے اعلان کیا تھا کہ اب ہم مسلمانوں کو سومنات کے گرد و نواح میں کاٹ ڈالیں گے لیکن کس کو کس نے کاٹ ڈالا؟ — اس سوال کا تفصیلی جواب تاریخ کا درخشندہ باب ہے۔

دوارکا کے دفاع کے متعلق بھی بھارتیوں کو بڑا ناز تھا۔ یہ بھارت کا ایک اہم ترین فوجی اڈہ تھا جہاں ہوائی حملوں کی قبل از وقت خبرداری کے لیے دُوربین اور طاقت ور ریڈار نصب تھا۔ اسی سے کراچی اور مغربی پاکستان کے اڈوں پر حملہ کرنے والے بھارتی طیّاروں کی راہنمائی ہوتی تھی۔ کراچی پر کینبرا طیاروں سے حملے کرانے کے لیے یہاں بہت زیادہ طاقت کے آلات HF/DE نصب تھے۔ اس کے علاوہ دوارکا کے قلعے میں گولہ بارُود اور جنگی ساز و سامان کا ذخیرہ بھی تھا اور قریب ہی تارپیڈو سکول بھی تھا۔

اس اہم اور خطرناک فوجی اڈے کی حفاظت کے لیے کاٹھیاواڑ کے ساحل پر ساحلی توپخانے کی بے شمار توپیں نصب تھیں اور فضائی تحفظ کے لیے جام نگر اور گرد و نواح میں چھوٹے چھوٹے تین ہوائی اڈوں پر انڈین آرمی کے بمبار طیاروں کے غول تیار رہتے تھے۔ ان تمام دفاعی انتظامات کے علاوہ انڈین نیوی کا پورا

بیڑا موجود تھا جس میں سب سے زیادہ خطرناک طیّارہ بردار بحری جہاز وکرانت بھی تھا جس کے عرشے پر اسّی (۸۰) لڑاکا بمبار طیّارے تھے۔ انڈین نیوی کے فریگیٹ (آبدوز شکن جنگی جہاز) بھی خلیج کچھ میں گشت کرتے رہتے تھے۔

۷/۸ ستمبر کی درمیانی شب کموڈور انور کے فلیگ شپ "بابر" سے پاک بحریہ کے تمام بحری جہازوں کو (جو سمندر میں دشمن کی تلاش میں پھیلے ہوئے تھے) دوارکا پر گولہ باری کے احکامات دیئے گئے۔ رات بارہ بج کر تیرہ منٹ پر تمام جہاز کاٹھیاواڑ کے ساحل سے ذرا دُور دوارکا پر گولہ باری کرنے کے لیے صحیح پوزیشنوں پر پہنچ چکے تھے۔ بارہ بج کر چھبیس منٹ پر انڈین ایئر فورس کا ایک لڑاکا طیّارہ کموڈور انور کے بیڑے کی ترتیب کے سب سے اگلے بحری جہاز "عالمگیر" پر حملے کے لیے آیا لیکن "عالمگیر" کے توپچیوں نے اُسے دوسرے حملے کے لیے غوطے سے اُٹھنے نہ دیا اور وہ جلتا ہوا (اپنے ہوا باز سمیت) سمندر کی نذر ہو گیا۔

یہ ایک طیّارہ بہت بڑے ہوائی حملے کا پیش خیمہ تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ دوارکا جیسے اہم اڈے کو بچانے کے لیے انڈین ایئر فورس کی پوری قوت سامنے نہ آتی۔ کموڈور انور نے دوارکا پر گولہ باری جاری رکھتے ہوئے اپنے بیڑے کی ترتیب کو ہوائی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے بدل ڈالا۔ اس دوران کاٹھیاواڑ کے ساحلی توپخانے کو ہمیشہ کے لیے خاموش کیا جا چکا تھا اور پاک بحریہ کے توپچی کمال خوبی سے دوارکا کا نام و نشان مٹا چکے تھے۔

دوارکا کے ریڈار سٹیشن اور دیگر فوجی ٹھکانوں کی تباہی ہمارے جہازوں کے ریڈاروں پر صاف نظر آ رہی تھی لیکن تباہی کا صحیح منظر بھارت کے ایک عینی شاہد نے بیان کیا ہے۔ وہ جام نگر کا دوکاندار ہے۔ اس کی بہن دوارکا میں رہا کرتی تھی جس کی خیریت معلوم کرنے وہ دوارکا گیا۔ اُس نے بتایا:

"پاک بحریہ کے پہلے گولوں سے قلعے کے اندر گولہ بارُود کا ذخیرہ اس قدر ہیبت ناک دھماکے سے پھٹا کہ شہر اور گرد و نواح کی آبادی میں

تو نفسا نفسی بپا ہوئی ہی تھی، شہری اور فوجی حکام کی بھگدڑ کا یہ عالم تھا کہ وہ نہ آگ بجھانے کے انتظامات کر سکے نہ انہوں نے کسی اور پہلو صورتِ حال پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ شاید بھاگ گئے تھے۔“

ایک اور بھارتی نے دوارکا کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال ان الفاظ میں بیان کیا ”گولوں کی پہلی بوچھاڑ میں ریڈار اور گولہ بارود کا ذخیرہ اُڑا تو فوجی بھاگنے لگے۔ دوسری بوچھاڑ نے قلعے کے اندر اور باہر کی فوجی عمارتوں کو بنیادوں تک اُڑا دیا۔ اس کے بعد کھنڈر رہ گئے جو مسلسل گولہ باری سے زمین سے ہل گئے اور اب ہر طرف ملبہ اڑ رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن کا بھی یہی حال تھا اور ریلوے لائن تین جگہوں سے بالکل ہی اُڑ گئی۔

دوارکا کی تباہی بہت بڑی جنگی کامیابی تھی لیکن دوسری کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ گجرات، کاٹھیاواڑ، جام نگر اور بمبئی تک کی شہری آبادی پر دہشت طاری ہو گئی اور لوگ محفوظ مقامات کی طرف بھاگنے لگے۔ انڈین آرمی، انڈین ایئر فورس اور انڈین نیوی کو شہریوں کا جو تعاون حاصل تھا وہ ختم ہو گیا۔ کاٹھیاواڑ کے ساحلی توپخانے پر لوگوں کو جو اعتماد تھا وہ ایسا اٹھا کہ لوگ اپنے فوجیوں کو راہ میں روک لیتے تھے اور طنزیہ لہجے میں پوچھتے تھے ”تمہاری نیوی اور ایئر فورس کہاں ہے؟“

جب کموڈور انور کے بحری غازی دوارکا کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے تھے اُس وقت پاک بحریہ کی آبدوز ”غازی“ بمبئی کی بندرگاہ کے سامنے (سمندر کے نیچے) کھڑی رہی۔ ”غازی“ کے جری کمانڈر نیازی کی نظر بھارت کے بڑے جنگی بحری جہازوں ”میسور“ اور ”رنجیت“ پر تھی۔ اُسے توقع تھی کہ بھارت کی بحری قوت دوارکا کو بچانے کے لیے بمبئی کی بندرگاہ سے ضرور نکلے گی۔ وہ اُسے ”غازی“ سے وہیں معرکے میں اُلجھا لینے کے لیے تیار تھا۔ لیکن بمبئی کی بندرگاہ میں کوئی حرکت نہ ہوئی حالانکہ اس بندرگاہ میں آبدوز شکن بحری جہاز

(فریگیٹ) موجود تھے۔ اور یہ ثبوت بھی مل گیا ہے کہ جب دوارکا تباہ ہو رہا تھا، انڈین نیوی کے چار فریگیٹ قریب ہی موجود تھے۔ لیکن وہ چپکے سے تاریکی میں چھپتے چھپاتے خلیج کچھ کے کم گہرے پانی میں جا دبکے اور پاک بحریہ کے چلے جانے تک وہیں دبکے رہے۔

جب کموڈور انور کا بیڑہ دوارکا کو مکمل طور پر ختم کرنے کے بعد سمندر میں اپنی پوزیشنوں کی طرف جانے لگا تو انڈین ایئر فورس بیدار ہو گئی اور اس قدر طیارے پاک بحریہ کے جہازوں پر بمباری کرنے لگے جنہیں گنا بھی نہ جا سکا۔ بعض وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ پاک بحریہ کی خوش قسمتی تھی کہ جب دشمن کے طیارے آئے تو آسمان پر گہرے بادل چھا گئے لیکن یہ خوش قسمتی دراصل دشمن کے طیاروں کی تھی کہ وہ گہرے بادلوں کی وجہ سے پاک بحریہ کے طیارہ شکن توپچیوں کی زد سے بچ کر نکل گئے۔ بادل بھارتی طیاروں کے لیے سیاہ پردہ بن گئے تھے۔ اسی پردے میں سے پاک بحریہ کے توپچیوں نے دو طیارے گرا لیے۔ جب انڈین ایئر فورس کے یہ طیارے ناکام حملہ کر کے جام نگر کے اڈے پر واپس گئے تو وہاں کے رن وے، تباہ ہو چکے تھے کیونکہ دوارکا کی تباہی کے فوراً بعد پاک فضائیہ کے بمبار جام نگر کو تباہ کر گئے تھے۔ یہ بھارتی ہواباز خوش قسمت تھے کہ وہ سمندر پر اُڑ رہے تھے اور پاک شاہبازوں کی بمباری سے بچ گئے۔ انہوں نے جام نگر کی بجائے ایک قریبی عارضی ہوائی اڈے پر طیارے اتارے۔

اب توقع تھی کہ انڈین نیوی دوارکا کا انتقام لینے کے لیے سامنے آئے گی لیکن یہ معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا کہ جو نیوی اپنے آپ کو برطانوی بحریہ کے ہم پلہ سمجھتی تھی کیوں نامعلوم بندرگاہوں میں دبکی رہی، یوں تو پاک بحریہ کا ہر غازی انڈین نیوی کے ساتھ کھلے سمندروں میں معرکہ لڑنے کو بیتاب تھا لیکن سب سے زیادہ ہیجانی کیفیت آبدوز ”غازی“ کے کمانڈر نیازی کی تھی۔ اُسے انڈین نیوی کے طیارہ بردار ”وکرانت“ اور دو تین بڑے جنگی جہازوں کو تباہ کرنے کا

کام سونپا گیا تھا لیکن یہ تینوں جہاز "مرمت گودیوں" میں بھیج دیئے گئے تھے۔ آخر کمانڈر نیازی نے تنگ آ کر کموڈور انور سے درخواست کی کہ اس کا شکار سامنے نہیں آ رہا اس لیے اسے اپنی مرضی سے اپنے لیے کوئی اور ٹارگیٹ تلاش کرلے کی اجازت دی جائے۔ اُسے اجازت دے دی گئی۔

کمانڈر نیازی دشمن کے سمندروں میں جا کر اُس کے طیارہ بردار بحری جہاز "وکرانت"، اور اُس کے سب سے بڑے جنگی جہازوں "میسور"، "رانا" اور "رنجیت" کو ڈھونڈتا رہا۔ اس تلاش میں کمانڈر نیازی کئی بار بمبئی کی بندرگاہ تک گیا۔ یہاں تک کہ اُس نے مسلسل تین دن آبدوز کو بمبئی کی بندرگاہ کے سامنے رکھا مگر دشمن سامنے نہ آیا۔ ۱۲/۱۳ ستمبر کی درمیانی رات کاٹھیاواڑ کے ساحل سے ذرا دور کمانڈر نیازی کو دشمن کے چار جنگی جہاز نظر آئے۔ نیازی ان سے ٹکر لینے کے لیے بڑھا لیکن چاروں جہاز آبدوز سے ٹکر لینے کی بجائے کھسک گئے۔ ان میں سے ایک کو "غازی" نے زد میں لینے کی کوشش کی لیکن وہ راستہ بدل کر انتہائی رفتار سے نکل گیا حالانکہ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سمندر کی گہرائی آبدوز کے لیے کافی نہیں تھی۔ آبدوز کے لیے اس گہرائی میں لڑنا اپنے آپ کو چار جہازوں کے حوالے کرنے والی بات تھی لیکن کمانڈر نیازی وہاں بھی لڑنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

جنگ ختم ہوئی جا رہی تھی اور انڈین نیوی سامنے نہیں آ رہی تھی۔ آخر ۲۲ ستمبر کے پچھلے پہر انڈین نیوی کے چار فریگیٹ کاٹھیاواڑ کے ساحل کے قریب گشت کرتے نظر آئے۔ "غازی" نے انہیں دیکھ لیا اور اکیلے ہی ان سے معرکہ لڑنے کے لیے پوزیشن لینے لگی۔ ایک فریگیٹ چکر کاٹ کر جب واپسی کے لیے گھوما تو کمانڈر نیازی نے اسے شِست میں لے لیا اور تارپیڈو فائر کر دیئے جو ٹھیک نشانے پہ لگے اور انڈین نیوی ایک آبدوز شکن جنگی جہاز سے محروم ہو گئی۔ باقی تین فریگیٹوں نے "غازی" کو گھیرے میں لے لیا۔ اور انڈین ایئر فورس کے طیاروں کو بھی بلا لیا۔ فضا سے آبدوز سمندر کی گہرائی میں بھی نظر آ جاتی ہے۔ اب کمانڈر

نیازی دشمن کے تین آبدوز شکن جنگی جہازوں اور لڑاکا بمبار طیاروں سے اکیلا لڑ رہا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا اور تقریباً ساڑھے آٹھ بجے "غازی" انڈین نیوی اور ایئر فورس کو جُل دے کر نکل آئی۔

بھارتیوں نے پہلے تو یہ اعلان کیا کہ پاک بحریہ نے انڈین نیوی کا کوئی جہاز نہیں ڈبویا لیکن دنیا اندھی نہیں تھی۔ "غازی" کے تباہ کیے ہوئے جہاز کے کپتان کا آخری بے تار برقی پیغام غیر ملکی بحری جہازوں نے بھی سنا تھا۔ چنانچہ دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بھارتیوں نے طفلانہ جھوٹ نشر کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ پاک بحریہ کی آبدوز نے جو جہاز تباہ کیا ہے وہ ایران کی نیوی کا تھا۔

پاک بحریہ کے معرکوں کی تفصیلی داستان پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن یہ سوال مؤرخوں کو پریشان کر رہا ہے کہ انڈین نیوی پاک بحریہ کے مقابلے میں کیوں نہیں آئی تھی؟ ذرا انڈین نیوی کی قوت ملاحظہ فرمائیے۔

	بھارت	پاکستان
طیارہ بردار بحری جہاز	۱	×
طیارہ بردار جہاز پر لڑاکا طیارے (دستی)	۸۰	×
مائن سویپر (بارودی سرنگیں صاف کرنے والے)	۷	۸
تباہ کن جہاز اور فریگیٹ (آبدوز شکن)	۲۱	۶
بڑے جنگی جہاز	۲	۱
متفرق جنگی جہاز	۱۶	×
فلیٹ ٹینکر	۱	۱
آبدوز	×	۱

بھارت اپنی اس بے پناہ بحری قوت کی نمائش ۱۹۶۴ء سے کرتا پھر رہا تھا۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں انڈین نیوی نے بمبئی اور کوچین کے ساحلوں سے پرے پاکستان کو فرضی نشانہ بنا کر جنگی مشقیں کی تھیں۔ اس کے بعد بھارت نے اپنی

تمام بحری قوت کی نمائش طیارہ بردار جہاز "وکرانت" کی قیادت میں خلیج فارس تک کی تھی جس کا مطلب صرف یہ تھا کہ پاکستان کے دوست ممالک اس بے پناہ قوت کو دیکھ سکیں۔ اس نمائش کو بھارت نے "خیر سگالی دورے" کا نام دیا تھا۔ اسی سال انڈین نیوی نے خلیج کچھ کے قریب جنگی مشق کی تھی جس میں "وکرانت" کے طیاروں نے بھی فائرنگ کی تھی۔ اس مشق میں آبدوز شکن فریگیٹوں کو بھی اصلی فائرنگ سے مشق کرائی گئی تھی۔ اس جنگی مشق کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ انڈین نیوی کا ٹارگیٹ پاکستان ہے اور حملے کا مقام رن کچھ کا علاقہ ہے۔

ان مشقوں کا سلسلہ رن کچھ پر باقاعدہ حملے کے وقت تک چلتا رہا تھا۔ اب بھارتی حکمران اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتے کہ رن کچھ پر ان کا حملہ محض رن کچھ کے تنازعے کی کڑی نہیں تھی، بلکہ انڈین آرمی کو "یہ ٹاسک" دیا گیا تھا کہ رن کچھ کی راہ حیدر آباد محاذ تک پہنچے اور پاکستان کو دو حصوں میں کاٹ دے لیکن پاک فوج نے جس سرفروشانہ انداز سے حملہ روکا وہ بھارت کے جنگ پسند حکمرانوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ رن کچھ پر حملے کے دوران بھارت کا طیارہ بردار "وکرانت" رن کچھ کے ساحل پر گشت کرتا دیکھا بھی گیا تھا۔ رن کچھ میں شکست کھا کر شاستری نے برملا کہہ دیا تھا کہ ——"ہم اپنی مرضی کا محاذ کھولیں گے"۔

جولائی اور اگست ۱۹۶۵ء کے مہینوں میں انڈین نیوی نے برطانوی نیوی کے ساتھ مشرقی پاکستان کے قریب جنگی مشقیں کی تھیں۔ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات کلکتے میں ان مشقوں کے اختتامیہ کی تقریب منائی جا رہی تھی کہ انڈین نیوی کے فلیگ آفیسر کمانڈنگ کو فوراً بمبئی پہنچنے کا حکم ملا کیونکہ آزاد کشمیر اور پاک فوج نے چھمب پر دفاعی حملہ کر دیا تھا۔ "وکرانت" کوچین کی بندرگاہ میں تھا اسے بھی فوراً بمبئی بھیج دیا گیا۔ چھ ستمبر ۶۵ء کو انڈین نیوی کے ہیڈکوارٹر کو صبح دس بج کر پچیس منٹ پر ہائی کمانڈ سے یہ پیغام ملا ——"پاکستان کے

ساتھ جنگ شروع ہو گئی ہے"—— ادھر پاک بحریہ کے تمام جنگی جہاز صبح ساڑھے سات بجے تک کراچی سے نکل کر کموڈور انور کی قیادت میں کھلے سمندر میں چلے گئے (اور فائر بندی تک سمندر میں رہے) پاک بحریہ نے نہ صرف اپنے ساحل کا دفاع کیا بلکہ دوارکا جیسے اہم اڈے کو تباہ کیا اور "غازی" نے بھی کاری ضرب لگائی۔ اس کے علاوہ کموڈور انور نے سب سے بڑا کمال یہ کیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے سمندری راستے کو اس طرح حفاظت میں رکھا کہ مرچنٹ نیوی (پرائیویٹ کمپنیوں کے جہاز) حسب معمول اس راستے پر چلتے رہے۔ گو انہیں ذرا طویل راستہ اختیار کرنا پڑا لیکن پاک بحریہ کے غازیوں نے انہیں بھارتی خطرے سے بالکل محفوظ رکھا۔

لیکن اس سوال کا جواب بالکل ہی واضح نہیں کہ انڈین نیوی جس کی قوت پاک بحریہ سے دس گنا زیادہ تھی اور اس کے پاس اسی (۸۰) طیاروں کا طیارہ بردار جہاز تھا، محفوظ بندرگاہوں میں کیوں دبکی رہی؟ بھارت میں سرکاری جنگی ماہرین عوام اور حزب مخالف کو مطمئن کرنے کے لیے ابھی تک مختلف النوع تاویلیں پیش کر رہے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ہم پاکستان کو بری اور فضائی فوج سے فتح کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انڈین نیوی کسی کام نہیں آ سکتی تھی کیونکہ دریائے سندھ میں جنگی جہاز جا نہیں سکتے تھے"—— لیکن جو بھارتی صاف گو واقع ہوئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جو حشر انڈین آرمی اور انڈین ایئر فورس کا ہوا تھا، اپنے حکمران وہی حال اپنی نیوی کا نہیں کرانا چاہتے تھے کیونکہ نیوی بہت قیمتی تھی۔

لیکن ۲۹ ستمبر کو انڈین نیوی کے کمانڈر انچیف کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا —— کیوں؟ —— صرف اس لیے کہ وہ اپنی اس قدر طاقتور نیوی کو جسے برطانوی نیوی نے بڑی جانفشانی سے دو مہینوں تک جنگی مشقیں کرائی تھیں پاک بحریہ کے خلاف سمندر میں نہ اتار سکا تھا اور پاک بحریہ کے چند ایک جہازوں کو اپنے سمندر سے بے دخل نہ کر سکا تھا۔

اب بھارتی حکمران خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہتے پھریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاک بحریہ کموڈور ایس، ایم، انور کی قیادت میں کھلے سمندروں میں جاکر دہشت بن گئی تھی اور دوارکا کی تباہی ایسا وار تھا جسے انڈین نیوی سہہ نہ سکی۔

فائر بندی سے چند روز بعد کموڈور انور سے سرِراہے ملاقات ہوگئی تو میں نے ان سے صرف اتنی سی بات پوچھی کہ وہ کون سا جذبہ تھا جس سے آپ نے اپنے سے دس گنا طاقت ور نیوی کو بندرگاہوں میں دبکے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انور صاحب نے ذرا سوچ کر کہا "میں سمندر میں تھا تو مجھے اطلاع ملی کہ کراچی ڈاک یارڈ پر بمباری ہوئی ہے۔ اس وقت میرے بچے ڈاک یارڈ کے کوارٹر میں تھے۔ مجھے معاً اپنے بچوں کا خیال آیا لیکن مجھے فوراً یاد آگیا کہ میں صرف اپنے بچوں کے لیے نہیں بلکہ دس کروڑ پاکستانیوں کے لیے لڑ رہا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دس کروڑ بچے اور بچیاں ہیں اور اللہ کی ذات کے بعد ان کا محافظ میں ہوں اور میرے بحری غازی۔ اس احساس نے ایسی قوت عطا کی کہ میں دشمن کی طاقت کو بھول گیا"

"اس کے علاوہ ....." کموڈور انور نے کہا "مجھے قائدِاعظمؒ کا ایک فرمان یاد تھا انہوں نے ۲۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو پاک بحریہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"آپ کو اپنی بحری قوت کی کمی کو حوصلے اور ایثار سے پورا کرنا ہوگا۔ محض جینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ زندگی وہ ہے جو ہمت و استقلال، عزم اور ایثار سے بھرپور ہو" کموڈور انور نے کہا "میں کھلے سمندروں میں اپنے محبوب قائدِاعظمؒ کی روح کے سامنے جوابدہ تھا۔ مجھے اپنی قوت کی کمی کو جذبۂ ایثار سے پورا کرنا تھا چنانچہ میں نے کم سے کم قوت سے زیادہ سے زیادہ کام لیا۔ میں اللہ تعالیٰ کا سو بار شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے فہم و فراست عطا کی اور مجھے پاکستان کے دفاع کے قابل بنایا۔ میں ہر لمحہ خدا سے ایک ہی التجا کرتا تھا کہ یارب العزت! میں کوئی ایسا غلط فیصلہ نہ کر بیٹھوں جس کے نتیجے میں میرے بحری غازیوں کی

جانیں ضائع ہوجائیں۔ اللہ کا احسان ہے کہ میرا مشن کامیاب رہا اور میرا کوئی غازی زخمی نہیں ہوا"

"پاکستانی بہادر لوگ ہیں۔ بے خوف پاکستانیوں اور بزدل ہندوستانیوں کو
دیکھ کر پروپیگنڈے کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔"

پیٹر پریسٹن
"گارڈین" لندن
۴ر اکتوبر ۱۹۶۵

جگو جوان ہو گیا ہے

یہ کہانی مجھے پاک فوج کے ایک صوبیدار
نے سنائی تھی اور کہا تھا کہ اس کا اور اس
کے بیٹے کا نام شائع نہ کیا جائے تحریر
میری ہے ___ جنگ ستمبر کی وہ تمام
واقعاتی کہانیاں جو میں اب تک لکھ
چکا ہوں ان میں مجھے یہی سب سے
زیادہ پسند ہے۔ ذرا جذبات اور
واقعات ملاحظہ فرمایئے۔

بچے جب بچوں والے ہو جاتے ہیں تو بھی ماں باپ انہیں بچہ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ میرا بیٹا لیفٹیننٹ ہو گیا تھا لیکن میری نظر میں وہ بچہ تھا جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ جب تک میں ساتھ نہ ہوں گا وہ اچھی طرح چل بھی نہیں سکے گا۔ فوج میں افسر کو "سر" کہتے ہیں لیکن میں اپنے لیفٹیننٹ بیٹے کو جگو کہا کرتا تھا۔ چار بیٹیوں میں وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ ایک سال کا تھا تو میری بیوی فوت ہو گئی۔ میں اس وقت حوالدار تھا۔ میری سب سے بڑی بیٹی گیارہ سال کی تھی۔ وہ بچے کو سنبھالنے کے قابل نہیں تھی۔ جنگ عظیم کے آخری دن تھے۔ میں نے اپنی پلٹن کے کمانڈنگ آفیسر سے عرض کی کہ میری بیوی مر گئی ہے اور بچے بہت چھوٹے ہیں اس لیے مجھے ٹریننگ سنٹر میں بھیجا جائے تاکہ میں بچوں کو اپنے ساتھ رکھ سکوں۔ میری پلٹن برما میں لڑ رہی تھی۔ انگریز کمانڈنگ آفیسر نے مجھے فوراً ٹریننگ سنٹر میں بھیج دیا۔ وہاں مجھے فیملی کوارٹر مل گیا اور میں اپنے بچوں کو وہاں لے گیا۔

ننھا جگو ماں کے بغیر بہت روتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ مجھے غیر سمجھ کر مجھ سے دور رہتا تھا۔ جب میں اسے ہر روز اٹھا کر چھاؤنی کے بازار لے جانے لگا اور دو تین کھلونے بھی لے دیئے تو وہ میرا دوست بن گیا۔ وہ میرا کھلونا تھا۔ میں دن بھر ان پڑھ اور اجڈ رنگروٹوں کے ساتھ جھک جھک کر کے تھکا ماندہ گھر آتا تھا تو جگو مجھے دیکھ کر پہلے تو زور سے ہنستا اور تالیاں پیٹتا تھا پھر سرپٹ دوڑتا میری ٹانگوں کے ساتھ لپٹ جایا کرتا تھا۔ سارے دن کی تکان دور ہو جاتی تھی۔ اسے میرے ساتھ کھانا کھانے کی عادت ہو گئی تھی۔ میں اسے دودھ پلانے کی کوشش کرتا تھا لیکن وہ میرے ساتھ روٹی کھایا کرتا تھا۔

ہر شام وہ میرے ساتھ بازار جایا کرتا تھا۔ میں اسے اٹھا کے لے جاتا تھا۔ ایک شام میں نے اسے کہہ دیا کہ جگو، تم بہت موٹے ہو گئے ہو۔ اب تو تمہیں اٹھا کر میں چل بھی نہیں سکتا۔ جگو نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا پھر وہ میرے بازو سے نیچے کو سرکنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چلنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اتار دیا تو وہ میری انگلی پکڑ کر چلنے لگا۔ ذرا آگے جا کر میں اسے اٹھانے لگا تو اس نے کہا — "نہیں ..... چلوں گا" اور وہ ہنس پڑا۔ اس نے میری انگلی مضبوطی سے پکڑ لی۔ واپسی پر میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو وہ مسکرا کر پرے ہٹ گیا۔ وہ چلنا چاہتا تھا۔ میں آگے آگے چل پڑا تو وہ دوڑ کر میرے ساتھ ہو گیا اور کہنے لگا — "ابو، ہاتھ" — میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے میری انگلی پکڑ لی۔

گھر آ کر اس نے توتلی زبان میں اپنی بہنوں کو سارا ماجرا سنایا۔ وہ بہت تیز بول رہا تھا۔ بچیوں کو کچھ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ کہہ رہا ہے کہ اب میں موٹا ہو گیا ہوں۔ ابو مجھے اٹھا نہیں سکتے۔ میں آج پیدل چلا تھا اور اب ہر روز ابو کا ہاتھ پکڑ کر پیدل چلوں گا۔ اس نے میرے ساتھ کھانا کھایا اور سو گیا۔ وہ سوتا میرے ساتھ تھا۔ میں جب اس کے پاس لیٹا تو اس نے سوتے میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ شاید خواب میں میرا ہاتھ تھامے گھوم پھر رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہ چھڑایا۔ تھوڑی دیر بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔

ریوالی کے بگل بجے تو میں جاگ اٹھا۔ دیکھا کہ میرا ہاتھ ابھی تک جگو کے ہاتھ میں تھا۔ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ میں نے نہایت آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا تو وہ جاگ اٹھا۔ وہ اتنی جلدی جاگنے کا عادی نہیں تھا۔ میں نے اسے تھپکیاں دیں کہ وہ سو جائے لیکن وہ نہ سویا۔ میری بچیاں چھوٹی تھیں۔ اس لیے میں انہیں اتنی سویرے

نہیں جگایا کرتا تھا۔ میں ان کے لیے پراٹھے اور چائے پکا دیا کرتا تھا اور
پریڈ کے لیے جب کوارٹر سے نکلنے لگتا تھا تو انہیں جگایا کرتا تھا۔ جگو سب
سے بعد میں جاگتا تھا اور بڑی بچی اسے دودھ پلایا کرتی تھی۔ اس روز وہ
میرے ساتھ جاگ اٹھا تو میں نے پہلے اسے دودھ پلایا پھر ناشتہ تیار کیا۔
میں نے نہا کر ناشتہ کیا اور وردی پہن لی۔ تیار ہو کر بچوں کو ناشتے کے لیے
جگایا اور جب باہر نکلنے لگا تو جگو بھی میرے ساتھ چل پڑا۔ میں نے اسے روکا
تو اس نے توتلی اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں مجھے سمجھا دیا کہ وہ تھوڑی دُور
تک میرے ساتھ جانا چاہتا ہے۔

میں نے اسے ساتھ لے لیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ راستے میں جانے
کیا کیا باتیں سناتا اور پوچھتا رہا۔ بیس پچیس قدم دُور جا کر میں نے اسے کہا
کہ جگو بچے تم اب گھر چلے جاؤ۔ وہ رُک گیا لیکن اس نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا۔ میں
نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ جاؤ نا بیٹا، میں جلدی آجاؤں گا۔ اس نے
میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں چلا گیا۔ ذرا آگے جا کر پیچھے کو دیکھا تو وہ گھر کی طرف
دوڑتا جا رہا تھا۔

شام کے وقت وہ مجھے بازار لے گیا۔ میں اسے اٹھا لینے کے لیے ایک
بار جھکا تو وہ سکڑ گیا۔ کہنے لگا کہ چلوں گا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بازار تک
چلتا گیا۔ واپسی پر میں نے اسے اس کی مرضی کے خلاف اٹھا لیا۔ وہ بہت چھوٹا
تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ تھک جائے گا۔

جب مسلمانوں نے پاکستان کا نعرہ لگایا تو پلٹن کے ہندو اور سکھ افسروں
نے انگریز افسروں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ انگریز افسروں
نے مسلمان افسروں اور جوانوں کو شک اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھنا شروع
کر دیا۔ ہمیں اکثر دھمکیاں دی جاتی تھیں کہ اگر کوئی مسلمان سپاہی مسلم لیگ
کے جلوس یا جلسے میں پکڑا گیا تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ بعض ہندو

ہم سے مذاق بھی کرتے تھے اور قائداعظمؒ کے خلاف ناقابلِ برداشت
بکواس کرتے تھے۔

خدا نے اپنے رسولؐ کی اُمت پر کرم کیا اور اسی ملک میں اسلام کا
جھنڈا بلند ہو گیا۔ ٹریننگ سنٹر میں ہم جتنے مسلمان افسر، سردار، عہدیدار اور
جوان تھے پاکستان کے لیے روانہ ہونے لگے تو ہندو اور سکھ ہمیں گلے لگا کر
ملے لیکن ان کے دلوں میں کھوٹ تھی۔ مجھے آٹھ ہندو اور تین سکھ حوالداروں
نے کہا کہ یار کیوں سروس تباہ کر رہے ہو۔ یہ پاکستان دو دن کا کھیل ہے۔ یہیں
رہ جاؤ۔ سچی بات ہے کہ دل میں اسلامی جذبہ تو بہت تھا جس کی وجہ سے
پاکستان کا نام اچھا لگتا تھا لیکن دل میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ آرمی میں ایک
نئی پلٹن کھڑی کرنے میں کتنی مشکل پیش آتی ہے۔ ایک نیا ملک اور اس کی
پوری کی پوری فوج کو باقاعدہ آرمی بنانا تو بہت ہی مشکل ہوگا۔ دل میں تھوڑا
سا شک پیدا ہو گیا تھا۔

ہمارا ایک مسلمان کپتان ہوا کرتا تھا۔ اس نے سارے شکوک دُور کر دیئے۔
وہ اس طرح کہ جب ہم سب مسلمان اکٹھے ہوئے تو ایک سکھ میجر نے جو سنٹر میں
ٹریننگ میجر تھا، کہنے لگا ”مسلمانو، ہماری ملاقات بہت جلدی ہوگی اور
اسی ٹریننگ سنٹر میں ہوگی۔ پاکستان میں جا کر بستر نہ کھولنا۔ تم اسی طرح
واپس آجاؤ گے۔“

مسلمان کپتان (کیپٹن حنیف) نے بلند آواز میں کہا۔

”میجر ملکھا سنگھ صاحب! ہماری ملاقات بہت جلدی ہوگی لیکن
اس سنٹر میں نہیں بیٹل فیلڈ BATTLE FIELD میں ہوگی۔“

میجر ملکھا سنگھ نے بہت زور کا قہقہہ لگایا اور کہنے لگا ”واہ اوئے
کاکا۔ توں خالصیاں دے مقابلے وچ آئیں گا؟“ —— (واہ بچے! تم سکھوں
کے مقابلے میں آؤ گے؟)

کیپٹن حنیف تو خاموش رہا لیکن ہوشیار پور کا رہنے والا نائک عابد علی

کود کر میدان میں جا کھڑا ہوا اور للکار کر بولا "آؤ کوئی کافر بیونٹ فائٹ (سنگین بازی) کے لیے سامنے آجائے۔ یہیں فیصلہ کر لیتے ہیں۔"
کافروں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ نائک عابد علی نے کہا — "دو دو کافر آجاؤ۔ اکیلا لڑوں گا۔ تم چودہ انچ کے بیونٹ سے لڑو، میں رائفل سے چھوٹا بیونٹ لگاؤں گا۔" (رائفلوں کے ساتھ جنگ سے پہلے لمبے بیونٹ ہوا کرتے تھے۔ جنگِ عظیم کے دوران بہت چھوٹے بیونٹ آگئے تھے جو سلاخ کی قسم کے تھے)۔

مسلمانوں نے نعرۂ حیدری سے سنٹر کی بارکوں کو ہلا دیا۔ جب ہم ریلوے سٹیشن کے لیے وہاں سے چل پڑے تو پیچھے سے ہمیں کئی آوازیں سنائی دیں "مسلمانو! فیلڈ میں ملاقات ہو گی۔"

اُس وقت میرا جگو ساڑھے چار سال کا تھا۔ گاڑی میں میرے بچے میرے قریب بیٹھے ہوتے تھے۔ جگو کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور اس نے عادت کے مطابق میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اب بڑا ہو گیا تھا پھر بھی اس کی یہ عادت پکی ہو گئی تھی کہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلتا تھا اور میں پاس بیٹھوں تو میرے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر میری انگلیوں کو ایک دوسری کے اوپر چڑھاتا رہتا تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے اسے بہت غور سے دیکھا اور سوچا کہ ہو سکتا ہے فیلڈ میں میری جگہ میرا جگو کافر سے ملاقات کرے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اچھی تعلیم دلاؤں گا اور فوج میں کمشن کے لیے بھیجوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا "جگو فوج میں لیفٹیننٹ بنو گے؟" — اس نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا — "ہاں اُبّو، میں رفل چلاؤں گا۔ پستول چلاؤں گا۔ توپ چلاؤں گا۔ ٹینک چلاؤں گا۔ ہوائی جہاز چلاؤں گا اور ....."
اسے کسی اور ہتھیار کا نام یاد نہ آیا تو کہنے لگا — "اور میں تین پہیوں کی سائیکل چلاؤں گا۔"

پاکستان میں پہنچے تو ننہال والوں نے لکھا کہ بچوں کو ان کے پاس بھیج دوں لیکن میں بچوں کو اپنے آپ سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان معصوموں کی خاطر میں نے دوسری شادی کی نہیں سوچی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی خیال آتا تھا کہ بچوں کو تھوڑے دنوں کے لیے گاؤں بھیج دوں تو فوراً یہ خیال بھی آجاتا تھا کہ جگو ہاتھ کس کا پکڑ کر چلے اور کھیلے گا؟
جگو کو سکول میں داخل کرانے کا وقت آگیا۔ وہ شوق سے داخل ہو گیا۔ میں اسے صبح سکول تک چھوڑنے کے لیے نہیں جا سکتا تھا کیونکہ مجھے علی الصبح اپنی ڈیوٹی پہ جانا ہوتا تھا۔ چھٹی کے وقت میں اسے سکول سے لے آتا تھا اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھر تک آتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ مجھے یہاں بھی ٹریننگ سنٹر میں بھیج دیا گیا۔ جگو نہ صرف پڑھنے میں تیز نکلا بلکہ کھیل کود میں بھی نام پیدا کرنے لگا۔ اس نے پرائمری جماعت پاس کر لی اور پانچویں جماعت میں پہنچ گیا۔ اس کی یہ عادت اور زیادہ پکی ہو گئی کہ میں اسے سکول سے لانے کے لیے جاتا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھر تک آتا۔ شام کو مجھے باہر ضرور لے جاتا اور میرا ہاتھ پکڑ کر چلتا۔ بلکہ میری بھی یہ عادت ہو گئی تھی کہ وہ میرا ہاتھ پکڑنا بھول جائے تو میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال پکا ہو گیا تھا کہ جگو میرا ہاتھ پکڑے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔
مجھے ترقی مل گئی اور میں نائب صوبیدار ہو گیا۔ اس وقت جگو ساتویں جماعت میں تھا۔ میں نے بڑی بچی کی شادی گاؤں میں برادری کے ایک گھرانے میں کر دی۔ دوسری بچیاں بھی اب بڑی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے مل جل کر گھر کو اچھی طرح سنبھال رکھا تھا۔

پھر خدا نے مجھے وہ وقت دکھایا کہ میرے جگو نے میٹرک پاس کر لی۔ اس وقت تک وہ ہاکی کا نامور کھلاڑی بن چکا تھا۔ میں اس وقت پاکستان آرمی کی ایک یونٹ میں تھا۔ چھاؤنی میں ہماری بٹالین ہاکی ٹیم کسی یونٹ سے نہیں ہارتی تھی

لیکن ایک ٹینک رجمنٹ کی ٹیم ہماری ٹیم کو ہمیشہ ایک دو گول سے شکست دے جاتی تھی۔ اس ٹیم کے فل بیک بہت سخت تھے۔ ہماری فارورڈ لائن کو ڈی تک پہنچنے ہی نہیں دیتے تھے۔ ایک اور میچ طے ہوا تو میں نے کمانڈنگ آفیسر سے اجازت لے کر اپنے جگو کو اپنی بٹالین ٹیم میں شامل کر دیا۔ وہ رائٹ فارورڈ کھیلا کرتا تھا۔ یہ دراصل غلط حرکت تھی۔ بٹالین ٹیم میں صرف بٹالین کے افسر اور جوان شامل ہو سکتے ہیں۔ جگو کا قد بت ایسا تھا کہ اسے نیا افسر یا ٹریننگ سنٹر سے آیا ہوا نیا سپاہی سمجھا جا سکتا تھا۔ ہماری بد دیانتی کام کر گئی۔ ٹینک رجمنٹ نے دو گول کر دیئے لیکن جگو نے دونوں گول اتار کر میچ برابر کر دیا۔

دوسری ٹیم کو شک تک نہ ہوا کہ یہ لڑکا بٹالین کا افسر یا سپاہی نہیں ہے۔ ایک غلطی مجھ سے ہو گئی تھی لیکن ٹینک رجمنٹ والوں کی نظر نہ پڑی۔ غلطی یہ تھی کہ میچ ختم ہوتے ہی میں دوڑتا ہوا گراؤنڈ میں گیا اور جگو کو گلے لگا لیا۔ وہ میرے ساتھ گراؤنڈ سے باہر آیا تو مجھے بالکل خیال نہ رہا کہ حریف دیکھ رہے ہیں۔ جگو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اس طرح میرا ہاتھ پکڑے گراؤنڈ سے باہر آیا جس طرح میرے ساتھ سکول سے گھر یا گھر سے بازار جایا کرتا تھا۔ اگر ٹینک رجمنٹ والے دیکھ لیتے تو ضرور شک کرتے کہ یہ لڑکا فوجی نہیں ہے۔

میں نے دوسری بیٹی کی بھی شادی کر دی۔ جگو کو کالج میں داخل کرا دیا۔ تین چار مہینوں بعد میری پلٹن اس چھاؤنی سے کوچ کرنے لگی تو میں نے جگو کو ہوسٹل میں داخل کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مجھ سے جدا ہوا۔ میں نے اس پر ظاہر تو نہ ہونے دیا لیکن دل بہت ہی اداس ہوا۔ نئی چھاؤنی میں جا کر میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ جگو میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے کا عادی تھا، وہ اب کیسے چلتا پھرتا ہو گا۔ وہ شاید میرے سہارے کے بغیر اچھی طرح چل پھر لیتا ہو گا لیکن میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔

وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں میرے پاس آ گیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔

میں شام کے وقت اس کے ساتھ چھاؤنی کے بازار ضرور گھومنے جایا کرتا تھا اور وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتا تھا۔ اس وقت مجھے وہ ڈیڑھ دو سال کی عمر کا بچہ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن باتیں ایسی کرتا تھا کہ مجھ سے زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ کشمیر کے متعلق اس کے خیالات پختہ تھے۔ جب اسے کوئی کہتا تھا کہ ہندوستانی کشمیری مسلمانوں پر بہت ظلم کر رہے ہیں تو جگو کے پاس یہی ایک جواب ہوتا تھا۔ "انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ ہندوستانی ہندو ہیں اور کشمیری مسلمان ہیں۔ ہندو اور مسلمان ایک پلیٹ میں تو نہیں کھا سکتے۔ ہمیں لڑ کر کشمیری مسلمانوں کو آزاد کرانا ہے۔ ان پر ظلم کرنا ہندوؤں کا فرض ہے اور انہیں آزاد کرانا ہمارا فرض ہے۔"

ایک روز مجھ سے پوچھنے لگا۔ "ابو جان، آپ کو معلوم ہے کہ گاندھی نے فلاں موقع پر کیا کہا تھا"۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس نے مجھے ہندو لیڈروں کے وہ بیان سنائے جو وہ پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کے خلاف دیتے رہے تھے۔ جگو کہنے لگا۔ "پاکستان کی عمر چودہ سال ہو گئی ہے مگر ہندو نے ابھی تک ہمارے وجود کو تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ ہمیں اپنے وجود کا حصہ سمجھتا ہے۔ ابو جان، آپ فوجی ہیں۔ یہ کام آپ کا ہے کہ ہندو کو سمجھائیں کہ پاکستان پاکستان ہے۔ ہندوستان نہیں ہے۔"

جگو کی یہ باتیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو گئیں تو میں اسے گاڑی پر چڑھانے کے لیے سٹیشن تک گیا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے اس نے عادت کے مطابق میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں دعائیں کرنے لگا کہ یا خدا گاڑی گھنٹہ دو گھنٹے لیٹ آئے مگر گاڑی وقت پر آ گئی۔ گاڑی میں سوار ہونے تک میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہا۔ جب گاڑی چلی تو اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گاڑی تیز ہونے تک ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر دور تک میں اس کا ہلتا ہوا ہاتھ دیکھتا رہا۔

میں نے جگو کا تعارف پلٹن کے افسروں کے ساتھ کرایا تھا میں رہے
سٹیشن سے واپس آیا تو میرے کمپنی کمانڈر نے مجھے کہا ــ "جگو جوان ہو گیا
ہے۔ زیادہ پڑھا کر کیا کرو گے۔ اسے کمشن کے لیے بھیج دو" ــ میں نے
ہنس کر کہا ــ "صاحب، وہ تو ابھی بچہ ہے" ــ میجر صاحب نے سنجیدگی
سے کہا ــ "وہ تو بوڑھا ہونے تک آپ کے لیے بچہ رہے گا لیکن آپ نے
دیکھا نہیں کہ وہ آپ سے زیادہ قد آور ہے۔ وہ جوان ہو گیا ہے"۔

جگو دوسرے سال میں تھا تو پھر گرمیوں کی چھٹیوں میں میرے پاس
آیا۔ دوسرے روز میں پریڈ وغیرہ کے بعد جگو کو دفتر لے گیا اور افسروں سے
اس کی ملاقات کرائی۔ مجھے سب نے کہا کہ بیٹے کو فوج میں بھیج دو۔ تھوڑے
دنوں بعد بھرتی دفتر میں کمشن کے انتخاب کا ابتدائی امتحان تھا۔ میں اسے وہاں
لے گیا۔ وہ پاس ہو گیا پھر وہ آخری انتخاب میں بھی کامیاب ہو گیا اور میرا جگو
ٹریننگ کے لیے ملٹری اکیڈمی میں چلا گیا۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر فخر کی
اور بات کیا ہو سکتی تھی۔ وہ بھی خوش تھا۔

میں چھ مہینوں بعد اسے ملنے کاکول گیا۔ وہ دوڑتا ہوا مجھ تک پہنچا۔
باپ بیٹا بغلگیر ہو کر ملے۔ میں نے اس میں خاص تبدیلیاں دیکھیں۔ وہ
جسمانی لحاظ سے اور دماغی لحاظ سے بھی بہت پھرتیلا ہو گیا تھا۔ ان
دنوں انڈین آرمی چینیوں سے مار کھا کر بھاگی تھی۔ جگو نے کہا ــ "ہندو
ذرا دم لے لیں پھر انہیں ہم بھگائیں گے ابھی تو بیچارے تھکے ہوئے ہوں
گے" ــ میں نے اس وقت اسے بتایا "جگو بیٹا، تم اس وقت بہت
چھوٹے تھے جب ہم ہندوستان سے یہاں آئے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں
نے ہمیں کہا تھا کہ پاکستان دو دن کا کھیل ہے" ــ میں نے اسے کیپٹن حنیف
اور نائیک عابد علی کی باتیں بھی سنائیں اور میجر ملکھا سنگھ کا قہقہہ اور فقرہ بھی
اسے سنایا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں نے ہندوستان سے آتے وقت

گاڑی میں اس کے متعلق کیا سوچا تھا۔ جگو نے ساری باتیں سنیں اور کہنے
لگا ــ "میں خدا سے ڈرتا ہوں اس لیے تکبر کی بات نہیں کروں گا۔ ہندو
کے ساتھ ہماری ملاقات ضرور ہو گی"۔

جگو بہت بدل گیا تھا لیکن اس کی ایک عادت نہیں بدلی تھی۔ وہ یہ کہ
جتنی دیر ہم اکٹھے بیٹھے رہے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رکھا
بلکہ ایک بار جب میں کوئی بات کر رہا تھا تو اس نے میری انگلیوں کو ایک
دوسری پر چڑھانا شروع کر دیا۔ اس وقت جگو کیڈٹ نہیں دو سال کا بچہ تھا۔
مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اس کی پیشانی چوم لی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے
لگا۔

میں چار دفعہ اسے کاکول ملنے گیا۔ اس کے انسٹرکٹروں سے بھی ملا۔
میں صوبیدار بن چکا تھا۔ ایک انسٹرکٹر نے مجھے کہا ــ "صوبیدار کا بیٹا
صوبیدار میجر ہوتا ہے۔ بہت تیز لڑکا ہے" ــ میں جب بھی اسے ملنے گیا
اس نے میرا ہاتھ ضرور ہی پکڑے رکھا۔ میں اب بوڑھا ہو چلا تھا۔ اب تو
میں ضرورت محسوس کرنے لگا تھا کہ میرا بیٹا میرا ہاتھ تھام لے۔ مجھے اس کے
سہارے کی ضرورت تھی۔

وہ دن میری زندگی کا مبارک دن ہے جب مجھے اطلاع ملی کہ جگو اکیڈمی
سے کمشن لے کر ایک پلٹن میں چلا گیا ہے۔ وہ اب سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ میں
نے چار روز کی چھٹی لی اور وردی میں اسے ملنے گیا۔ اسے وردی میں دیکھا۔
میں نے اسے سیلوٹ کیا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا ــ "باپ بیٹے کو سیلوٹ
نہیں کیا کرتا۔ میں تو بچہ ہوں" ــ میں نے اسے کہا "بیٹا، فوجی ڈسپلن کو
نہیں بھولنا چاہیے"۔ وہ مجھے افسر میس میں لے گیا۔ میں اسے بڑے غور سے
اور بڑے فخر سے دیکھتا رہا مگر وہ ابھی بچہ تھا۔ اس نے صوفے پر میرے قریب
بیٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں بہت دیر اسی حالت میں بیٹھے باتیں
کرتے رہے۔

ایک ہی سال بعد ہندو نے ہمیں رن کچھ میں للکارا اور شکست کھائی لیکن میری پلیٹن کو وہاں نہ بھیجا گیا نہ جگو کی پلیٹن گئی۔ اتنی امید ضرور بندھ گئی کہ اب ہندو سے ملاقات جلدی ہو گی۔ پاکستان آرمی سرحدوں پر چوکس ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جگو کی پلیٹن کون سے سیکٹر میں چلی گئی ہے۔ حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ شاستری نے کہا تھا کہ وہ اب اپنی مرضی کے محاذ پر لڑیں گے۔ اس کے فوجی مشیروں نے کشمیر کو اپنی مرضی کا میدانِ جنگ منتخب کیا اور آزاد کشمیر پر حملے کا منصوبہ بنایا جس کے تحت انہوں نے حاجی پیر اور کارگل کی چوکیاں لے لیں۔ لیکن پاکستان آرمی نے جنرل چوہدری کو اپنی مرضی کے میدان میں گھسیٹ کر وہاں لڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہ میدانِ جنگ چھمب جوڑیاں کا خطہ تھا۔

شاستری کی مرضی اور جنرل چوہدری کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ ہندوؤں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جہاں انہوں نے سب سے زیادہ اور سب سے مضبوط دفاعی انتظامات کر رکھے ہیں، پاکستانی آرمی وہیں پہلی ضرب لگائے گی۔

یہ ضرب ایسی کارگر ہوئی کہ ہندوؤں نے مجبور ہو کر لاہور پر پھر سیالکوٹ پر حملہ کر دیا۔ یہ ہندو کی شکست کا ثبوت تھا۔ وہ نہ اپنی مرضی کے میدان میں جم سکا نہ ہماری مرضی کے محاذ پر ٹھہر سکا۔ اس کے پاس ایک ہی اوچھا وار رہ گیا تھا وہ یہ کہ اس نے اپنی فوج کو پاکستان پر چڑھا دیا۔ پاکستان آرمی اس کے لیے بھی تیار تھی۔ لاہور پر بڑا ہی زوردار حملہ ہوا جسے ہمارے ایک ڈویژن نے روک لیا۔ میری پلیٹن سیالکوٹ میں تھی۔ ۸ ستمبر کی صبح ہندو ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ ٹینکوں کا ڈویژن اور تین انفنٹری ڈویژن لایا تھا۔ ہمارے پاس اللہ کا نام تھا۔ آرمرڈ ڈویژن کے خلاف آرمرڈ ڈویژن ہی لڑا کرتا ہے مگر ہمارے پاس انفنٹری بریگیڈ تھا۔ ہمارے کمانڈر فوراً سمجھ گئے کہ

ہندو کی نظر چونڈہ کے کھلے میدان پر ہے۔ یہ میدان اس کے لیے موزوں تھا۔ یہاں سے وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ہمیں حکم ملا کہ دشمن کو چونڈہ کے اردگرد پاؤں نہ جمانے دو۔

دشمن گاؤں پہ گاؤں لیتا چلا آ رہا تھا۔ وہ تو صاحب، ایک طوفان تھا۔ چار سو توپیں، ساڑھے چار سو ٹینک، پیچھے ریزرو میں بھی بے شمار ٹینک تھے۔ ہماری پچیسویں کیولری (ٹینک رجمنٹ) نے اس طوفان سے ٹکر لے لی۔ ان جانبازوں کی مدد کے لیے ہم نے آر آر اور راکٹ لانچر آگے بھیج دیئے۔ کسی کو زندہ پیچھے آنے کی امید نہیں تھی۔ وہ قسمیں کھا کر گئے تھے کہ دشمن کو آگے نہیں آنے دیں گے یا ہم زندہ نہیں لوٹیں گے۔

چونڈہ کی کہانی تو بہت لمبی کہانی ہے۔ میں پوری کہانی سنا بھی نہیں سکتا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ نظری ملاپ ٹوٹ گئے تھے۔ وائرلیس اُڑ گئے تھے۔ ٹینک پھٹ رہے تھے، انسان جل رہے تھے۔ دائیں بائیں ملاپ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ لیکن اللہ کا کرم ہوا کہ ہندو کو ہم نے چونڈہ کے میدان میں ٹکنے نہ دیا۔ دشمن نے ہماری طاقت کو بکھیرنے کے لیے محاذ کو چالیس میلوں پر پھیلا دیا۔ توپ خانے کے کمانڈر بریگیڈیئر امجد علی چوہدری صاحب نے توپخانہ بیٹریوں کو اس طرح استعمال کیا کہ سارے محاذ کو کور کر لیا۔ اُوپر سے پاکستان ایئر فورس نے کمال کر دیا۔ چونڈہ میں بریگیڈیئر عبدالعلی ملک صاحب تھے ان کے دائیں بریگیڈیئر امیر عبداللہ خان نیازی تھے۔ اب دونو جنرل ہو گئے ہیں۔ اس حصے کی کمان جنرل ابرار صاحب نے لے لی۔ بائیں طرف سیالکوٹ کے سامنے بریگیڈیئر عظمت صاحب کا بریگیڈ تھا اور اس حصے کی کمان جنرل ٹکا خان کے پاس تھی۔ جسڑ کو بریگیڈیئر مظفر الدین نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ بھی اب جنرل ہیں۔

چونڈہ میں نقصان تو ہمارا بھی بہت ہوا لیکن دشمن کا ہم نے یہ حال

کر دیا کہ وہ ریزرو سے مدد لے کر اگلی یونٹوں کے نقصان کو پورا کرنے لگا ہمارے
پاس ایک ذریعہ یہ تھا کہ رات کے وقت فائٹنگ پیٹرولیں اور ٹینک ہنٹنگ
(ٹینک شکار) پارٹیاں بھیج کر دشمن پر شبخون ماریں اور اسے اگلے دن کے حملے
کے قابل نہ چھوڑیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کام کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ رات کے
وقت دس یا بارہ جوان رینگ رینگ کر دشمن کے علاقے میں چلے جاتے
ہیں اور ٹینکوں، ایمونیشن کے ذخیروں اور آرٹلری گنوں وغیرہ کو تباہ کرتے
ہیں۔ وہ اکیلے اکیلے ہو کر اپنے اپنے ٹارگیٹ پر حملہ کرتے ہیں۔ دشمن انہیں
گھیرے میں لے کر پکڑنے کی یا مشین گنوں سے بارش کی طرح فائر کر کے انہیں
مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مہم میں بہت تیز، عقل مند اور دل گردے والے
جوانوں کو بھیجا جاتا ہے۔

ہماری پیٹرول اور ٹینک شکار پارٹیوں نے دشمن کا برا حال کیے رکھا۔
بہت جوان شہید اور شدید زخمی ہوئے۔ ان قربانیوں کے بغیر ملک کو بچانا
آسان نہ تھا۔ میں دو دفعہ ٹینکوں کے شکار کے لیے گیا تھا۔ ہر بار میرے ساتھ
بارہ بارہ جوان تھے جن میں سے چار شہید ہوئے اور ہم نے دس ٹینک
اور کئی گاڑیاں تباہ کی تھیں۔

مجھے ابھی تک پتہ نہیں چل سکا تھا کہ جگو کی پلٹن کہاں لڑ رہی ہے۔ مجھے
اس کے متعلق فکر تھا۔ میری نظر میں وہ ابھی بچہ ہی تھا۔ جب یاد آتا تھا تو
دل بیٹھ جاتا تھا۔ وہ لیفٹیننٹ تھا میں سوچا کرتا تھا کہ وہ میرے سہارے کے
بغیر کیسے لڑ سکے گا۔ بس ایسے ہی بیکار سے خیال دل میں آتے رہتے تھے۔
وہ میرا بچہ تھا جسے میں نے ماں کی طرح پالا تھا۔ وہ بچہ اب توپوں اور
ٹینکوں کی آگ میں خدا جانے کس حال میں تھا اور کہاں تھا۔ میں جب
پاکستان آرمی کے صوبیدار کی حیثیت سے اسے یاد کرتا تھا تو دل خوش ہوتا
تھا کہ میرا بیٹا بھی ملک کے لیے لڑ رہا ہے اور جب میں باپ کی حیثیت سے

سوچتا تو بہت دکھ ہوتا تھا۔

وہ وقت ایسی سوچوں کا نہیں تھا۔ وہ تو قیامت کی گھڑیاں تھیں۔
ایک سوچ دماغ میں آتی تھی تو توپوں کے دھماکوں میں خیال ہی نہیں رہتا
تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔

ہماری پلٹن کی دو کمپنیاں ایک اور طرف بھیج دی گئی تھیں۔ ایک روز
ہماری پلاٹون کو ٹینکوں کے ساتھ آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ ہمارے کمانڈنگ
آفیسر نے بریگیڈ سے ایک کمپنی مانگی کیونکہ نفری تھوڑی تھی۔ بریگیڈ
ہیڈ کوارٹر نے پوری کمپنی تو نہ دی چالیس جوانوں کی ایک پلاٹون دے
دی۔ یہ کسی اور پلٹن کی پلاٹون تھی۔ میری کمپنی کی نفری سب سے کم تھی اس
لیے یہ پلاٹون ہماری کمپنی کو دے دی گئی۔

دن کے پچھلے پہر یہ پلاٹون ہماری پوزیشن میں پہنچ گئی۔ کمپنی کمانڈر
نے مجھے اپنے مورچے میں بلایا۔ میں گیا تو دور سے دیکھا کہ کمپنی کمانڈر کے
ساتھ ایک اور افسر مورچے میں بیٹھا تھا جسے میں پہچان نہ سکا۔ قریب گیا تو
کمپنی کمانڈر نے کہا۔ "صوبیدار صاحب یہ اٹیچ پلاٹون کے لیفٹیننٹ..."
میرے میجر صاحب ابھی بات پوری نہیں کر سکے تھے کہ میں نے زور سے
کہا۔ "جگو بیٹا!" جگو کود کر اٹھا اور "ابو جی" کہہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میرے
کمپنی کمانڈر صاحب پلٹن میں نئے آئے تھے اس لیے وہ جگو کو نہیں جانتے
تھے۔

اگر جگو کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں کہتا کہ یہ پاکستان کا جنگجو جوان ہے۔ میں
اس کے قد بت اور بھرے ہوئے چہرے پر بارود اور مٹی کی تہہ جمی ہوئی دیکھ
کر رائے دیتا کہ یہ تجربہ کار اور پختہ عمر کا افسر ہے۔ لیکن وہ میرا بیٹا تھا جسے دیکھا
تو ایسے لگا جیسے میرا گمشدہ بچہ خود ہی میرے پاس آ گیا ہو۔ میں نے اسے سر
سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کی وردی ایک دو جگہوں سے پھٹی ہوئی تھی۔ داڑھی
بڑھی ہوئی اور آنکھیں لال سرخ تھیں لیکن جسم پر کہیں بھی زخم نظر نہ آیا۔ اس

کا حال حلیہ بہت بُرا تھا۔ سب کا یہی حال تھا لیکن اپنے بچے کو اس حال میں دیکھ کر میرے دل کو تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی۔ ہم دونوں کمپنی کمانڈر اور میدانِ جنگ کو بھول گئے۔ ہمارے اوپر سے دشمن کے توپخانے کے گولے چیختے ہوئے گزر رہے تھے اور دو چار سو گز پیچھے پھٹ رہے تھے۔ ادھر سے ہماری توپوں کے گولے جا رہے تھے۔ ہمارے سامنے ٹینکوں اور انفنٹری میں کوئی ایسی حرکت نہیں تھی۔ اس وقت توپ خانوں کی جنگ جاری تھی۔

ہم دونوں کھڑے تھے۔ جگو نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر مورچے میں بٹھا لیا۔ ہم نے جلدی جلدی ایک دوسرے کی خیر خیریت پوچھی۔ وہ باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اپنے کمپنی کمانڈر سے کہا "سر، معافی چاہتا ہوں بیٹے سے اچانک ملاقات ہو گئی ہے۔ یہ میرا ایک ہی بچہ ہے ..... میرے لیے کیا حکم ہے سر؟"

"آج رات باپ بیٹے کا امتحان ہے"۔ کمپنی کمانڈر نے جگو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آج آپ دونوں پٹرول اور ٹینک ہنٹنگ پارٹیاں لے کے جائیں گے"۔

کمپنی کمانڈر صاحب نے ہمیں بتایا کہ اگلی صبح کے اندھیرے میں ہمیں دشمن پر جوابی حملہ کرنا ہے۔ انٹیلی جنس رپورٹوں سے پتہ چلا ہے کہ دشمن فلاں مقام پر ٹینک جمع کر رہا ہے۔ وہیں کہیں وہ ایمونیشن اور پٹرول بھی ڈمپ کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی کل صبح ہم پر حملہ کرے گا۔ ضرورت یہ ہے کہ رات کے وقت زیادہ نفری کی پارٹیاں جائیں اور دشمن کو اتنا نقصان پہنچائیں کہ وہ صبح کے وقت حملہ نہ کر سکے بلکہ ہم حملہ کریں۔

میں نے اور جگو نے نقشوں پر نشان لگا لیے۔ مشن بہت خطرناک تھا کیونکہ گزشتہ رات کی پٹرول پارٹی نے دشمن کی مشین گنوں کی جو پوسٹیں بتائی تھیں

وہ ایسی جگہوں پر تھیں جہاں سے ہمیں گزر کر دشمن کے ٹینکوں تک پہنچنا تھا۔ ان مشین گن پوسٹوں کی موجودگی میں دشمن کو نقصان پہنچانا آسان نہ تھا۔ ان کے علاوہ دشمن نے بعض جگہوں پر ٹینک بھی ہل ڈاؤن پوزیشن میں رکھے ہوئے تھے جو رات کے وقت مشین گن سے فائر کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دشمن کے ان ٹینکوں کو نقصان پہنچانا ممکن نہ تھا جو اس نے حملے کے لیے جمع کر رکھے تھے۔

میں نے کمپنی کمانڈر صاحب سے چند ایک سوال پوچھے تو جگو بول پڑا۔ "ابو جی، میں نے سمجھ لیا ہے۔ سولہ جوان آپ لے لیں، سولہ میں لے لیتا ہوں۔ اتنی نفری کافی ہے۔ زیادہ تر راکٹ لانچر اور ایل ایم جی ساتھ ہونی چاہیے۔ ہر جوان کے پاس دو دو گرینیڈ کافی ہیں"۔ کمپنی کمانڈر نے کہا "چار چار گرینیڈ"۔ اور اس طرح کی ضروری باتیں اور وقت طے کیا گیا۔ میں اپنی کمپنی سے سولہ جوان منتخب کرنے کے لیے چلا گیا اور جگو اپنی پلاٹون سے جوانوں کو چننے کے لیے چلا گیا۔

میں نے نہایت تیز، چست اور راکٹ لانچر کے ماہر نشانہ باز چن لیے اور انہیں کہا کہ رات نو بجے تک آرام کر لیں۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میرے دل میں یہ بھی آئی کہ کسی طرح کمپنی کمانڈر کو آمادہ کر لوں کہ جگو اس مہم میں نہ جائے۔ میں خود اس کے جوانوں کو بھی اپنی کمان میں لے لوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کتنے جوان زندہ واپس آسکیں گے یا کوئی واپس آ بھی سکے گا یا نہیں۔ دشمن اس وقت تک ہماری پٹرول پارٹیوں کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھا چکا تھا۔ اس لیے اس نے ٹینکوں کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ گزشتہ رات کی پارٹی نے بتایا تھا کہ ذرا سا کھٹکا ہو تو دشمن روشنی راؤنڈوں سے رات کو دن بنا دیتا ہے اور ہر طرف سے مشین گنیں اس طرح فائر کرتی ہیں کہ زمین کا کوئی چپہ محفوظ نہیں رہتا۔ آج کی رات ہمیں دشمن کے اور اندر جانا تھا جہاں گھیرے میں آ کر مارے یا پکڑے جانا لازمی تھا مگر میں کمپنی کمانڈر کو ایسی بات

کر نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ شک کر سکتا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو بچانا چاہتا ہوں۔ میں نے اتنی دعا ضرور مانگی کہ یا خدا اگر میرے بیٹے کی زندگی ختم ہو رہی ہے تو اسے میری زندگی دے دے۔

رات ساڑھے نو بجے میں اپنے سولہ جوانوں کو ساتھ لیے بٹالین ہیڈ کوارٹر کے مورچے میں پہنچا۔ جگو اپنے سولہ جوانوں سمیت پہنچ چکا تھا۔ پھیکی پھیکی چاندنی تھی۔ میں نے جگو کے جوانوں کے ہتھیار دیکھے۔ اس وقت میرے دل میں یہی خیال تھا کہ جگو بے شک لیفٹیننٹ ہے لیکن بچہ ہے۔ اسے کیا معلوم کہ پٹرولنگ کے لیے جانے سے پہلے ہتھیار کس طرح دیکھے جاتے ہیں۔ میں نے اس کے راکٹ لانچر والوں سے چند ایک ضروری باتیں پوچھیں اور انہیں ہدایات بھی دیں۔ معلوم ہوا کہ وہ سب تین تین چار چار ٹینک ہنٹنگ پارٹیوں میں جا چکے ہیں۔ پھر میں نے جگو سے پوچھا۔ "بیٹا! تمہارے پاس کیا ہے؟" اس نے کہا۔ "ابو جی، ریوالور اور سٹین گن ہے۔ چار گرینیڈ بھی ہیں۔ میں راکٹ لانچر بھی فائر کر سکتا ہوں"۔۔۔ اس وقت اس کے لب و لہجے میں بچپن صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ پہلی بار اس مہم پر جا رہا ہے۔ اس وقت جگو میری نظر میں دو سال کا بچہ بن گیا جو میرا ہاتھ پکڑے بغیر چل نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "بیٹا، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جو اللہ کو منظور ہوگا"۔۔۔ میں دراصل اسے کہنا یہ چاہتا تھا کہ بیٹا، میرا ہاتھ پکڑے رکھنا ورنہ گر پڑو گے۔

رات کے دس بج رہے تھے جب کمانڈنگ آفیسر صاحب نے ہمیں آخری ہدایات دیں اور آخر میں کہا۔۔۔ "جوانو، ملک تم سے خون کی قربانی مانگ رہا ہے۔ یہ اللہ اور رسولؐ کا ملک ہے۔ پیٹھ نہ دکھانا"۔۔۔ ہم چل پڑے۔ جگو میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ چلتے چلتے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے دل پر بوجھ سا گر پڑا۔ میں نے بڑی مشکل سے دل کو اس بوجھ سے آزاد کیا۔ میں سوچنے لگا کہ معلوم نہیں باپ بیٹے کو قربان کرنے جا رہا ہے یا بیٹا باپ کی قربانی دینے جا رہا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ باپ بیٹا دونوں اللہ کے نام پر قربان

ہو جائیں۔ جگو بھی شاید یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ یہ اندازہ میں نے اس لیے کیا کہ وہ چپ تھا اور اچانک کہنے لگا۔ "ابو جی، ہمیں گھر کا تو کوئی غم نہیں۔ چاروں بہنیں اپنے اپنے گھر آباد ہو گئی ہیں۔ اب ہم دونوں اس دنیا میں نہ بھی رہیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔۔۔" وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔۔۔ "مرتے وقت بھی میں آپ کا ہاتھ پکڑے رکھوں گا۔ اگلے جہان اسی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے جائیں گے"۔

اس کی ہنسی نے میرے دل کا سارا بوجھ اتار دیا۔

دشمن کا توپ خانہ آگ اگل رہا تھا۔ ہمارا توپ خانہ خاموش تھا۔ اسے چند ہی منٹ پہلے اس لیے خاموش کر دیا گیا تھا کہ ہم وہیں جا رہے تھے۔ جہاں ہماری توپوں کے گولے پھٹ رہے تھے۔ دائیں بائیں دور دور تک محاذ زندہ اور سرگرم تھا۔ دھماکوں اور شعلوں کے سوا نہ کچھ سنائی دیتا تھا نہ کچھ نظر آتا تھا۔ ہماری پارٹیاں اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں سے ہمیں بکھرنا اور دشمن پر شبخون مارنا تھا۔ جگو دونوں پارٹیوں کا کمانڈر تھا۔ آخری ہدایات دینا اس کا فرض تھا لیکن یہ فرض میں نے ادا کیا۔ جگو برخوردار بچے کی طرح سنتا رہا۔ وہ بچہ ہی تو تھا۔ میں نے جوانوں سے آخری فقرہ یہ کہا۔۔۔ "قید ہونے کا خطرہ ہو تو ہتھیار برباد کر دینا اور دشمن کو نام نمبر کے سوا کچھ نہ بتانا"۔۔۔ جگو بول پڑا۔ "جوانو، ہندو کی قید سے موت بہتر ہے۔ لڑتے ہوئے شہید ہو جانا قید نہ ہونا"۔

جگو مجھ سے جدا ہونے لگا تو اس نے میرے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "جگو بیٹا، ہم کیوں نہ اکٹھے رہیں"۔۔۔ وہ نہ مانا۔ کہنے لگا۔ "الگ الگ ہو کر کوشش کریں گے کہ جوانوں کے ساتھ ملاپ رہے"۔۔۔ اور ہمارے ہاتھ چھوٹ گئے۔ جگو تھوڑی دور تک مجھے نظر آیا پھر کماد کے جلتے ہوئے کھیت کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں نے دو جوانوں کو اپنے ساتھ رکھا اور ایک طرف کو چلنے لگا۔ تمام جوان ہدایت کے مطابق جوڑی

جوڑی ہوکر بکھر گئے تھے۔ جگو نے ایک راکٹ لانچر والے کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔

نصف گھنٹے بعد مجھے گرینیڈ کا پہلا دھماکہ سنائی دیا۔ ہمارے ایک جوان نے دشمن کی ایک مشین گن پوسٹ کے قریب جاکر گرینیڈ پھینکا تھا۔ ہمارے راستے کی ایک رکاوٹ ختم ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے۔ زمین اور آسمان روشن ہوگئے۔ مجھے دشمن کی ایک اور مشین گن پوسٹ نظر آ رہی تھی جو ایک سو گز بھی دور نہیں تھی۔ دو مشین گنوں سے نکلتے ہوئے شرارے مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ گولیاں ہمارے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ گنر گنوں کو گھما گھما کر فائر کر رہے تھے۔ ہم نہایت اچھی آڑ میں تھے۔ وہاں تک گرینیڈ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میرے پاس دو جوان تھے جن کے پاس راکٹ لانچر تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر پوسٹ کا نشانہ لیا اور راکٹ فائر کر دیا جو ٹھکانے پر پڑا پھر وہاں سے مجھے کوئی شرارہ نکلتا نظر نہ آیا۔ میں جوانوں کو ساتھ لیے آڑ سے اٹھا اور سرپٹ بھاگتا مشین گن پوسٹ کی آڑ میں جا لیٹا۔

سر سے دو چار ہی فٹ اوپر سے سنسناتی ہوئی گولیاں گزر رہی تھیں۔ مجھے دشمن کے روشنی راؤنڈوں کی روشنی میں ایک ٹینک کا ٹرٹ نظر آیا۔ اس کی مشین گن فائر کر رہی تھی۔ میرے ایک جوان نے راکٹ فائر کیا۔ جونہی راکٹ نالی سے نکلا، ہم تینوں وہ آڑ چھوڑ کر جھکے جھکے بھاگے اور دس پندرہ گز دور جا لیٹے ادھر ٹینک میں دھماکہ ہوا اور چند منٹوں بعد ٹینک کے اندر رکھا ہوا ایمونیشن پھٹا۔ اس دھماکے کی روشنی میں مجھے ٹینک کا کپولا ہوا میں اڑتا دکھائی دیا۔

یہ بات خاص طور پہ یاد رکھتے کہ ہمارے جوانوں کی بہادری اور بے خوفی میں کوئی شک نہیں لیکن فائٹنگ پٹرول یا کمانڈو جوانوں کے شبخون سے دشمن

پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ رات کی وجہ سے کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ حملہ آور کہاں ہیں اور کس وقت ان کا گرینیڈ یا راکٹ کا گولہ مورچے میں آ پڑے گا۔ دشمن یا تو دبک جاتا ہے یا اس میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ اس کے جوان ہر طرح کے ہتھیاروں سے اندھا دھند فائر شروع کر دیتے ہیں، جس سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔

ہم نے ایسی ہی دہشت طاری کر دی تھی۔ دور پرے مجھے ایک دھماکہ سنائی دیا پھر شعلے نظر آئے۔ ادھر جگو اور اس کے جوان مصروف تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دشمن کے فائر سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کی کئی ایک مشین گنیں خاموش ہو چکی ہیں۔

اب رات گولیوں کی مسل ل باڑوں، راکٹ لانچروں کے گولے اور گرینیڈ پھٹنے کے دھماکوں سے دہل رہی تھی۔ ہم دشمن کے پہلو سے گزر کر عقب میں پہنچنے والے تھے۔ کئی جگہوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ وہ شاید ٹرک اور ٹینک تھے۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ اب تو اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پوزیشن بدلنے کے لیے پیٹ یا کہنیوں اور گھٹنوں کے بل رینگنا پڑتا تھا۔ ایک ہزار گز دور مجھے آسمان جلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے جوان ٹینکوں کے جھمگھٹے کو رینج میں لے چکے تھے۔

رات پوزیشنیں بدلتے اور فائر کرتے گزر گئی۔ تین ٹینک تو صرف میرے دو جوانوں نے تباہ کیے تھے۔ وقت دیکھا تین بج رہے تھے۔ میں نے جوانوں کو واپسی کے لیے کہا۔ اس مہم میں واپسی بھی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ خطرہ ہوتا ہے کہ دشمن نے گھیرے میں نہ لے لیا ہو۔ ایک ایک انچ کو پورے غور سے دیکھ کر پیچھے ہٹنا ہوتا ہے۔ ہم گولیوں کی موسلا دھار بارش میں پیچھے کو رینگتے آتے۔ اب تو دشمن نے مارٹروں کے گولے بھی فائر کرنے شروع کر دیئے تھے۔ کئی گولے ہمارے قریب پھٹے اور ان کے ٹکڑے چیختے ہوئے ہمارے قریب سے گزر گئے۔

صبح کی پہلی روشنی ذرا صاف ہو گئی تھی جب ہم اُس محفوظ مقام تک پہنچ گئے جہاں سے ہم رات کو ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر بکھرے تھے۔ ایک کھیت کی مینڈھ کی آڑ میں چوبیس جوان لیٹے ہوئے تھے۔ ان میں آٹھ شدید زخمی تھے اور ان کے پاس تین شہیدوں کی لاشیں تھیں۔ لاشوں کو ملا کر نفری ستائیس تھی۔ جگو اور پانچ جوان ابھی غیر حاضر تھے۔ ان کے متعلق کسی کو علم نہ تھا۔ میں نے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ میں نے اپنا بیٹا ملک پر قربان کر دیا ہے۔ میں بھی مینڈھ کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ کسی نے بلند آواز سے کہا — "وہ آ رہے ہیں" — میں اچھل کر اٹھا۔ دیکھا کہ جگو آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار جوان تھے۔ دو نے ایک کو آگے پیچھے ہو کر کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ میں دوڑتا گیا۔ وہ ایک شہید کی لاش اٹھائے ہوئے تھے۔ شہید کو دیکھ کر میں جگو کو بھول گیا۔ اسے اچھی طرح دیکھ نہ سکا۔

ہم نے شہید کو دوسرے شہیدوں کے پاس لٹا دیا۔ جگو نے حکم دینے کے لہجے میں اپنے حوالدار سے کہا — "دو جوان شہیدوں کے پاس چھوڑ دو۔ باقی جوان بٹالین ہیڈ کوارٹر میں چلے جائیں۔ لاشوں کے لیے گاڑی آئے گی" — جوان اُٹھ کر چل پڑے۔ جگو وہیں کھڑا رہا۔ میں ذرا دور کھڑا شہیدوں کی لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ جوان کتنے خوش نصیب ہیں جو سرخرو ہو کر خدا کے حضور پہنچ گئے ہیں۔ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ خدا کے نام پر قربان ہو گئے ہیں لیکن قوم کو تو کبھی پتہ نہ چل سکے گا کہ یہ کہاں اور کس طرح شہید ہوئے تھے۔ قوم کبھی بھی نہ جان سکے گی کہ پورے بریگیڈ کا کام ان چند ایک جوانوں نے کیا تھا۔ دشمن کو انہوں نے حملے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے جگو بلا نہ لیتا تو شاید میں بہت دیر وہیں کھڑا جانے کیسی کیسی باتیں سوچتا رہتا۔

میں نے اُس وقت دیکھا کہ جگو کی پتلون بائیں طرف سے لال سُرخ اور ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ دوسری ٹانگ پر بھی خون تھا۔ میں اس کے پاس

گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کی ٹانگ کو دیکھنے لگا۔ اس نے کہا — "مشین گن کا برسٹ لگا ہے، ہڈی بچ گئی ہے"۔ میں نے دیکھا کہ اس نے فیلڈ پٹی لپیٹ رکھی تھی لیکن خون ابھی بہہ رہا تھا۔ وہ میرا بچہ تھا — اکلوتا بچہ — ایسے معلوم ہوا جیسے گولیوں کی بوچھاڑ میرے سینے سے پار ہو گئی ہو۔ میں نے کہا "جگو بیٹا! میں تمہیں اٹھا کر پیچھے لے چلوں گا۔ خون جا رہا ہے۔ چلنے سے اور زیادہ جائے گا"۔ لیکن وہ نہ مانا اور چل پڑا۔ اس کے چہرے پر درد کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ اسے کندھے یا پیٹھ پر اٹھا لوں لیکن اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا۔

ہم دونوں اکٹھے چلنے لگے تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عادت کے مطابق میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لے گا لیکن اس نے عجیب حرکت کی کہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا — "جگو، میرا ہاتھ بھی نہیں پکڑو گے"؟

اس نے ہنس کر کہا — "نہیں ابو جی! اب میں جوان ہو گیا ہوں"۔

میں باپ سے صوبیدار بن گیا۔ میں نے فوجی انداز سے کہا — "سر، آپ سخت زخمی ہیں۔ میرا فرض ہے کہ آپ کو اٹھا کر پیچھے لے جاؤں"۔

جگو بھی لیفٹیننٹ بن گیا اور افسروں کی طرح بولا — "صوبیدار صاحب! ہم ٹھیک ہیں۔ آپ ڈبل سے بٹالین ہیڈ کوارٹر تک جائیں اور شہیدوں کے لیے گاڑی بھیجیں"۔

"ٹھیک ہے سر!" میں دوڑ پڑا۔ راستے میں میں ہنس پڑا اور اپنے آپ سے کہا — "آج میرا جگو جوان ہو گیا ہے"۔ — مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی اس کے پیدا ہونے پر ہوئی تھی۔ سچی بات ہے کہ صرف میرا جگو ہی نہیں ساری قوم ستمبر ۱۹۶۵ء میں جوان ہوئی تھی۔

”صحافت میں مجھے بیس سال گزر گئے ہیں۔ میں یہ حقیقت ریکارڈ میں لانا چاہتا ہوں کہ میں نے ایسے خود اعتماد اور فاتح سپاہی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے جیسے پاک فوج میں دیکھ رہا ہوں۔“

رائے میلونی
امریکن براڈکاسٹنگ کارپوریشن
۱۵ ستمبر ۱۹۶۵

بدر سے باٹا پور تک

- باٹا پور کے پل پر چھ ستمبر کی صبح جو معرکہ لڑا گیا اس کی مکمل روئیداد۔
- فائر بندی کے بعد ۵۔ نومبر کے روز باٹا پور میں ایک اور معرکہ لڑا گیا۔
- نہتے پیش امام کا معرکہ۔

اللہ کے سپاہی نے قرآن کی یہ للکار پہلی بار بدر کے میدان میں سنی تھی۔
"آج کے روز جس نے میدان میں پیٹھ دکھائی۔ اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا
وہ جہنم میں جائے گا۔" (انفال: ۱۶) —— تیرہ سو تراسی برس بعد اس مقدس للکار
کی صدائے بازگشت باٹا پور کے میدان میں سنائی دی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ
کے سپاہی نے نہ بدر کے میدان میں پیٹھ دکھائی نہ باٹا پور کے میدان میں۔

بی آر بی کے کنارے پر باٹا پور کے قریب ایک یادگار ہے جس کے ایک
کتبے پر ان شہیدوں کے نام کندہ ہیں جنہوں نے باٹا پور کے پُل پر جان کے
نذرانے دیئے تھے۔ دوسرے کتبے پر جنگ کا نقشہ اور تیسرے پر معرکے کی تفصیلات
کندہ ہیں۔ اس داستان میں اسلحہ بارود اور انسانوں کا ذکر ہے، جس سے اللہ
کے سپاہی کی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ آج میں اس تشنہ پہلو کو بے نقاب کر کے اس
کہانی کو مکمل کر رہا ہوں۔ یہ اُس قوت کی روئیداد ہے جس نے خاکی وردی میں لپٹے
ہوئے انسانوں کو سبز پوش بنا کر بالائے انسانی معرکہ لڑایا اور جس کے سامنے بھارت
کی توپیں اور ٹینک لوہے کے بے جان ٹکڑے بن گئے تھے۔ میں نے اس خدائی
قوت کو انسانوں کے روپ میں بھی دیکھا ہے اور اس ایک انسان کو بھی دیکھا
ہے جو ان انسانوں کا پیش امام ہے جس نے دشمن کی گولہ باری میں باٹا پور
فیکٹری کی مسجد میں مائیکروفون رکھ کر اذان دی تھی۔ لاؤڈ سپیکر نہر کے کنارے
دشمن کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ گولے مسجد پر گر رہے تھے اور اس انسان
نے اذان دے کر ترنم سے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا ؎

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اور میں ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح صدائے لا الٰہ الا اللہ پر قربان ہونے والوں

کی لاشیں دیکھ رہا تھا۔

۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کا سورج افق سے اٹھتا چلا آ رہا تھا۔ چار گھنٹے پہلے فائر بندی
ہو گئی تھی۔ میں بی آر بی کے کنارے پر باٹا پور کے قریب کھڑا جنگ کے بعد کے
پُر ہول مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ بھارتی توپ خانے کی آخری گولا باری کا گرد و غبار
سیاہ کالی گھٹا کی صورت دور اوپر جا کر بھارت کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے
قریب ہی کسی کی ہنسی کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ جہاں میرے سامنے حدِ نگاہ تک
لاشوں کے ڈھیر، کھنڈر اور ماحول پر جلتے ہوئے انسانی گوشت اور خون کا
تعفّن اور بارود کی بدبو پھیلی ہوئی تھی، وہاں موت کے سوا اور کسے ہنسنے کی
جرأت ہو سکتی تھی؟ میں نے گھوم کر دیکھا۔ میرے قریب پاک فوج کا ایک مجاہد
کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہی ہنسا تھا۔ وہ بھی بھارتی توپخانے کی آخری گولہ باری کی
گھٹا کو بھارت کی طرف آہستہ آہستہ جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا
اور قہر آلود مسکراہٹ سے بولا —— "یہ ہندوؤں کے ناپاک ارادوں کی ارتھی
ہے جو مرگھٹ کو اڑی جا رہی ہے۔" اور میں بی آر بی کے پار ہندوؤں کی ان
ہزاروں لاشوں کو دیکھ رہا تھا جن کے نصیب میں ارتھی اور مرگھٹ لکھے ہی
نہیں تھے۔ ان میں آخری رات کے معرکے کی تازہ لاشیں بھی تھیں اور وہ
لاشیں بھی جو پہلے کے حملوں کے وقت کی پڑی گل سڑ رہی تھیں۔

میدانِ جنگ سے آخری معرکے کے شہیدوں کی لاشیں لائی جا رہی تھیں۔
میرے قریب کھڑے مجاہد نے کہا —— "آہ، آپ نے ان سرفروشوں کو آخری
معرکہ لڑتے ہوئے نہیں دیکھا —— دشمن نے وہ آگ برسائی کہ زمین اور آسمان
جھلس گئے مگر یہ جانباز جو چھ ستمبر کی صبح سے لڑ رہے تھے، تھک کر چُور ہو گئے
تھے۔ آنکھیں بارود کی جلن سے سوج گئی تھیں، چہرے گرد و غبار سے سیاہ کالے
ہو گئے تھے جن کے زخموں پر ستمبر کا پسینہ نمک کی طرح لگ رہا تھا۔ ہاتھ ہتھیار
چلاتے چلاتے لہولہان ہو گئے تھے، فائر بندی تک لڑتے رہے۔ ان کے

ماتھے پر بل نہ تھا خشک ہونٹوں پر تبسم اور جھلسے ہوئے گرد آلود چہروں پر رونق تھی جیسے انہیں کوئی غم نہیں، ان کی کوئی ماں نہیں، کوئی بہن نہیں، بیٹی نہیں۔ دمِ آخریں زخموں نے بولنے کی مہلت دی تو ہر ایک نے یہی کہا۔ "مجھے پیچھے نہ لے جانا"۔ جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے لیکن میّت کے چہرے پر سکون اور بشاشت تھی۔"

"آپ بھی اس میدان میں لڑے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"کس منہ سے کہوں کہ میں بھی اسی میدان میں لڑا تھا۔" اس نے کہا۔ "میں زندہ ہوں، زخمی بھی نہیں ہوا۔ وہ اللہ اور رسولؐ کو بہت ہی عزیز تھے جو شہید ہو گئے اور خون سے وطن کا نام روشن کر گئے۔ ان شہیدوں کی روحوں کے درمیان کھڑے ہو کر جن کی لاشیں ٹینکوں تلے کچلی گئیں اور وہ پاک وطن کی مٹی میں مل گئے، کس طرح کہوں کہ میں بھی اسی میدان میں لڑا تھا۔ وہ جس بانکپن سے پریڈ گراؤنڈ میں مارچ کیا کرتے تھے اسی بانکپن سے لڑے اور شہید ہو گئے۔ وہ عظیم انسان تھے۔"

ان عظیم انسانوں کی لاشیں میرے قریب سے گذر رہی تھیں۔ یہ آخری معرکے کے شہید تھے۔ میرے سامنے ڈوگرئی کا گاؤں، دائیں طرف باٹا پور فیکٹری اور بائیں طرف کچے پکے مکانوں کی ایک بستی تھی۔ یہ آباد بستیاں اب کھنڈر بن چکی تھیں اور کھنڈر مورچوں کا کام دے رہے تھے۔ ان کچے پکے مکانوں نے لاہور کی بلند و بالا عمارتوں، میناروں، برجوں اور پکی سڑکوں کی خاطر اپنی دیواروں سے دشمن کے ہزاروں گولے روک لیے تھے۔ درختوں کے گھنیرے چھاتے جل گئے تھے۔ ساون کی ہریالی ٹینکوں تلے روندی گئی تھی۔ جہاں ہری کھیتیاں لہلہاتی تھیں وہاں گولوں اور بموں نے گڑھے بنا ڈالے تھے۔ جدھر نگاہ جاتی تھی ہندوؤں اور سکھوں کی لاشوں پر لاشیں پڑی نظر آتی تھیں۔ ان لاشوں کے قریب مشین گنیں، رائفلیں، سٹین گنیں اور راکٹ لانچر مرے ہوئے

سانپوں اور بچھوؤں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ ان کا ڈنک اور زہر مار دیا گیا تھا۔ خون چکاں لاشوں اور بے اثر ہتھیاروں کے درمیان کہیں ٹینک، کہیں ٹرک اور کہیں جیپیں جل رہی تھیں۔ فائر بندی کے چار گھنٹے بعد بھی ان سے شعلے اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایسا ہی سیاہ دھواں دور پیچھے سرحد سے بھی اٹھ رہا تھا۔ وہاں دشمن کے بارود اور تیل پٹرول کے ذخیرے جل رہے تھے۔

دشمن کی یہ لاشیں اور میدانِ جنگ سے اٹھتا ہوا سیاہ دھواں سترہ دنوں اور سترہ راتوں کے ایک ایک لمحے اور پاک فوج کے اس ڈویژن کے ایک ایک جوان کی شجاعت، حریت اور غیرت کی کہانیاں سنا رہا تھا جس نے لاہور کی آن پر جان کی بازی لگا دی تھی۔ دشمن کی لاشوں کی آنکھیں اور منہ یوں کھلے ہوئے تھے جیسے پاک فوج کے جوانوں کو حیرت و استعجاب سے دیکھ رہے ہوں۔

شجاعت کی یہ کہانیاں بڑی لمبی ہیں۔ ایک نشست میں سنائی نہیں جا سکتیں۔ اور ان ماؤں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتیں جن کے دودھ کی دھاریں لہو کا دریا اور جن کی لوریاں یا علیؓ کی گرج بنیں اور ان بہنوں کا ذکر نہ کروں تو بات پوری نہیں ہوتی جنہوں نے بڑے ارمانوں سے اپنے ویروں کے لیے جو سہرے بناتے تھے وہ ویروں کے تابوتوں پر ڈالے۔

اتنی لمبی کہانیاں سنانے کے لیے ایک عمر اور سننے کے لیے دل گردہ چاہیے۔ میں چھ ستمبر کی صبح کے صرف پہلے چند گھنٹوں اور فائر بندی کے بعد کے ایک ولولہ انگیز تصادم کی کہانی سناؤں گا۔ یہ لاہور کی دفاعی جنگ کی مکمل روئیداد نہیں بلکہ اس طویل روئیداد کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ یہ تھرڈ بلوچ رجمنٹ کے پیش امام مولوی فضلِ عظیم اور اس رجمنٹ کی 'اے' اور 'بی' کمپنی کے صرف چند ایک افراد کی مختصر سی داستان ہے۔

فائر بندی کی صبح جب میں لاشوں اور سیاہ دھوئیں کے دیس میں بی آر بی کے کنارے تھرڈ بلوچ کے مورچوں کے قریب کھڑا تھا تو مجھے جنگی ترانہ سنائی دیا "خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام" ــــ میں سمجھا کسی مورچے میں جوانوں نے ٹرانسسٹر لگا رکھا ہوگا لیکن میرے قریب کھڑے مجاہد نے ہنس کر کہا "ہمارے امام صاحب اپنا کام کر رہے ہیں۔ جنگ کے دوران بھی وہ ہمیں تلاوت اور ترانوں سے گرماتے رہے ہیں" ــــ اس نے تھکی تھکی مگر فاتحانہ آہ بھر کر کہا ــــ "آپ اخباروں رسالوں والے اس قوت کو نہ جانے کن الفاظ میں بیان کریں۔ میں اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں، یہی کچھ بتا سکتا ہوں کہ یہی وہ قوت تھی جس نے ہمیں اتنے طاقت ور دشمن سے لڑا دیا اور سامنے دیکھئے کہ دشمن کی اس ہیبت ناک طاقت کا کیا حشر ہوا ہے۔ پھر ہمارے مورچوں میں جھانکئے تو آپ حیران ہو کر پوچھتے پھریں گے کہ کیا ان ہی چند ایک انسانوں نے لاشوں کے وہ ڈھیر لگائے ہیں جو سامنے نظر آ رہے ہیں؟ میں خود لڑا ہوں اور خود ہی حیران ہوں"۔

وہ خود ہی حیران نہیں تھا بلکہ ساری دنیا آج تک انگشت بدنداں ہے کہ ان چند ایک انسانوں نے یہ معجزہ کس طرح کر دکھایا۔

کشمیر کی عصمت کی خاطر

میں ٹہلتا ٹہلتا مورچوں میں جھانکنے لگا اور اچانک میرے سامنے خاکی کپڑوں میں ملبوس ایک شخصیت آن کھڑی ہوئی جس کا نام مولوی فضلِ عظیم ہے۔ ان کی داڑھی گرد آلود تھی۔ چہرے پر تھکن لیکن فاتحانہ جلال، تھکن اور شب بیداری کے اثرات پر غالب تھا۔

مولوی صاحب ۱۹۵۴ء سے اس بٹالین کے پیش امام ہیں۔ بچپن سے ہی مذہب کی لگن سے سرشار تھے لیکن جوانی میں انہیں مسجد کی امامت پیش

کی گئی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ صرف امامت ان کی روح کو تسکین نہیں دے سکتی تھی۔ انہوں نے حق و باطل کے معرکوں کی چودہ سو سالہ تاریخ ازبر کی ہوئی تھی جس نے ان کے سینے میں الاؤ بھڑکا رکھا تھا۔ جب انہیں پاک فوج کی ایک بٹالین کی امامت کا موقع ملا تو انہوں نے بسر و چشم قبول کر لیا۔ یہی ان کا روحانی مقام تھا۔ انہوں نے اپنی بٹالین کے جوانوں کے ذہنوں سے وہ افسانوی روایات اور حکایات دھو ڈالیں جو اسلام کے اوّلین مجاہدوں کے متعلق گھڑی گئی تھیں۔ انہوں نے جوانوں کو حقیقی روایات سے روشناس کرایا اور انہیں حرب و ضرب کے اس فلسفے سے آگاہ کیا جو قرآن نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ان اسباق سے انہوں نے جوانوں میں خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کی قوت بیدار کی اور انہیں حزب اللہ بنا دیا۔

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز جب پاک فوج کے گولے اکھنور میں گر رہے تھے اور بھارتیوں کو کشمیر ہاتھ سے جاتا نظر آ رہا تھا تو ان کے سامنے اب یہی ایک چال رہ گئی تھی کہ پاکستان پر حملہ کر کے ہماری طاقت کو ڈیڑھ ہزار میل لمبے محاذ پر پھیلا دیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندو اپنے پرانے خواب کو بھی حقیقت کا روپ دینے کی فکر میں تھا کہ پاکستان کو جنگی قوت سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ ہندو اپنی جنگی قوت پر جتنا بھی ناز کرتا کم تھا۔ پاک فوج چھمب جوڑیاں کی کامیابی اور ہندو کے عزائم کے پیش نظر چوکنی تھی۔

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز لاہور ڈویژن کی تھرڈ بلوچ رجمنٹ کو حکم ملا کہ رات کے وقت بی آر بی کے کنارے اپنی دفاعی پوزیشنیں سنبھال لے۔ اس بٹالین کی اے کمپنی میجر (اب کرنل) انور حسین شاہ ستارۂ جرأت کے زیر کمان بی آر بی سے آگے پہلے ہی مورچوں میں پہنچ چکی تھی۔ باقی بٹالین کو پریڈ گراؤنڈ میں اکٹھا کیا گیا۔ بٹالین کمانڈر کرنل (اب بریگیڈیئر) تجمل حسین جوانوں کو تاریخ پاکستان کی پہلی جنگ کے لیے تیاری کا حکم دینے والے تھے۔ یہ ایک تاریخی لمحہ تھا جب جوانوں کو بتانا

تھا کہ وطن کی سرحدوں پر خون کے نذرانے دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ کسی بھی جوان نے جنگ نہیں دیکھی تھی۔ وہ شہید کے رتبے سے آگاہ تھے لیکن کسی کو شہید ہوتے ابھی دیکھا نہیں تھا۔ انہیں شہادت کے لیے تیار کرنا تھا۔

مولوی فضلِ عظیم نے اس تاریخی تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن سے کیا اور سورۃ النساء کی یہ آیت پڑھی۔

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ نہ لڑو اللہ کی راہ میں اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے واسطے جو یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں اور ہمیں اپنے پاس سے کوئی مددگار دے دے۔ (سورۃ النساء : ۷۵)

پھر اس آیت کا ترجمہ سنایا اور مختصر سی ایک تقریر کی جس میں بتایا کہ ہندو کس طرح خدا اور رسولؐ کے نام لیواؤں کا گلا دباتا چلا جا رہا ہے۔ مولوی صاحب نے حیدر آباد، جوناگڑھ اور کشمیر پر ہندو کے استبداد اور مظالم اور ہندوستان میں مسلم کشی کا تذکرہ کر کے کہا ـــ "محمد بن قاسم ایک لڑکی کی پکار پر صحراؤں، جنگلوں، دریاؤں اور چٹانوں کو روندتا ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ پاکستان کے جوانو! آج تمہیں کشمیر کی ہزاروں لڑکیاں پکار رہی ہیں۔ تم آج ان بیٹیوں اور بہنوں کی عصمتوں کو درندوں سے بچانے جا رہے ہو۔ تم سے قرآن پوچھ رہا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان مظلوموں کی مدد کو نہیں پہنچتے"۔

کرنل تجمل حسین اپنے افسروں کو ضروری ہدایات دے چکے تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب کی تقریر کے بعد بٹالین سے خطاب کرتے ہوئے جنگ کے مقصد کی وضاحت کی اور جوانوں کو یاد دلایا کہ تم اللہ کے سپاہی ہو اور خدا اور رسولؐ کے نام پر ایسے دشمن کے مقابلے میں جا رہے ہو جو اس ملک سے اسلام کا نام و نشان مٹانے کے لیے آ رہا ہے۔

جوانوں کے سینے نعروں سے پھٹنے لگے۔

دو سجدوں کی مہلت

رات بارہ بجے تک بٹالین بی آر بی کے کنارے پہنچ گئی۔

دشمن کا پندرھواں انفنٹری ڈویژن جنرل نرنجن پرشاد کی زیر کمان اس زعم میں باٹا پور کی طرف بڑھا آ رہا تھا کہ لاہور کے دفاعی مورچوں کو ریت کے گھروندوں کی طرح روندتا سورج طلوع ہونے تک شالامار باغ تک پہنچ جائے گا۔ جنگی قوت اور اسلحہ بارود کی افراط کے بل بوتے پر جنرل نرنجن پرشاد اور جنرل چوہدری اپنے آپ کو اس سے بھی بڑی خوش فہمی میں مبتلا کر سکتے تھے۔ ان کا پندرھواں انفنٹری ڈویژن جس کے ساتھ ایک ٹینک رجمنٹ اضافی، کمک کے لیے نمبر تیئیس ماؤنٹین ڈویژن اور فوری مدد کے لیے نمبر پچاس چھاتہ بردار بریگیڈ تھا رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں آہن و آتش کے طوفان کی طرح بڑھا آ رہا تھا۔ آگے ٹینک اور ٹینکوں کے ساتھ انفنٹری تھی۔ ترتیب جچی تلی اور ملاپ بے عیب۔ اِس طوفان کو آتشیں چھاتہ اور امدادی فائر دینے کے لیے عقب میں تین سو توپوں کا توپ خانہ پوزیشن میں آ چکا تھا اور پٹھانکوٹ، ہلواڑہ اور آدم پور میں انڈین ایئر فورس کے لڑاکا بمبار طیارے صبح کی پہلی روشنی پھیلنے کے انتظار میں تیار کھڑے تھے۔

آگ اگلتے لوہے کے بھاگتے دوڑتے قلعوں اور بیس ہزار کے آگ برساتے لشکر کو ڈوگرئی گاؤں سے گذر کر باٹا پور کے پُل سے نہر کو عبور کرنا تھا، جسے روکنے کے لیے تھرڈ بلوچ کی اے کمپنی کی تین پلاٹونیں ـــ نمبر ۱ نائب صوبیدار غلام رسول، نمبر ۲ صوبیدار محمد ایوب اور نمبر ۳ نائب صوبیدار جلال الدین کی زیر کمان بی آر بی سے آگے ڈوگرئی کے دائیں بائیں مورچہ بند ہو رہی تھیں۔ کمپنی کمانڈر میجر (اب کرنل) انور حسین شاہ ستارۂ جرأت تھے۔ 'بی' کمپنی کی تینوں پلاٹونیں۔ نمبر ۴ صوبیدار سمیر خان، نمبر ۵ نائب صوبیدار لال حسین اور نمبر ۶ نائب صوبیدار غلام لیٰسین کی زیر کمان 'اے' کمپنی کے دائیں اپر باری دوآب اور منہالہ ٹریک

کے درمیانی علاقے میں مورچے تیار کر رہی تھیں۔ کمپنی کمانڈر کیپٹن (اب میجر) ملک محمد نواز تھے۔ ان دونوں کمپنیوں کی نفری تین سو تیرہ کے لگ بھگ تھی۔ انہیں آج بدر کی تاریخ کو دہرانا تھا (غیر ملکی جنگی وقائع نگاروں نے اس میدان میں لڑے جانے والے معرکوں کی شدت، پاکستانیوں کی بے جگری اور بھارتیوں کی تباہی کو اپنی آنکھوں دیکھ کر اس میدان کو واٹر لو سے تشبیہ دی تھی)

دشمن کو اپنے طاقت کا اس قدر غرور اور تکبر تھا کہ اس نے حملہ توپ خانے کی گولہ باری کے بغیر کیا تھا۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ پاکستانیوں کے پاس فوج ہی کتنی ہے جس پر توپخانے کا ایمونیشن ضائع کیا جائے۔ پیادہ اور بکتر بند دستے مزاحمت کے بغیر ہی بی آر بی پار کر جائیں گے۔ بھارتیوں نے ابتدا میں چھوٹے ہتھیار فائر کئے۔ ان کے آگے سرحدی دیہات کے لوگ بی آر بی کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے جن میں عورتوں اور بچوں کی بھگدڑ اور چیخ و پکار دل خراش تھی جس نے لاہور کے دفاعی دستوں کو آگ بگولا کر دیا۔

جب بٹالین کمانڈر کرنل تجمل حسین کو اطلاع ملی کہ حملہ شروع ہو چکا ہے، اس وقت مسجدوں سے صبح کی اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ کرنل تجمل حسین نے اپنے پاس کھڑے ایک افسر سے کہا — "خدائے ذوالجلال مجھے دو سجدوں کی مہلت عطا فرما دے" — وہ قبلہ رو ہو گئے۔ سر پر فولادی خود اور پاؤں میں بڑے بوٹ تھے۔ اسی حالت میں انہوں نے صبح کی نماز ادا کی اور اٹھ کھڑے ہوئے — دشمن ان کی بٹالین کی اے کمپنی کے مورچوں سے تھوڑی دور رہ گیا تھا۔

پو پھٹ رہی تھی جب ڈوگرئی کے بائیں طرف اے کمپنی کو دشمن کے ٹینک نظر آئے۔ ان کی مشین گنیں آگ برسا رہی تھیں۔ بڑی توپیں بھی گولے داغ رہی تھیں لیکن زیادہ تر فائر مشین گنوں کا تھا۔ کمپنی کی آر آر (ٹینک شکن گن) جو جیپ پر نصب تھی، مورچے میں تھی۔ جیپ کا ڈرائیور سپاہی (اب لانس حوالدار) اکبر علی تمغۂ جرأت تھا۔ گن کے نمبر، لانس نائک (اب حوالدار) خادم شاہ اور لانس نائک (اب نائک) رزاق تھے اور اس پارٹی کا کمانڈر گوجر خان ضلع

راولپنڈی کا رہنے والا نائک محمد شریف شہید تھا۔ انہیں بائیں طرف پانچ سو گز دور دشمن کے ٹینک نظر آئے۔ ٹینکوں کی ترتیب یہ تھی کہ تین ٹینک آگے آگے تھے جن کی مشین گنیں فائر کر رہی تھیں اور تین ٹینک ان کے پیچھے تھے جن کی بڑی توپیں گولہ باری کر رہی تھیں۔ ساری ٹینک رجمنٹ اسی ترتیب میں آگ برساتی چلی آ رہی تھی۔ نائک شریف کو پہلے تین ٹینک اور ان کے پیچھے بھی تین ٹینک نظر آئے تو اس نے پہلا گولہ فائر کیا جو ٹھیک نشانے پر لگا۔ انڈین آرمی کا پہلا ٹینک دھماکے سے پھٹا اور اسے شعلے چاٹنے لگے۔ یہ پاک فوج کی پہلی ضرب تھی جو کاری ثابت ہوئی۔ نائک شریف کا گولہ جنرل چوہدری کے اس اعلان کا جواب تھا کہ وہ نو بجے لاہور میں جشن فتح منائے گا۔

پہلا گولہ فائر ہونے سے دشمن کو نائک شریف کی آر آر کے مورچے کا پتہ چل گیا۔ بے شمار ٹینکوں اور انفنٹری نے تمام تر ہتھیاروں کا فائر اسی ایک مورچے پر مرکوز کر دیا۔

ٹینکوں کے پٹوں اور دونوں طرف کے فائر سے گرد و غبار اتنا ہو گیا تھا کہ نظر دور تک کام نہیں کرتی تھی۔ نائک شریف آگ کی بارش میں مورچے سے باہر جا کر دشمن کے ٹینکوں کو دیکھنے لگا۔ اب گن پر جیپ کا ڈرائیور سپاہی اکبر علی بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک ٹینک ڈوگرئی کے قبرستان کی طرف سے بہت ہی قریب آ گیا تھا۔ اکبر علی نے اس ٹینک پر گولہ فائر کیا۔ یہ ٹینک بھی جلنے لگا۔ یکے بعد دیگرے دو ٹینکوں کی تباہی سے رجمنٹ کمانڈر پیش قدمی میں محتاط ہو جایا کرتے ہیں۔ بھارتیوں نے بھی پیش قدمی کی رفتار سست کر لی۔ شریف اور اکبر نے انہیں احساس دلا دیا تھا کہ پاک فوج کے مورچے ریت کے گھروندے نہیں ہیں۔

نائک شریف کے پاس صرف دس گولے تھے۔ اتنی جلدی مزید ایمونیشن کی توقع نہیں تھی کیونکہ دشمن کے ٹینکوں کی گولہ باری اور چھوٹے ہتھیاروں کے قیامت خیز فائر نے اگلے مورچوں تک ایمونیشن پہنچانے کے راستے مسدود کر دیے تھے۔ اس آر آر پارٹی نے دس میں سے نو گولے فائر کر دیے۔ فائر بندی

کی صبح جب میں اکبر علی سے باٹا پور کے قریب اسی آر آر والی جیپ کے قریب کھڑے ملا تو اس نے بتایا کہ دو ٹینکوں کے متعلق تو پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جل گئے تھے پھر گرد و غبار بہت ہی زیادہ ہو گیا تھا۔ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس گرد و غبار میں جو ٹینک ہلتا جلتا دکھائی دیتا تھا۔ گولہ فائر کرنے کے بعد اس کی حرکت دوبارہ نظر نہیں آتی تھی۔

ان کے مورچے پر جو گولہ باری ہو رہی تھی، اس کے متعلق اکبر علی نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ ـــ "بیان نہیں کر سکتا ـــ" اور اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اس گولہ باری کے تصور سے وہ اب بھی لرز رہا ہے۔

ان کے پاس جب ایک گولہ رہ گیا تو نائک شریف نے اکبر علی سے کہا کہ جیپ کو مورچے سے نکالو۔ ہم پیچھے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ہو سکتا ہے گاؤں کے اندر ایمونیشن پہنچ جائے۔ ان کے لوگوں نے دشمن کی پیش قدمی کی رفتار اور شدت بہت ہی کم کر دی تھی مگر ان کے لیے مورچے سے نکل کر پیچھے آنا آسان نہ تھا۔ تاہم اکبر علی نے جیپ کو مورچے سے نکالا۔ دشمن کا مرکوز فائر ان کے مورچے پر آ رہا تھا جس کے گرد و غبار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر علی نے جیپ کو انتہائی رفتار پر باٹا پور کے پُل تک پہنچا دیا۔ فائر کا یہ عالم تھا کہ ہوا میں گولوں اور گولیوں نے جال تن دیا تھا۔ زمین کا کوئی انچ محفوظ نہیں تھا اور کوئی بھی لمحہ زندگی کا آخری لمحہ ہو سکتا تھا۔

جب جیپ پُل کے قریب آئی تو دیکھا کہ پُل پر ایک جگہ خاصا بڑا شگاف تھا۔ یہ پُل اڑانے کی پہلی کوشش تھی۔ حملے کی شدت اور دشمن کی قوت کو دیکھتے ہوئے جنرل سرفراز خان نے پل اڑا دینے کا حکم دیا تھا لیکن پُل اس قدر مضبوط ثابت ہوا کہ ایک جگہ شگاف ہو گیا اور پُل کھڑا رہا۔ اکبر علی نے شگاف کو دیکھ کر کہا کہ جیپ گذر جائے گی۔ سڑک کا خاصا حصہ محفوظ تھا۔ وہ جیپ کو پُل سے گذارنے لگا تو

ایک پہیہ شگاف میں دھنس گیا۔ یہ سڑک سیدھی ڈوگرئی میں سے گذرتی ہے دشمن کے چند ایک ٹینک دور اسی سڑک پر چلے آ رہے تھے۔ جہاں سے پُل نظر آ رہا تھا۔ ٹینکوں کو جیپ نظر آئی تو انہوں نے گولہ باری شروع کر دی جیپ پھنسی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں اجازت ہوتی ہے کہ گاڑی کو چھوڑ دو اور اپنی جانیں بچاؤ لیکن نائک شریف، لانس نائک خادم شاہ، لانس نائک رزاق اور سپاہی اکبر علی نے اتنی بے تحاشا گولا باری اور دوسری فائرنگ میں جیپ کو اٹھا لیا اور اس کا پہیہ شگاف سے نکال کر جیپ کو پیچھے دھکیل دیا۔ اکبر علی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے کمانڈنگ کرنل تجمل حسین بریگیڈیئر آفتاب احمد اور کمپنی کمانڈر میجر انور حسین شاہ پُل کی دوسری طرف سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ چلا چلا کر کچھ کہہ رہے تھے لیکن فائرنگ کے زناٹوں اور دھماکوں میں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ شاید یہی کچھ کہہ رہے ہوں گے کہ جیپ کو وہیں چھوڑ کر اس طرف آ جاؤ لیکن ہم اچھی بھلی جیپ اور گن کو دشمن کے لیے کیسے پیچھے چھوڑ دیتے۔

شریف پُل پر قربان ہو گیا

اجونہی جیپ شگاف سے نکلی، اس قدر فائر آیا کہ لانس نائک خادم شاہ اور لانس نائک رزاق شاید پل کی آڑ میں ہو گئے۔ اکبر علی سٹیرنگ پر اور نائک شریف اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ فائر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اکبر علی نے جیپ کو پیچھے کیا۔ جب گاڑی کو سیدھا کرنے لگا تو دشمن کے کسی ٹینک کا ایک گولہ نائک شریف کے جسم کو پیٹھ سے کندھوں کے بلیڈوں کو، کاٹتا گذر گیا۔ نائک شریف جیپ سے نیچے جا پڑا اور فوراً ہی شہید ہو گیا۔ سپاہی اکبر علی لاش کی طرف توجہ دینے کی حالت میں نہیں تھا۔ اس کے ارد گرد گولے پھٹ رہے تھے اور گولیوں کی بوچھاڑیں آ رہی تھیں۔ وہ اب بالکل اکیلا تھا۔ وہ جیپ اور گن کو تباہی سے بچانا چاہتا تھا۔ اس نے جیپ کو دوبارہ پُل پر لانے کی بجائے بی آر

بی کے ساتھ ساتھ گاؤں کے دائیں طرف موڑ لیا اور اَپر باری دوآب نہر کی سمت چلا گیا۔ اس طرف بی آر بی پر لکڑی کا ایک پُل تھا جس سے جیپ گذاری جا سکتی تھی۔

آگے اس کی بٹالین کی 'بی' کمپنی کے مورچے تھے۔ اس طرف بھی دشمن حملہ کر چکا تھا۔ اس کے ٹینک اور پیادہ دستے تیزی سے بڑھے آ رہے تھے۔ اَپر باری دوآب نہر اور ریلوے لائن کے درمیانی علاقے میں 'بی' کمپنی کی آر آر گن مورچے میں تھی۔ ذرا تصور فرمائیے کہ یہاں بھی اتنے سارے ٹینکوں کے مقابلے میں صرف ایک ٹینک شکن گن تھی۔ اس گن پر حوالدار برکت، لانس نائک نجمل اور لانس نائک محمد عارف شہید تھے۔ کمپنی کمانڈر کیپٹن ملک محمد انور نے جان کا خطرہ مول لیا اور بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دشمن کے ٹینکوں کو دیکھا اور آر آر کا فائر کرایا۔

سپاہی اکبر علی اس علاقے میں آر آر کی جیپ لے کے پہنچ چکا تھا۔ اسے لکڑی کے پُل سے پیچھے آنا تھا لیکن دُور گرد و غبار میں اسے دشمن کے ٹینک نظر آئے۔ اس کے پاس ایک گولا تھا۔ اس نے جیپ روکی، گولا گن میں ڈالا اور ایک ٹینک کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ یہ ٹینک جلا تو نہیں لیکن رُک کر ساکن ہو گیا جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ٹینک بیکار ہو گیا ہے۔ اِدھر حوالدار برکت کی گن فائر کرنے لگی تھی۔ اس سے دشمن کے ٹینکوں کی پیش قدمی رک گئی اور انفنٹری بڑھتی آئی۔

انفنٹری اس قدر قریب آ گئی تھی کہ بمشکل تین سو گز دور سے سکھوں کا نعرہ سنائی دیا ـــــ "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال" ـــــ یہ نعرہ سکھوں کا چیلنج تھا۔ وہ پورے جوش و خروش سے آ رہے تھے۔ اِدھر سے نعرۂ حیدری کی گرج اٹھی اور سکھوں پر چھوٹے فائر کی بارش برسنے لگی۔ لانس نائک مصری اپنی مشین گن لے کر ایک مکان پر چڑھ گیا جہاں سے وہ دشمن کو نظر آ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اسے گولی لگی لیکن وہ زخمی حالت میں مشین گن فائر کرتا رہا۔ حوالدار عزیز نے ایک ٹیکری پر میڈیم مشین گن لگائی۔ ایک مشین گن پر حوالدار شفیع تھا جسے گولیاں لگیں، لیکن

گوشت سے گذر گئیں، ہڈیاں بچ گئیں۔ اس کا خون بہتا رہا اور اس کی مشین گن آگ اگلتی رہی۔

باٹا پور کے دائیں طرف درختوں کے ایک جھنڈ میں مارٹر بیٹری پوزیشن میں تھی۔ توپ خانے کا 'او پی' ایک نائب صوبیدار ڈوگرئی کے کسی مکان کی چھت پر کھڑا فائر آرڈر دے رہا تھا۔ اس مارٹر بیٹری نے گاؤں کے سامنے اور دائیں ایسا جچا تُلا اور اس قدر تیز فائر کیا کہ دشمن آگ کی اس دیوار سے آگے نہ بڑھ سکا۔ سکھوں کو دوسری بار ست سری اکال کا نعرہ لگانے کی فرصت نہ ملی۔ ہندو اور سکھ بُری طرح ہلاک اور زخمی ہو رہے تھے۔ یہ نائب صوبیدار جو ڈوگرئی میں 'او پی' تھا، دشمن کے گھیرے میں آ کر بھی فائر کرواتا رہا۔ جب گھیرے سے نکل کر بی آر بی کی طرف آ رہا تھا تو شہید ہو گیا۔ (افسوس ہے نام معلوم نہیں ہو سکا۔)

سپاہی اکبر علی کے پاس اب جیپ اور خالی آر آر گن تھی۔ وہ آخری گولا بھی فائر کر چکا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ نمبر ۲ پلاٹون کا سپاہی اکبر شدید زخمی ہو کے بے ہوش پڑا ہے۔ اکبر علی نے اسے جیپ میں ڈالا اور لکڑی کے پُل سے جیپ گذار کر زخمی کو رجمنٹل ایڈ پوسٹ تک پہنچایا۔ وہاں سے باٹا پور چلا گیا۔ جہاں اسے اسی گن کے دونوں افراد، لانس نائک رزاق اور لانس نائک خادم شاہ مل گئے اور پارٹی کی کمان حوالدار میجر لال حسین نے لے لی جو فوراً بعد گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا۔

وہ آج تک پیچھے نہیں ہٹا

باٹا پور کے پُل پر کیفیت یہ تھی کہ اس طرف کوئی آڑ نہیں تھی۔ دوسری طرف دشمن ڈوگرئی کے مکانوں میں مورچے قائم کر رہا تھا۔ پُل اور ارد گرد کا علاقہ اس کے قیامت خیز فائر کے قبضے میں تھا۔ سامنے سڑک پر دشمن کے ٹینک چلے آ رہے تھے جنہیں پُل عبور کرنے سے روکنے کے لیے آر آر گنوں کے لیے کوئی

آڑ نہیں تھی۔ گن کو سامنے لانا جیپ اور گن کو گولہ فائر کیے بغیر تباہ کرانے کے برابر تھا۔ مکانوں کے روشندانوں اور کھڑکیوں سے دشمن کی مشین گنیں کسی کو سامنے آنے نہیں دے رہی تھیں۔

اس دوران اُسے، کمپنی کو بی آر بی کے اگلے مورچے چھوڑ کر پیچھے آنے کا حکم مل چکا تھا کیونکہ پُل اُڑانا تھا۔ پلاٹونیں پیچھے آ گئیں۔ لیکن ایک نوجوان سپاہی محمد حیات جو نیا نیا ٹریننگ سنٹر سے بٹالین میں شامل ہوا تھا، مورچے میں ہی رہا۔ اُس کے ساتھی کے بیان کے مطابق اس کے پاس چالیس راؤنڈ رہ گئے تھے۔ پیچھے آنے کا حکم ملا تو اس نے غصے سے کہا کہ اگر پیچھے ہٹانا تھا تو مجھے ایمونیشن کیوں دیا تھا۔ میں یہ راؤنڈ فائر کر کے پیچھے آؤں گا —— وہ آج تک پیچھے نہیں آیا۔ اس کی لاش نہیں مل سکی تھی۔

سپاہی محمد حیات کے متعلق فائر بندی کے بعد دشمن نے بتایا کہ جب اُسے، کمپنی مورچے چھوڑ کر پیچھے آ گئی اور دشمن آگے بڑھنے لگا تو ایک مورچے سے ایک رائفل فائر ہوتی رہی۔ اس رائفل کی کوئی گولی خطا نہیں جاتی تھی۔ آخر یہ رائفل خاموش ہو گئی۔ دشمن کے بیان کے مطابق اس مورچے کو گھیرے میں لیا گیا جہاں صرف ایک پاکستانی نوجوان خالی رائفل تھامے کھڑا تھا۔ یہ سپاہی محمد حیات تھا جو چالیس راؤنڈ فائر کر کے چالیس سورمے اوندھے کر چکا تھا۔ دشمن نے اسے ہتھیار ڈالنے کے لیے للکارا لیکن وہ دست بدست مقابلے پر اُتر آیا۔ وہ آخر اکیلا تھا۔ دشمن نے اس پر قابو پا لیا۔ دشمن کے ایک افسر نے اعتراف کیا کہ اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر سنگینوں سے مار ا گیا تھا —— سپاہی محمد حیات وطن کی دہلیز پر قربان ہو گیا۔

جان پر کھیلنے کے مظاہرے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ایک مضمون میں سمٹینا ممکن نہیں۔ ان چند ایک جانبازوں کو میں پاک فوج کی شجاعت کی علامت کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ تھرڈ بلوچ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل تجمل حسین وہ مردِ مومن ہیں جنہوں نے سرفروشی کی مثال قائم کی۔ انہوں نے باٹاپور پُل کو دشمن سے چھڑانے کے لیے توپ خانے کو ایسا فائر آرڈر دیا کہ گولے ان کے اپنے مورچے پر گرتے۔

وہ پُل کے قریب تھے اور قریب ہی ان کی بٹالین کے مورچے تھے۔ بیٹری کمانڈر میجر اسماعیل کو کرنل تجمل حسین کی پوزیشن کا علم تھا۔ انہوں نے ایسا فائر دینے سے انکار کر دیا لیکن کرنل تجمل حسین نے انہیں کہا کہ ہمیں مت بچاؤ، لاہور کو بچاؤ —— اور میجر اسماعیل نے گولے فائر کروا دیے جس سے اپنے چند ایک جوان زخمی ہو گئے لیکن گولہ باری کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ اس کے باوجود کرنل صاحب کسی کو یقین نہیں دلا سکتے تھے کہ وہ لاہور کو بچانے کے لیے باٹاپور کا دروازہ بند کر چکے ہیں۔ آگ کا طوفان بڑھا آ رہا تھا۔ اتنی کامیابی ضرور ہوئی تھی کہ افسروں اور جوانوں نے ذاتی شجاعت اور بے جگری سے دشمن کا یہ زعم خاک میں ملا دیا تھا کہ وہ نو بجے تک لاہور پر قبضہ کر کے جشنِ فتح منائے گا۔

دشمن کے پاس ٹینکوں، توپوں اور انفنٹری کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جب دشمن کے توپ خانے کی گولہ باری شروع ہوئی تو زمین و آسمان لرزنے لگے۔ بم، لوہے کے ٹکڑے اور پتھر اُڑ رہے تھے اور حملے کی شدت کو برقرار رکھنے کے لیے دشمن نے اب تازہ دم یونٹوں کو آگے کر دیا تھا۔ یہ باٹاپور کے معرکے کا دوسرا PHASE تھا۔ باٹاپور پُل کی طرف دشمن کے ٹینک چلے آ رہے تھے۔ پُل ابھی اڑا نہیں تھا۔ پہلی کوشش سے جو شگاف ہوا تھا وہ ٹینکوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھا۔ ٹینکوں کو صرف ٹینک شکن اسلحہ روک سکتا تھا مگر اس طرف کوئی آڑ نہیں تھی۔ لاہور کی قسمت کا اللہ حافظ تھا۔

پُل کی پاسباں —— ایک لاش

ایسے مشکل وقت میں خدا نے آڑ مہیا کر دی۔ یہ ایک بیل گاڑی تھی جو ہرے چارے سے لدی ہوئی ڈوگرائی کی طرف سے آ کر پُل سے گزر رہی تھی۔ تھرڈ بلوچ کی ڈی، کمپنی کی دو آر آر گنیں آگے بلائی گئی تھیں۔ کرنل تجمل حسین نے اس گاڑی کو روک لیا۔ گاڑی بان کو بیل کھول کر دور ہٹ جانے کو کہا اور نائک اسلم

کو آر آر گن والی جیپ آگے لانے کو کہا۔ ذرا سی دیر میں جیپ بیل گاڑی کی آڑ میں ہو گئی اور نائک اسلم نے اس آڑ سے پہلا گولا فائر کیا جو ٹھکانے پر لگا۔ دشمن نے بھی جوابی فائر کیا جس میں سے ایک گولا بیل گاڑی کے لدے ہوئے ہرے چارے میں پھٹا اور جیپ بمعہ گن محفوظ رہی۔ اس سے ٹینکوں کی پیش قدمی رُک گئی۔

پُل کی حفاظت کے لیے دشمن کی اتنی زیادہ بکتر بند قوت کے مقابلے میں یہی ایک آر آر تھی یا نائک شریف شہید کی لاش تھی جو پُل کے پار ٹینکوں کے راستے میں پڑی تھی۔

۲۳ ستمبر کی صبح جب میں باٹا پور کے محاذ پر جنگ کے فوری بعد کے مناظر دیکھ رہا تھا تو کرنل تجمل حسین سے سرراہے ملاقات ہو گئی۔ ان کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا اور آنکھوں میں شب بیداری کی سرخی تھی۔ میں نے ان سے بیل گاڑی کے متعلق بات کی تو انہوں نے عجز و انکسار کے لہجے میں کہا "اسے ہم خدائی مدد کہا کرتے ہیں۔ ہماری ٹریننگ کی کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ جب دشمن حملہ کرے گا تو اس کے آگے آگے ایک بیل گاڑی آ رہی ہو گی۔ اس بیل گاڑی کی آڑ سے دشمن کے ٹینکوں پر آر آر فائر کرو۔ یہ اللہ کا کرم تھا۔ ہم اسی کے نام پر لڑے تھے۔ اس کی ذات نے اپنے نام کی لاج رکھ لی"۔۔۔ وہ ہر بات میں کئی کئی بار خدا کا نام لیتے تھے۔

ذرا ہی پرے نائک شریف شہید کی آر آر والی جیپ کھڑی تھی جس کے قریب سپاہی اکبر علی کھڑا پُل کے اُس طرف اُس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں نائک شریف شہید گرا تھا۔ اکبر علی کے دبلے پتلے، لمبوترے سے جسم اور پچکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر گماں بھی نہیں ہوتا کہ اس شخص نے اتنا بڑا کارنامہ کر دکھایا ہے۔ جس کے صلے میں اسے تمغۂ جرأت دیا گیا ہے۔ مولوی فضل عظیم صاحب نے اس سے تعارف کرایا اور اس کی بہادری کا قصہ سنایا تو اکبر علی عجز سے سر جھکا کر بولا ـــ "سب اللہ کا کرم ہے صاحب! ہم تو مٹی کے پتلے ہیں"۔

چھ ستمبر صبح کے نو بجے تک دشمن کی یلغار کی پہلی موج WAVE کو لہولہان کر کے بی آر بی کے پار لاشوں کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ نو بجے یلغار کی دوسری موج آئی۔ یہ پہلی سے زیادہ شدید، پُرعتاب اور تازہ دم تھی۔ گیارہ بجے تک اس کا بھی دم خم توڑ دیا گیا لیکن باٹا پور کا پُل ابھی تک کھڑا دونوں ملکوں کی فوجوں کے لیے چیلنج بنا ہوا تھا۔ دشمن پُل کو بی آر بی عبور کرنے کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا اور پاکستانی پُل کو اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دشمن کو یہ سہولت بھی حاصل ہو گئی تھی کہ وہ ڈوگرئی گاؤں کے مکانوں میں مورچہ بند ہو گیا تھا جہاں سے وہ صرف پُل کو ہی نہیں، پُل سے دور آگے تک کے علاقے کو فائر سے کمانڈ کر رہا تھا۔ BUILT-UP AREA جس کے ہاتھ آ جاتے وہ آدھی جنگ جیت لیتا ہے۔ ہندوستانیوں نے پُل کو کمانڈ میں لے لیا تھا لیکن اس قدر جنگی قوت اور بکتر بند دستوں کے باوجود وہ پُل کو پار نہ کر سکے۔ یہ تھرڈ بلوچ کے مردانِ آہن کی جانبازی کا کرشمہ تھا۔

پاک فضائیہ کے شاہبازوں، پاک فوج کے توپ خانے اور راوی سائیفن سے ہڈیارہ سائیفن تک دوسری یونٹوں نے جس بے جگری اور بے مثال جذبے سے دشمن کی کمر توڑی وہ ایک الگ داستان ہے۔ میں صرف تھرڈ بلوچ کے چند ایک جانبازوں کی حب الوطنی اور بے خوفی کی مختصر سی باتیں بیان کر رہا ہوں۔ جنہوں نے دشمن کے SPEAR HEAD کو باٹا پور کے پُل پر کُند کیا تھا۔

چھ ستمبر دن کے گیارہ بجے تک دشمن کی دوسری موج کا بھی دم خم ایسی بُری طرح توڑ دیا گیا کہ محاذ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ایسا بھیانک سکوت کہ کوئی اکا دکا گولی یا بی آر بی کے اُس پار لاشوں میں پڑے ہوئے کسی زخمی ہند، یا سکھ کی آخری آہ و بکا مرتعش کر کے اسی سکوت میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ وائرلیس سیٹوں پر دشمن کے پیغامات کا واویلا اور افراتفری سنائی دے رہی تھی۔ بڑے افسر چھوٹے افسروں کو چھوٹے افسر سرداروں اور عہدیداروں کو وائرلیس پر گالیاں

دے رہے تھے۔ ہندوستانیوں کے بریگیڈ ہیڈکوارٹر اور ڈویژن ہیڈکوارٹر ہائی
کمان یا کور ہیڈکوارٹر کے عتاب کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ دشمن کے دو بریگیڈوں
کی بیشتر نفری بی آر بی سے سرحد تک لاشوں یا زخمیوں کی صورت میں تبدیل
ہو کر جنرل چوہدری کے کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ اب ہندوستانی ری گروپنگ کر
رہے تھے۔ نو بجے لاہور میں جشنِ فتح منانے کا خواب لاشوں تلے دب گیا تھا یا
تباہ شدہ ٹینکوں کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا تھا ——— باٹا پور پُل سینے میں سینکڑوں
گولے جذب کر کے اور ایک شگاف کے ساتھ پوری شان سے کھڑا ہندوستانیوں
کے لیے چیلنج بنا ہوا تھا ——— اور نائیک شریف کی لاش پُل کے اُس پار پُل کی
پاسبانی کر رہی تھی۔

محبت کی داستاں ختم ہوئی

دن کے بارہ بجے بٹالین کے پیش امام مولوی فضلِ عظیم محاذ پر پہنچ گئے۔
وہ اگلے مورچوں میں جانا چاہتے تھے لیکن کرنل تجمل حسین نے اس نہتے مجاہد کو
بٹالین ہیڈکوارٹر میں روک لیا۔ دن کے اڑھائی بجے مولوی صاحب کے پاس سب سے
پہلے شہید کی لاش آئی، وہ ان کے خصوصی شاگرد نائیک شریف کی تھی۔

بی آر بی کے کنارے پر کھڑے جب میں ہندوستانیوں کی لاشوں کے درمیان
جلتے ہوئے ٹینکوں اور ٹرکوں کے سیاہ دھوئیں کو دیکھ رہا تھا اور جب باٹا پور کے
آخری معرکے کے شہیدوں کی لاشیں میرے قریب سے گذر رہی تھیں، مولوی
فضلِ عظیم مجھے بتا رہے تھے کہ نائیک شریف نے ان سے قرآن پڑھا تھا اور وہ
نماز کا بہت ہی پابند تھا۔ وہ سینے میں محبت کی داستان لیے پھرتا تھا۔ اسے ایک
لڑکی سے محبت تھی۔ دونوں نے شادی کے عہد و پیمان کر رکھے تھے لیکن گھر اور
برادری کی دیواریں انہیں ملنے سے روک رہی تھیں۔ شریف شہید اپنے روحانی
استاد مولوی فضلِ عظیم صاحب کو اپنے دکھ درد سناتا رہتا تھا۔ محاذ پر جانے سے

پہلے اس نے مولوی صاحب کو وصیت کی تھی کہ میں شہید ہو جاؤں تو لون فنڈ
میں میرا جو پیسہ رجمنٹ میں جمع ہے وہ مسجد کو دے دیا جائے۔

کوئی مریض کرب اور درد کی حالت میں مر جائے تو لاش کے چہرے پر
درد کا تاثر ضرور ہوتا ہے۔ آنکھیں اور منہ کھلا رہتا ہے۔ گولی یا گولے سے
مرنے والے تڑپ تڑپ کر مرتے ہیں۔ بھارتیوں کی جتنی بھی لاشیں دیکھی
گئیں۔ ان کے منہ اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بعض کی زبانیں باہر نکل آئی
تھیں۔ بعض کی زبانیں دانتوں تلے آئی ہوئی تھیں اور لاشوں کے چہروں پر
ایسا ہیبت ناک تاثر تھا جیسے مرنے والے مر کر بھی درد کی شدت محسوس کر رہے
ہوں لیکن مولوی صاحب نے بتایا کہ نائیک شریف نے جو زخم کھایا تھا اس سے
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ لاش کا چہرہ دیکھنے کے قابل ہو گا ——— "لیکن اللہ کی
شان دیکھی ......" مولوی صاحب نے کہا ——— "نائیک شریف کی آنکھیں بند،
منہ بند، ہونٹ ذرا ذرا کھلے ہوئے جیسے مسکرا رہے ہوں اور چہرے پر ایسی
ملائمت اور رونق تھی کہ میں نے بے ساختہ میت کا منہ چوم لیا۔ یقین نہیں آتا
تھا کہ یہ لاش ہے۔ شریف گہری نیند سویا ہوا تھا" ——— اس کے بعد جتنے بھی شہیدوں
کی لاشیں آئیں، تمام کی تمام اسی پُرنور اور جلالی کیفیت میں تھیں۔

نہتے پیش امام کا معرکہ

۸ ستمبر کی صبح دشمن پر جوابی حملہ کر کے بی آر بی سے آگے پوزیشنیں قائم کر
لی گئی تھیں جو شجاعت اور فنی کمال کی الگ داستان ہے۔ اس کے بعد سولہ پنجاب رجمنٹ
کی 'اے' اور 'بی' کمپنی نے میجر امیر افضل خان اور کیپٹن صغیر حسین شہید کی
زیر کمان ڈوگرئی سے آگے مورچے قائم کیے۔ فائر بندی تک جان اور خون کی
بے دریغ قربانیاں دیں۔ تھرڈ بلوچ نے ان مورچوں BRIDGE HEAD
کو دائیں پہلو سے بے جگری سے مدد دی۔ میں چونکہ جنگ کے روحانی پہلو
کو واضح کر رہا ہوں اس لیے میں اسی پہلو کی طرف لوٹتا ہوں۔

۱۰ ستمبر مولوی فضل عظیم صاحب نے ایک جیپ لی، اس پر مائیکروفون اور لاؤڈ سپیکر فٹ کراتے، ایک ڈرائیور اور وائرلیس مکینک ساتھ لیا۔ کرنل تجمل حسین بھی مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر اگلے مورچوں کو روانہ ہوگئے۔ دشمن بی۔آر۔بی پار کرنے کے لیے بے تحاشا قربانی دے رہا تھا اور اپنے لشکر کو بے دردی سے مروا رہا تھا۔ گولہ باری کا یہ عالم کہ چپے چپے پر گولے پھٹ رہے تھے اور آسمان سے جیسے لوہے کے ٹکڑوں اور پتھروں کی بارش برس رہی تھی —— اور آگ کی اس بارش میں ایک آواز دھماکوں سے بھی بلند تر سنائی دے رہی تھی —— "اللہ کے سپاہیو! محمد الرسول اللہ صلعم اور ان کے عزیز ساتھیوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں یک جان ہو جاتے ہیں۔ آج تم اس دشمن سے لڑ رہے ہو جو قرآن کی سرزمین کو کفرستان میں ملانا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں تم میں سے کون زندہ رہے اور کون اس مقدس فرض کی ادائیگی میں جان دے دے۔ یاد رکھو شہید کی موت، کافر کی موت سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ تم اسلام کے نام پر لڑ رہے ہو، تمہارا مقصد کفر کو مٹانا ہے، کسی کے ملک پر قبضہ کرنا نہیں۔ آج قوم کی بیٹیوں کی نظریں تم پر لگی ہوئی ہیں" —— یہ آواز مولوی فضلِ عظیم کی تھی جسے لاؤڈ سپیکر اپنے مورچوں تک ہی نہیں، دشمن تک پہنچا رہے تھے۔ جیپ برستی آگ میں مورچے مورچے میں گھوم رہی تھی اور شہید کے رتبے کو واضح کرتی جا رہی تھی۔

مولوی صاحب کے بعد کرنل تجمل حسین بولتے تھے "جوانو! میں تمہارا سی او بول رہا ہوں" —— اور وہ جوانوں کو پُرعزم آواز میں جم کر مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قدم مضبوط رکھو اور دشمن سے ایک ایک مسلمان کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب چکا دو۔

اس کے بعد جیپ کے لاؤڈ سپیکر جنگی ترانے الاپنے لگتے تھے۔ اکثر اوقات مولوی صاحب پا پیادہ گولہ باری اور فائرنگ میں مورچوں میں چلے جاتے تھے۔ میں نے باٹا پور کے قریب کھڑے تھرڈ بلوچ کے چند ایک مجاہدوں سے مولوی

صاحب کی تقریر اور جنگی ترانوں کے متعلق پوچھا تو بی کمپنی کے نائب صوبیدار محمد سعید نے کہا —— "جناب، مولوی صاحب کی آواز اور ترانوں نے ہم میں آگ بھر دی تھی۔ معلوم نہیں صاحب وہ کونسی قوت تھی جو ہمارے جسموں اور روح میں پیدا ہو گئی تھی ورنہ صاحب، اتنی بڑی قیامت اور اتنے بڑے طوفان کو سینے پر روکنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں" —— نائب صوبیدار محمد سعید نے کہا —— "جب مورچوں میں گھومتی پھرتی جیپ سے یہ ترانہ بلند ہوتا تھا —— اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا۔ اللہ اکبر —— اس وقت خدا کی قسم مورچے میں بیٹھ کر فائرنگ کرنے کو ہم بزدلی سمجھنے لگتے تھے۔ ہم دشمن پر دست بدست جنگ کرنے کے لیے ٹوٹ پڑنے کو بے تاب ہونے لگتے تھے"۔

اور ہوا بھی ایسے ہی کہ تھرڈ بلوچ کی دو کمپنیوں کو بی۔آر۔بی سے آگے دشمن پر جوابی حملے کا حکم ملا تو جوان بجلی بن کر ٹوٹ پڑے۔ مولوی صاحب بھی روکنے کے باوجود اس حملے کے ساتھ ہی آگے چلے گئے۔ کہنے لگے کہ میں لڑ تو نہیں سکتا، کم از کم میرا وجود اور میری آواز تو جوانوں کے ساتھ رہے۔ اور جب جوانوں کو پتہ چلا کہ ان کے پیش امام صاحب بھی ساتھ ہیں تو جوانوں کو حملے کے بعد جس مقام پر رکنا تھا وہاں انہیں روکنا محال ہو گیا تھا۔ بعض جوانوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ ہم امرتسر سے اِدھر نہیں رُکیں گے۔ مولوی صاحب نے اس حملے کے دوران ظہر کی نماز بہت آگے پڑھی تھی۔

جب وہ پہلی بار یعنی ۱۰ ستمبر کے روز جیپ لے کر نکلے اور ان کی اور کرنل تجمل حسین کی آواز لاؤڈ سپیکروں پر گرجی تو دوسرے مورچوں سے پیغام آنے لگے کہ اُدھر بھی آیئے۔ توپخانے کی مارٹر بیٹری انہیں اپنی پوزیشنوں میں لے گئی۔ اس طوفانی دورے کے دوران کھانے کا وقت ہو گیا تو جوانوں نے کرنل تجمل حسین اور مولوی صاحب کو روٹی پر دال رکھ کر پیش کی جو انہوں نے کھڑے کھڑے جوانوں کے ساتھ کھائی اور کہا کہ کھانے کی لذت آج محسوس ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں کھانے کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ مولوی صاحب

صرف ایک وقت روٹی کھایا کرتے تھے۔یہی کیفیت افسروں اور جوانوں کی تھی۔

میں شہید ہوا ہوں، مرا نہیں

بی۔آر۔بی کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے مولوی صاحب نے ایک شہید کا تذکرہ کیا۔ وہ تھا لانس نائک بشیر احمد شہید۔ اُس نے جنگ کے دوران، جب مولوی صاحب اس کے مورچے کے قریب گئے انہیں کہا کہ مولوی صاحب نوکری کرتے چودہ سال ہو گئے ہیں۔ میں اکثر سوچتا رہتا تھا کہ اب گھر جانے والا ہوں، وہاں لوگوں کو کیا بتاؤں گا کہ میں نے قوم کے لیے چودہ سالوں میں کیا کیا۔ اب گھر جاؤں گا تو لوگوں کو سینہ تان کر بتاؤں گا کہ میں نے قوم کی سلامتی کے لیے جنگ لڑی اور اگر شہید ہو کر خدا کے حضور چلا گیا تو وہاں بھی سینہ تان کر کہوں گا، یا خدا میں تیرے نام پر جان قربان کر آیا ہوں۔

تین چار روز بعد لانس نائک بشیر احمد رات کی گشتی پارٹی کے ساتھ دشمن کے علاقے میں گیا تو شہید ہو گیا۔ شہادت کے وقت اس نے حوالدار محمد خان سے کہا تھا ــــ "میری والدہ کو بتا دینا کہ میں شہید ہوا ہوں، مرا نہیں"۔

سترہ روزہ جنگ میں ذاتی شجاعت اور اجتماعی فنِ حرب کے جو بے مثال مظاہرے ہوئے ان کی تفصیلات کے لیے کتابوں کی ضخامت چاہیے۔ میں اب اس معرکے کی کہانی سناتا ہوں جو فائر بندی کے بیالیس روز بعد ۵ نومبر ۱۹۶۵ بروز جمعہ شام کے وقت بی۔آر۔بی کے کنارے لڑا گیا۔ مولوی فضلِ عظیم صاحب نے بی۔آر۔بی کے کنارے باٹاپور فیکٹری کے اندر مسجد میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا۔ مائیکرو فون اور لاؤڈ سپیکر ان کے پاس تھے۔ ۲۲/۲۳ ستمبر کی رات دشمن ڈوگرئی کے کچھ حصے پر قابض ہو گیا تھا۔ (ڈوگرئی بی۔آر۔بی کے عین کنارے پر باٹاپور کے بالمقابل واقع ہے۔ باٹاپور کے پُل سے گزرنے والی سڑک اس گاؤں کے درمیان سے گزرتی ہے) مولوی صاحب نے مائیکروفون تو مسجد میں رکھا تھا اور لاؤڈ سپیکر بی۔آر۔بی کے اس قدر قریب نصب کروائے تھے جہاں سے اذان، تلاوت، وعظ اور

ترانوں کی آوازیں دشمن تک جاتی تھیں۔

فائر بندی کے بعد بھارت کے سول افسر ڈوگرئی گاؤں تک آیا کرتے تھے، جو ہمارے جوانوں کو نظر آتے تھے۔ درمیان میں صرف بی۔آر۔بی حائل تھی۔ ہمارے جوانوں نے اپنے افسروں سے کہا کہ انہیں کہو کہ اپنے شہریوں کو یہاں نہ آنے دیں ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے جوان دشمن کو اپنی زمین پر دیکھ دیکھ کر ہر لمحہ آگ بگولہ رہتے تھے۔ انہیں فائر بندی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ کشیدگی بڑی ہی خطرناک تھی۔

فائر بندی سے بہت بعد تھرڈ بلوچ کی ایک جیپ بی۔آر۔بی سے پار اس علاقے سے گزرنے لگی جو ہمارے پاس تھا لیکن وہاں اپنا مورچہ کوئی نہیں تھا۔ مورچے بی۔آر۔بی کے اس طرف تھے۔ ایک ہندو افسر نے جیپ روک لی۔ بی۔آر۔بی کے اس طرف نائب صوبیدار محمد سعید کی پلاٹون مورچہ بند تھی۔ ہندو افسر نے نائب صوبیدار محمد سعید سے کہا کہ ہم یہ جیپ یہاں سے نہیں گزرنے دیں گے۔ محمد سعید نے جواب دیا کہ یہ جیپ یہیں سے گزرے گی، اگر تم نے اس جیپ پر ایک بھی گولی چلائی تو تمہارے ایک آدمی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اتنے میں کرنل تجمل حسین آگئے۔ نائب صوبیدار محمد سعید کو حکم دیا کہ جوابی فائر کے لیے پلاٹون کو تیار کر لو۔ ساتھ ہی انہوں نے توپ خانے کو فائر آرڈر دے کر کہا کہ فائر کے حکم کا انتظار کرو۔ جیپ بی۔آر۔بی کے پار کھڑی تھی۔ ہندو افسر نے اپنے سپاہی بلا کر جیپ کے راستے میں کھڑے کر دیئے۔ ان میں سے دو سپاہیوں نے رائفلوں پر سنگینیں چڑھا کر رائفلیں تان لیں۔

کرنل تجمل حسین نے جیپ کے ڈرائیور سے کہا کہ اشارہ ملتے ہی جیپ چلاؤ، جو سامنے آئے کچل کے آگے نکل جاؤ۔ نائب صوبیدار محمد سعید کے مورچوں میں رائفلیں کاک ہو گئیں۔ سیفٹی کیچ آگے ہو گئے۔ مشین گنوں والوں نے گنیں اپنے اپنے ٹارگیٹ پر سیدھی کر لیں، انگلیاں ٹریگروں پر چلی گئیں، توپ خانے کے

تو سپچیوں نے گولے لوڈ کرکے ہاتھ رسیوں پر رکھ لیے۔ کرنل تجمّل حسین نے بی آر بی کے کنارے پر کھڑے ہو کر چھڑی کا اشارہ کیا اور دبنگ آواز سے کہا "جیپ مُووو MOVE" ڈرائیور نے نعرہ لگایا "یا علیؑ" اور جیپ زناٹے سے آگے بڑھی۔ ہندو سپاہی سنگینیں تان کر جیپ کے راستے میں آئے لیکن پاکستانی ڈرائیور کی بے خوف رفتار کے سامنے ان کا دل گردہ جواب دے گیا۔ جیپ نکل گئی اور گرد و غبار میں دو ہندو سپاہی سنگین تانے ہوئے ایک دوسرے کو گھورتے نظر آئے جیسے ایک دوسرے کا خون بہا دیں گے۔

کرنل تجمل حسین نے نائب صوبیدار محمد سعید کو حکم دیا کہ اپنا ایک سنتری نہر کے پار اس جگہ کھڑا کر دو جہاں انہوں نے جیپ روکی تھی۔ محمد سعید نے اپنی پلاٹون کے سپاہی کرامت کو نہر کے پار بھیج دیا۔

خطبے نے آگ لگادی

اس سے پہلے بھارتی افسر مولوی صاحب کے لاؤڈ سپیکروں پر بھی اعتراض اور احتجاج کر چکے تھے جو مولوی صاحب کے پُرجوش خطبے اور جنگی ترانے الاپ الاپ کر بھارتی سپاہیوں پر دہشت طاری کرتے تھے۔ اعتراض اقوام متحدہ کے مبصروں تک بھی پہنچایا گیا تھا جس پر مبصر ہنس دیتے تھے۔ ہندوؤں کو معلوم تھا کہ ان خطبوں اور ترانوں کا منبع فیکٹری کی مسجد ہے۔ وہ اس مسجد کے مینار کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے رہتے تھے۔

۵ نومبر جمعے کا دن تھا۔ مولوی صاحب نے مسجد میں جو خطبہ دیا وہ اپنے جوانوں کو آگ بگولہ اور دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ مولوی صاحب نے خطبے میں بھارتیوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ ہم کشمیر کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہم دس سال تک جنگ جاری رکھیں گے۔ ہم کشمیر کو تمہارے چنگل سے آزاد کرائیں گے۔ تم سے جوناگڑھ اور حیدرآباد بھی چھین لیں گے۔ تمہیں ہماری سرزمین پر موت گھسیٹ لائی ہے، تم اب زندہ اپنے ملک میں واپس

نہیں جا سکو گے۔

مولوی صاحب نے خطبے میں ہندو کو بتایا کہ تم کیا ہو اور مسلمان کیا ہے۔ انہوں نے تاریخ کے حوالے دے کر بھارتیوں سے برملا کہا کہ پاکستان کو ختم کرنے کے نشے میں تم ہندوستان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

اس خطبے نے بی آر بی کے دونوں کناروں پر اثر دکھایا۔ کرنل تجمل حسین کے حکم سے نائب صوبیدار محمد سعید نے سپاہی کرامت کو بی آر بی کے پار سنتری کھڑا کر دیا تھا۔ ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ یہاں سنتری کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ اس بحث مباحثے کے دوران نائب صوبیدار محمد سعید نے محسوس کیا کہ سپاہی کرامت کی جگہ کوئی ایسا جوان سنتری کھڑا کیا جائے جو چہرے مہرے اور جسم جثے سے رُعب دار لگے۔ انہوں نے سپاہی (اب حوالدار) اعظم کو سپاہی کرامت کی جگہ بھیج دیا۔ اعظم اس جگہ کھڑا ہونے کی بجائے مزید دس قدم آگے جا کھڑا ہوا اور سینہ تان لیا۔

سامنے ہندو افسر کھڑے تھے۔ انہوں نے اعظم کو کہا کہ تم واپس چلے جاؤ۔ اعظم نے جواب دیا کہ اب تو مجھے اپنے افسر حکم دیں تو بھی واپس نہیں جاؤں گا۔ تم تو میرے دشمن ہو۔

پہلے تو ہندو ہمارے سنتری کو بی آر بی کے پار کھڑا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ اب اعظم نے دس قدم اور آگے جا کر مسئلے کی نوعیت بدل ڈالی۔ اب ہندو افسر کہنے لگے کہ اپنے سنتری سے کہو کہ دس قدم پیچھے ہو جائے۔ نائب صوبیدار محمد سعید نے للکار کر جواب دیا "ہمارا جوان وہیں کھڑا رہے گا" —— اور اعظم نے کہا —— "میں ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

اتنے میں کمپنی کمانڈر میجر انور حسین شاہ ستارۂ جرأت آ گئے۔ انہوں نے بھی بی آر بی کے کنارے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا "ہمارا جوان وہیں کھڑا رہے گا" —— ہندوؤں نے کہا کہ ہم اِسے گولی مار دیں گے۔ میجر انور حسین شاہ نے کہا —— "ہم ایک جوان کے بدلے تمہارے ایک سو آدمی مار

کر دم لیں گے"۔

کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہندوؤں نے اپنے بڑوں کو اطلاع بھیج دی۔

اس دوران دو ہندو افسر شراب کی بوتلیں اُٹھائے سامنے آئے۔ بی۔آر۔بی کے پار لکڑیوں کے شہتیر رکھے تھے، اُن پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے فاتحانہ اور طنزیہ انداز سے شراب کی بوتلیں لہرا کر ہمارے جوانوں سے کہا "مسلمانو، گانا سناؤ"۔ وہ ہمارے جنگی ترانوں پر طنز کر رہے تھے۔

ڈوگرئی کے کسی مکان سے ہمارے مورچوں پر رائفل کی ایک گولی فائر ہوئی۔ میجر انور حسین شاہ بی۔آر۔بی کے کنارے کھڑے تھے۔ نائب صوبیدار محمد سعید نے انہیں وہاں سے ہٹ جانے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ آپ مورچے میں چلے جائیں ہم سنبھال لیں گے لیکن میجر انور وہیں کھڑے رہے۔ ہندو افسروں نے قہقہہ لگایا اور شراب کی بوتلیں کھول لیں۔

بائیں طرف سی کمپنی کا سپاہی غلام حسین کوئی ڈیڑھ سو گز دُور کھڑا تھا۔ اس نے ہندو افسروں کو شراب کی بوتلیں کھولتے اور قہقہہ لگاتے دیکھا تو کسی حکم کے بغیر رائفل سیدھی کی اور ایسے زاویے سے نشانہ لے کر گولی چلا دی کہ ایک ہی گولی دونوں ہندو افسروں کے جسموں سے پار ہو گئی۔ دونوں شہتیروں سے لڑھک کر گرے اور گرتے ہی مر گئے۔ ان کے پیچھے ایک سکھ افسر چلا آ رہا تھا۔ وہ بھاگ گیا۔ شراب کی کھلی بوتلیں بہنے لگیں۔

دشمن نے فائر کھول دیا۔ شام ہو رہی تھی۔ سپاہی اعظم قریب ہی ایک گڑھے میں کود گیا۔ زیادہ تر فائر اسی پر کیا جا رہا تھا۔ ہندوؤں نے مکانوں سے اس پر گرنیڈ بھی پھینکے اور مشین گنیں بھی فائر کیں لیکن اعظم ایسی آڑ میں تھا کہ محفوظ رہا۔

جواب میں ہمارے مورچوں سے آگ برسنے لگی۔ یہ معمولی جھڑپ نہیں بلکہ مکمل جنگ تھی۔ ہر ایک ہتھیار استعمال ہو رہا تھا۔ ڈوگرئی کے بائیں طرف ایک مکان

کی چھت پر ہندوؤں نے ریت کی بوریاں وغیرہ رکھ کر مشاہداتی پوسٹ 'او پی' بنا رکھی تھی جس میں ایک میڈیم مشین گن بھی تھی۔ یہ مشین گن بھی ہمارے مورچوں پر فائر کرنے لگی۔ وہ ایسی جگہ پر تھی جہاں سے ہمارا بہت نقصان کر سکتی تھی۔

اس طرف نائک لال خان مورچے میں تھا جس کے پاس آر آر (ٹینک شکن) گن تھی نائب صوبیدار محمد سعید نے چلّا کر نائک لال خان کو پکارا اور کہا ــــ "لال خان دشمن کی اس پوسٹ کو سنبھالو۔ مشین گن ٹکنے نہیں دے رہی"۔

نائک لال خان نے پہلے ہی اس پوسٹ کا نشانہ لے رکھا تھا۔ حکم ملتے ہی اس نے گولہ داغ دیا۔ گولہ نشانے پر جا پہنچا۔ پوسٹ اس طرح اُڑی کہ مشین گن اور تین بھارتی ہوا میں اُوپر کو گئے اور نیچے آ پڑے۔ ان پر مکان کا ملبہ گرا اور پوسٹ ختم ہو گئی۔

کرنل تجمل حسین پیچھے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے فیلڈ ٹیلیفون پر نائب صوبیدار محمد سعید سے پوچھا کہ آگے کیا ہو رہا ہے؟ محمد سعید نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو کرنل صاحب نے مردِ مومن کے جذبے کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ــــ "فائر جاری رکھو۔ میں توپ خانے کا فائر دیتا ہوں تم لوگ ہر ایک ہتھیار فائر کرو" ــــ نائب صوبیدار محمد سعید نے راکٹ لانچر بھی فائر کروانے شروع کر دیئے۔ راکٹ لانچر ٹینک شکن ہتھیار ہوتا ہے۔ دشمن ڈوگرئی کے مکانوں میں مورچہ بند تھا۔ راکٹوں نے مکانوں میں تباہی مچا دی۔

دشمن نے توپ خانے کا فائر کھلوا دیا۔ اِدھر سے ہمارا توپ خانہ دھاڑنے لگا اور رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ بی۔آر۔بی کے پار سپاہی اعظم آڑ میں تھا اور اس کے قریب ہی دو ہندو افسروں کی لاشیں پڑی تھیں۔

مینار اور صدائے لا الٰہ الّا اللّٰہ

اقوامِ متحدہ کے مبصّر آئے لیکن جنگ کی شدّت کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ دشمن

کے توپ خانے کا عتاب باٹاپور کی مسجد پر نازل ہو رہا تھا۔ اسی مسجد کے مینار پر ہمارا اُوپی تھا۔ دشمن کے بعض گولے ایسے زاویے سے آ رہے تھے جیسے ٹینک مینار کا نشانہ لے کر فائر کر رہے ہوں۔ لیکن مینار کو ایک بھی گولہ نہیں لگ رہا تھا۔ مسجد میں چند گولے پھٹے جن سے محراب گر پڑی۔

عشاء کی اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ مولوی فضلِ عظیم صاحب مسجد کی طرف دوڑے۔ وہ جانتے تھے کہ اس قیامت میں مسجد میں کوئی نمازی نہیں آئے گا۔ آنا بھی کسے تھا؟ فیکٹری خالی تھی اور جوان جنگ میں مصروف تھے لیکن مولوی صاحب اذان ضرور دینا چاہتے تھے۔ وہ اس دعا کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئے کہ یا خدا، مائیکروفون اور لاؤڈ سپیکروں کا رشتہ قائم ہو۔ وہ دشمن کو اذان سنانا چاہتے تھے۔

مولوی صاحب اندھیرے میں اندر آ گئے۔ محراب کے قریب مائیکروفون رکھا رہتا تھا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر مائیک ڈھونڈنے لگے۔ مائیک محراب کی اینٹوں تلے دب گیا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ جا کر ایمپلی فائر کا سوئچ آن کیا تو وہ سلامت تھا۔ مائیک پر انگلی ماری تو ٹھک ٹھک کی جاندار آواز اُٹھی۔

مولوی صاحب نے مائیکروفون کو سامنے رکھ کر اذان شروع کر دی۔ گولے آ رہے تھے۔ پھٹ رہے تھے اور جس مسجد کو دشمن تباہ کر رہا تھا، وہاں سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ اذان ختم ہوئی تو مولوی صاحب کو علامہ اقبالؒ کا ایک شعر یاد آ گیا۔ انہوں نے مائیک کے سامنے ترنم سے یہ شعر پڑھا۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اذانیں تو بہت دی ہیں لیکن اس اذان کا

جو سُرور اور خمار تھا وہ پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

معرکہ ختم ہو گیا۔ یہ باٹاپور کا آخری معرکہ تھا جس میں تھرڈ بلوچ کا کوئی نقصان نہ ہُوا لیکن دشمن کا جو نقصان ہُوا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ صبح تک دشمن زخمیوں اور لاشوں کو ملبے سے نکالتا اور اٹھاتا رہا۔

صبح کے وقت کرنل تجمل حسین نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ اذان کہاں سے دی تھی تو انہوں نے بتایا کہ مسجد سے۔ کرنل صاحب نے انہیں کہا کہ مولوی صاحب بٹالین کو آپ کی ضرورت ہے لیکن مولوی صاحب مسجد سے الگ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ کرنل صاحب نے انہیں مسجد کے مینار کے ساتھ ایک محفوظ مورچہ کھدوا دیا اور مائیکروفون مورچے میں رکھ کر کہا کہ لیجیے، آپ مسجد کے قریب رہیں۔

وہ تاریخی ایمپلی فائر آج بھی مولوی صاحب کے پاس ہے۔ ایک بار پھر ان سے ملاقات ہو گئی۔ جنگ ختم ہوتے اڑھائی تین سال گزر چکے تھے۔ گھر لے جا کر انہوں نے مجھے وہ ایمپلی فائر دکھایا تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی اور اس چمک میں مجھے باٹاپور کا وہ ۲۳ ستمبر کی صبح کا منظر نظر آ رہا تھا جب بی۔ آر۔ بی کے پار وسیع میدان میں ہندوؤں اور سکھوں کی ہزارہا لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور ان لاشوں میں ٹینک، ٹرک اور جیپیں کھڑی جل رہی تھیں اور ان کے قریب راکٹ لانچر، مشین گنیں، آٹومیٹک رائفلیں، سٹین گنیں اور ٹینکوں کی مڑی تڑی گنیں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے مرے ہوئے سانپ اور بچھو پڑے ہوئے ہوں۔ صدائے اللہ اکبر اور صدائے لا الٰہ الا اللہ نے کفر کو ڈنک مار دیا تھا۔

باٹاپور کا پُل جو چھ ستمبر کی صبح کفار کے لیے پُل صراط بن گیا تھا، قوم کے لیے

زیارت گاہ بن گیا ہے۔ پُل کے اِس طرف جہاں کرنل تجمل حسین نے اپنے اُوپر گولہ باری کرائی تھی، جہاں سے نائک اسلم نے بیل گاڑی کی آڑ سے آر۔آر فائر کی تھی، جہاں تھرڈ بلوچ کے مٹھی بھر جوان ٹینکوں کے سامنے کھُلے میدان میں گوشت پوست کی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے، جہاں سے اُن پر ڈوگرئی کے مکانوں سے گولیوں کا مینہ برس رہا تھا اور جہاں شاہی مسجد اور داتا دربار کی عظمت کچے دھاگے سے لٹک رہی تھی، وہاں آج شہیدوں کے چھوٹے چھوٹے مگر عظیم تین یادگاری میناریں کھڑے ہیں جیسے شاہی مسجد کے میناروں اور یادگارِ پاکستان کے بلند و بالا مینار کی پاسبانی کر رہے ہوں۔

آج بھی ممتا کی ماری ہوئی کوئی ماں آہوں اور سسکیوں کو سینے میں دبائے یا کوئی بہن ارمانوں کو آنکھوں میں چھپائے یا کوئی بیوہ اکلوتے بچّے کو انگلی سے لگائے ان چھوٹے چھوٹے میناروں کو دوپٹے کے آنچل سے پونچھ رہی ہوتی ہے یا کوئی باپ میناروں کے قدموں میں پھُول رکھ رہا ہوتا ہے یا کوئی پانچ چھ سال کا بچّہ میناروں پر کندہ کیے ہوئے ناموں میں اپنے ابّو کے نام کے ہجّے کر کے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے اور خلاؤں میں گھُور گھُور کر اپنے ابّو کی شکل و صورت کو یاد کرنے کی ناکام سی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے — اور زندگی کا کارواں جس کی خاطر ان شہیدوں نے زندگی قربان کر دی، باٹا پُور کے پُل سے گزرتا چلا جاتا ہے اور گزرتا ہی چلا جائے گا۔

مکتبہ داستان کی کتب

اسلامی کتب

قرآن کی کرنیں

پر اثر وظائف اور روحانی عملیات

اسلامی تاریخی ناول

داستان ایمان فروشوں کی (پانچ حصے) — عنایت اللہ

اور ایک بت شکن پیدا ہوا (چار حصے) — عنایت اللہ

دمشق کے قید خانے میں — عنایت اللہ

جرم و سزا

کار، شلوار اور دوپٹہ — احمد یار خان

ہال ایک چڑیل کے — احمد یار خان

جب مجھے اغوا کیا گیا — احمد یار خان

لاش لڑکی اور گف کے گناہ گار — احمد یار خان

واردات اس رات کی — احمد یار خان

جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں — احمد یار خان

سندری کا سودا — احمد یار خان

روح کے رشتے اور مقتول کی بدروح — احمد یار خان

ایک رات کی شادی — احمد یار خان

دام میں صیاد آ گیا — احمد یار خان

قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی — احمد یار خان

جب پیار نے کروٹ بدلی — احمد یار خان

جائیداد کا وارث — احمد یار خان

آشرم سے اس بازار تک — احمد یار خان

رتن کماری کی روپا — احمد یار خان

شیشہ اور شہ رگ — دبیر حسین رضوی

بن بیاہی ماں — محبوب عالم

سہاگ کا خون — محبوب عالم

لائن پر لاش — محبوب عالم

پیار کا پاپی — محبوب عالم

چادر اور چوڑیاں — محبوب عالم

حوالات میں طلاق — محبوب عالم

بھائی اور بھیڑیا (احمد یار خان، صابر حسین راجپوت، شجاع الدین)

ناول

طاہرہ — عنایت اللہ

خاکی وردی لال لہو (دو حصے) — عنایت اللہ

الجھے راستے — عنایت اللہ

بھٹکے ہوؤں کی داستان — ابن صحرا، نغمہ صبوحی

ایک کہانی (دو حصے) — عنایت اللہ

دھندلی راہیں (چار حصے مکمل) — عنایت اللہ

تاریک اجالے — وقاص

اور نیل بہتا رہا (اول، دوئم) — عنایت اللہ

آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

چار دیواری کی دنیا — عنایت اللہ

چمن چمن کے پاپی — عنایت اللہ

مرد تو میں ہوں۔ میرا تیسرا خاوند — ن۔م۔ر۔س

جوانی کے جنگل میں — غلام مہدی، عنایت اللہ

میں بزدل تھا وہ مر گیا تم زندہ رہو — نفیس الدین۔ علی اظہر

عزیز احمد۔ عنایت اللہ

جرم، جنگ اور جذبات — عنایت اللہ

میں گناہ گار تو نہیں — عنایت اللہ

ناقابل فراموش — عنایت اللہ

سزا اس گناہ کی — عنایت اللہ

پاکستان۔ ایک پیار دو دنیاں — عنایت اللہ

رات کا راہی (دو حصے) — لاہوتی

پرچم اترتا رہا — عنایت اللہ

۱۸۵۷ء کی داستان خونچکاں — عنایت اللہ

چار دیواری کے دریچوں میں — عنایت اللہ

پانچویں لڑکی — عنایت اللہ

چھوٹی بہن کا پکا بھائی — عنایت اللہ

پیاسے — عنایت اللہ

ستارہ جو ٹوٹ گیا — عنایت اللہ

ہماری شکست کی کہانی — عنایت اللہ

پیاسی روحیں — عنایت اللہ

آستین کے سانپ (اول، دوم) — حسین ثاقب

شکاریات

لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانہ — صابر حسین راجپوت

قبر کا بھید — صابر حسین راجپوت

سانپ، سادھو اور توبے کی کہانی — صابر حسین راجپوت

بگی کا بچہ — صابر حسین راجپوت

بھیڑیا، بدروح اور بیوی — صابر حسین راجپوت

ایک لڑکی دو منگیتر — صابر حسین راجپوت

طب و نفسیات

زندہ رہو جوان رہو — ڈاکٹر نصیر اے شیخ

روحانی مسرت جسمانی قوت — ڈاکٹر شبیر حسین

نئی زندگی نئی توانائی (ماہرین طب و نفسیات کا [illegible])

روح کا روگ — ڈاکٹر ممتاز حسین بجو

راشدہ تجسم

مقناطیسی شخصیت (دو حصے) — میم۔ الف

مایوسی کیوں؟ — میم۔ الف

طنز و مزاح

افسر، پنچو اور پھوپھی بھالو — عنایت اللہ

چاچا کام — عزیز ذوالفقار

ابو علی غزنوی اور محمد بن قاسم پاکستان میں — عنایت اللہ

ماما چھپ — عزیز ذوالفقار

پاک بھارت جنگ

بدر سے باٹا پور تک (انعام یافتہ) — عنایت اللہ

پاک فضائیہ کی داستان شجاعت — عنایت اللہ

فتح گڑھ سے فرار — کیپٹن نور احمد

لاہور کی دہلیز پر — عنایت اللہ

دو ٹیلوں کی کہانی — عنایت اللہ

کشمیر کے حملہ آور اور پنڈی سازش کیس

جہانگیر بک ڈپو